معارف القرآن

جلد اوّل

تصنیف

حضرۃ مولانا محمود الرّشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

مقدمہ، سورۃ الفاتحہ

جلد 1

تصنیف

اُستاذُ العُلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرّشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اِدارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور
غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبر 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب ---------- معارف الفرقان جلد ①
نام مصنف ---------- مولانا محمود الرشید حدوٹی
ناشر ---------- ادارہ آب حیات ٹرسٹ
مطبع ---------- عبد اللہ زبیر پرنٹنگ پریس لاہور
طبع اول ---------- جولائی ۲۰۱۶ء
تعداد طبع اول ---------- ۱۰۰۰
اشاعت طبع دوم ----------
تزئین طبع ثانی ---------- ادارہ آب حیات لاہور

معارف الفرقان جلد ①

اپنی بات: محمود الرشید حدوٹی	۱۱	قرآن کریم کا حرفی ترجمہ	۲۱
علم تفسیر کی حقیقت واہمیت	۱۲	اعجاز قرآن اور حرفی ترجمہ	۲۱
تفسیر کا لغوی مفہوم	۱۲	قرآن کریم کا تفسیری ترجمہ	۲۴
تفسیر کا اصطلاحی مفہوم	۱۲	حرفی اور تفسیری ترجمہ میں فرق	۲۴
قراءات اور رسم قرآن کی اہمیت	۱۳	تفسیر اور تفسیری ترجمہ میں فرق	۲۵
علم تفسیر کا جامع دائرہ	۱۳	تفسیر کا اولین دور، عہد نبوی وصحابہ	۲۸
تاویل کا مفہوم اور اس کی حقیقت	۱۴	صحابہ رضی اللہ عنہم کے فہم قرآن میں تفاوت	۳۰
قرآن کریم میں لفظ تاویل کے استعمالات	۱۴	دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں مصادر تفسیر قرآن	۳۲
یہاں تاویل سے مراد خواب کی تعبیر	۱۵	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر بیان فرمائی	۳۴
تاویل کا اصطلاحی مفہوم	۱۵	سنت نبوی، قرآن کی مستند شارح	۳۸
دوم: متأخرین علماء کے نزدیک تاویل	۱۶	تیسرا مصدر تفسیر، صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجتہاد	۳۸
تفسیر و تاویل میں فرق	۱۷	اجتہاد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بنیادی ذرائع	۳۹
تفسیر اور تاویل کے بارے میں اقوال	۱۷	فہم قرآن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درجات	۴۰
راغب صفہانی کی رائے	۱۷	چوتھا مصدر تفسیر: اہل کتاب سے روایات	۴۲
امام ماتریدی رحمہ اللہ کا موقف	۱۸	صحابہ رضی اللہ عنہم میں ممتاز مفسرین قرآن	۴۳
امام ثعلبی رحمہ اللہ کی وضاحت	۱۸	**صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مشہور مفسرین**	۴۳
امام بغوی رحمہ اللہ اور علامہ کواشی کی رائے	۱۸	روایت تفسیر میں تفاوت کے اسباب	۴۳
روایت اور درایت کا فرق	۱۸	ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما	۴۵
قرآن کریم کی غیر عربی زبان میں تفسیر	۲۰	حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	۴۹

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول تفسیر، علمی حیثیت	۵۱	تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر رحمہ اللہ	۹۰
عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تفسیر کی نمایاں خصوصیات	۵۴	تفسیر الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن	۹۲
تفسیر کا دوسرا دور، عہد تابعین رحمہم اللہ	۵۵	تفسیر الدر المنثور فی التفسیر بالماثور	۹۴
عہد تابعین رحمہم اللہ میں تفسیر کے مصادر	۵۶	احکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ	۹۵
عہد تابعین رحمہم اللہ، مکاتب تفسیر	۵۷	تفسیر القرآن الحکیم یعنی تفسیر المنار	۹۷
حضرت عکرمہ رحمہ اللہ	۵۹	تفسیر المراغی	۹۸
حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ	۶۲	تفسیر فتح القدیر	۹۹
حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ	۶۵	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم	۱۰۰
حضرت طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ	۶۷	تفسیر المظہری	۱۰۱
حضرت قتادہ بن دد عامہ سدوسی رحمہ اللہ	۶۷	التفسیر الوسیط	۱۰۲
تابعین کی ماثور تفسیر کی علمی حیثیت	۶۹	اللباب فی علوم الکتاب	۱۰۲
تابعین کے دور تفسیر کی نمایاں خصوصیات	۷۱	انوار التنزیل واسرار التاویل، بیضاوی	۱۰۳
سلف کے اختلافِ تفسیر کی حقیقت	۷۲	تفسیر جلالین	۱۰۵
اشاری تفاسیر کا تعارف، ان کا منہج تفسیر	۷۳	تفسیر روح البیان	۱۰۵
معارف الفرقان کے مصادر	۷۸	تفسیر القشیری، لطائف الاشارات	۱۰۶
جامع البیان فی تاویل القرآن	۷۸	ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم	۱۰۷
تفسیر بحر العلوم	۸۲	لباب التاویل فی معانی التنزیل، خازن	۱۰۸
الکشف والبیان عن تفسیر القرآن	۸۴	تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان	۱۰۸
تفسیر معالم التنزیل اور امام بغوی رحمہ اللہ	۸۶	تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر	۱۰۹
المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز	۸۸	تفسیر حدائق الروح والریحان	۱۱۰

تفسیر التحریر والتنویر	۱۱۱	الدرر النافعہ فی تفسیر سورۃ الفاتحہ	۱۳۰
تفسیر کبیر یعنی مفاتیح الغیب	۱۱۱	قرآن حکیم کی فضیلت	۱۳۰
تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل	۱۱۲	ارشادات نبوی ﷺ	۱۳۱
زہرۃ التفاسیر	۱۱۳	قرآن کے نام قرآن میں	۱۴۱
تفسیر فتح البیان فی مقاصد القرآن	۱۱۵	الجامع	۱۵۸
اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن	۱۱۶	المبارک	۱۵۹
فی ظلال القرآن	۱۱۷	الھدیٰ	۱۶۰
محاسن التاویل تفسیر قاسمی	۱۱۸	الرحمت کے معانی ومفاہیم	۱۶۱
صفوۃ التفاسیر	۱۱۹	المنزل	۱۶۴
العجاب فی بیان الاسباب	۱۲۰	المفرق	۱۶۵
اسباب النزول	۱۲۱	قرآن کو بتدریج نازل کرنے کے فوائد	۱۶۵
لباب النقول فی بیان اسباب النزول	۱۲۲	تذکرہ	۱۶۶
اردو تفاسیر ومعارف الفرقان	۱۲۳	بصائر، قیم، مثانی،	۱۶۷
بیان القرآن۔۔۔۔ معارف القرآن	۱۲۳	سورۃ الفاتحہ کے نام۔ فاتحۃ الکتاب	۱۶۸
معارف القرآن کاندھلوی، عثمانی، انوار	۱۲۴	السبع المثانی	۱۷۱
تبیان القرآن۔۔۔ ذخیرۃ الجنان، ضیاء القرآن	۱۲۵	مثانی کہنے کی وجوہات	۱۷۱
معالم العرفان، توضیح القرآن، روح القرآن	۱۲۶	القرآن العظیم	۱۷۳
سراج البیان، معارف الفرقان للقاسمی	۱۲۶	الصلوٰۃ، رقیۃ الحق	۱۷۳
مقاصد القرآن للشجاعبادی	۱۲۷	سورۃ الحمد، اساس القرآن	۱۷۴
خصوصیات معارف الفرقان	۱۲۸	الکافیہ	۱۷۵

الکنز۔ شفاء	۱۷۶	جبریل سب سے پہلے استعاذہ کا حکم لائے	۱۹۶
سورۃ السوال	۱۷۷	استعاذہ کا شرعی حکم	۱۹۷
سورۃ الشکر۔ سورۃ الدعا۔ سورۃ النور۔ الوافیہ	۱۷۸	تعوذ قرأت کیلیے یا نماز کیلیے	۱۹۸
سورۃ الحمد اولیٰ۔ سورۃ الحمد قصریٰ، شافیہ	۱۷۸	استعاذہ کب کرے؟	۱۹۹
سورۃ تعلیم المسئلہ، سورۃ المناجات	۱۷۹	تعوذ کا آہستہ اور اونچا پڑھنا	۲۰۰
سورۃ التفویض	۱۷۹	تعوذ کے لیے کلمات	۲۰۱
فضائل سورۃ الفاتحہ	۱۸۰	**استعاذہ کے بارے میں چند لطائف**	۲۰۳
سورۃ الفاتحہ نور ہے	۱۸۰	استعاذہ کا معنیٰ اور مفہوم	۲۰۴
سب سے بڑی سورت	۱۸۰	انسان اور شیطان	۲۰۵
ایسی سورت صرف قرآن کا اعزاز	۱۸۲	انسان انسان کے ساتھ کیا سلوک کرے	۲۰۶
فاتحہ عرش الٰہی پر معلق	۱۸۲	انسان شیطان کا کیا کرے؟	۲۰۶
ہر بیماری کی شفاء	۱۸۳	لفظ شیطان کی تحقیق	۲۰۷
زہر سے شفاء	۱۸۴	رجیم (دھتکارہ ہوا)	۲۱۰
چالیس سال کیلیے عذاب کا ٹلنا	۱۸۴	شیطان رجیم کون ہے؟	۲۱۲
ایک سو چار کتابوں میں شان امتیازی	۱۸۵	استعاذہ کے ارکان	۲۱۳
فاتحہ کی انوکھی فضیلت	۱۸۵	پناہ کون لوگ مانگیں؟	۲۱۳
سورۃ الفاتحہ اللہ اور بندے کے درمیان	۱۸۸	احادیث مبارکہ میں استعاذہ کا حکم	۲۱۷
سورۃ الفاتحہ کی خصوصیات	۱۸۸	استعاذہ سے مقصود	۲۲۲
سورۃ الفاتحہ کا نزول	۱۸۹	جنات اور شیاطین	۲۲۲
اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم	۱۹۱	جنات اور قرآن	۲۲۴

جنات اور حدیث نبوی ﷺ	۲۲۶
شب معراج میں جن کا تعاقب کرنا	۲۲۷
شیاطین کے حملوں سے پناہ	۲۲۸
شیطان کا سر ابن آدم کے دل پر	۲۲۹
شیطان کی ناک ابن آدم کے دل پر	۲۲۹
شیطان کا خون کی طرح دوڑنا	۲۲۹
جنات کس چیز سے پیدا کیے گئے؟	۲۳۰
جنات کو جنات کیوں کہا گیا؟	۲۳۰
مکلفین کے چند طبقات	۲۳۱
جنات کا انسانوں پر تسلط	۲۳۱
جنات و شیاطین میں ایک فرق	۲۳۲
شیطانی وساوس	۲۳۲
جنات کی غیب دانی	۲۳۲
استعاذہ کے اسباب وانواع	۲۳۳
تعوذ اور استعاذہ میں پائے جانیوالے نکات	۲۳۴
پہلا نکتہ	۲۳۴
دوسرا نکتہ	۲۳۵
تیسرا نکتہ۔ چوتھا نکتہ۔ پانچواں نکتہ	۲۳۶
چھٹا نکتہ۔ ساتواں نکتہ	۲۳۷
آٹھواں نکتہ	۲۳۸
نواں نکتہ	۲۴۱
دسواں نکتہ۔ گیارہواں نکتہ	۲۴۲
بارہواں نکتہ۔ تیرہواں نکتہ	۲۴۳
چودہواں نکتہ۔ پندرہواں نکتہ	۲۴۳
سولہواں نکتہ۔	۲۴۴
سترہواں نکتہ۔ اٹھارہواں نکتہ	۲۴۵
انیسواں نکتہ	۲۴۵
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	۲۴۵
بسم اللہ بآواز بلند یا آہستہ؟	۲۴۷
آپ ﷺ کیسے قرأت کیا کرتے تھے؟	۲۴۸
بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے	۲۴۸
بسم اللہ کی فضیلت	۲۴۹
بسم اللہ کی اہمیت	۲۵۳
بسم اللہ اور آپ ﷺ کا عمل	۲۵۴
بسم اللہ چار نہروں کا سرچشمہ	۲۵۶
بسم اللہ اور دعا کی قبولیت	۲۵۸
بسم اللہ کا احترام	۲۵۸
قیصر بادشاہ اور بسم اللہ	۲۵۸
بسم اللہ کا تاریخی تسلسل	۲۶۰
سیدنا سلیمان علیہ السلام اور بسم اللہ	۲۶۰

بسملہ ایک مختصر نام	۲۶۱	پہلا فائدہ۔۔دوسرا فائدہ	۲۹۸
ایک عجیب تحقیق	۲۶۱	تیسرا فائدہ۔۔چوتھا فائدہ	۲۹۹
بسم اللہ کی ”ب“	۲۶۵	پانچواں فائدہ	۳۰۰
ب کے معانی	۲۶۷	الرحمٰن الرحیم	۳۰۱
لفظ اسم	۲۶۸	نکات	۳۰۶
اسماء اللہ الحسنیٰ	۲۷۳	پہلا نکتہ۔۔دوسرا نکتہ	۳۰۶
اسماء کا مسمیات پر واقع ہونا	۲۷۳	تیسرا نکتہ۔چوتھا نکتہ۔پانچواں نکتہ	۳۰۷
لفظ اللہ جل جلالہ	۲۷۵	چھٹا نکتہ۔ساتواں نکتہ	۳۰۸
اللہ تعالیٰ کے چار ہزار نام	۲۷۹	آٹھواں نکتہ۔نواں نکتہ۔	۳۰۹
اللہ، اللہ ہی کا نام ہے کسی اور کا نہیں	۲۷۹	دسواں نکتہ۔۔گیارہواں نکتہ	۳۱۰
خصائص اسم اللہ	۲۸۳	بارہواں نکتہ	۳۱۱
پہلی خصوصیت	۲۸۳	بسم اللہ کی سین	۳۱۲
دوسری خصوصیت	۲۸۴	بسم اللہ کی میم	۳۱۳
اسم اللہ سارے ناموں کا سردار	۲۸۵	بسم اللہ میں لفظ ”اللہ“	۳۱۴
اللہ کی حقیقت کوئی نہیں پاسکا	۲۸۶	تیرہواں نکتہ	۳۱۴
اسم اعظم	۲۸۸	چودہواں نکتہ۔پندرہواں نکتہ	۳۱۵
اسم اعظم کو مخفی رکھنے کی وجوہات	۲۹۲	سولہواں نکتہ۔۔سترہواں نکتہ	۳۱۶
جھاڑ پھونک میں استعمال ہونیوالے نام	۲۹۵	اٹھارہواں نکتہ۔انیسواں نکتہ	۳۱۷
علاج ووسوسہ	۲۹۷	بیسوں نکتہ۔اکیسواں نکتہ	۳۱۸
لطائف اور فوائد	۲۹۸	بائیسواں نکتہ	۳۱۸

تئیسواں نکتہ	۳۱۸	رب العالمین۔رب	۳۴۱
چوبیسواں نکتہ	۳۱۹	سامان زندگی عطا کرنے ور بوبیت میں فرق	۳۴۵
تفسیر سورۃ الفاتحہ	۳۲۰	ربوبیت کا نظام تقسیم	۳۴۵
الحمدللہ	۳۲۰	تقاضائے ربوبیت	۳۴۷
حمد کی تعریف	۳۲۲	ربوبیت کا عالمگیر نظام	۳۴۸
الحمدللہ احمد اللہ کہنے سے زیادہ بلیغ	۳۲۲	نظام ربوبیت کی وحدت	۳۴۹
الحمدللہ کے لام کا معنیٰ	۳۲۴	نکات۔پہلا نکتہ	۳۵۲
آٹھ حروف اور جنت کے آٹھ دروازے	۳۲۵	دوسرا۔تیسرا۔چوتھا نکتہ	۳۵۳
منعم حقیقی اللہ ہی ہے	۳۲۵	پانچواں۔چھٹا۔ساتواں نکتہ۔آٹھوان نکتہ	۳۵۳
تحمید کی فضیلت	۳۲۶	العالمین	۳۵۷
الحمد کے ساتھ وابستہ یادیں	۳۳۳	عالم کیا ہے؟	۳۶۱
حمد میں موجود تین حروف	۳۳۴	اَلرَّحمٰنِ الرَّحِیم	۳۶۳
اللہ کی کاریگری	۳۳۵	مَالِكِ يَومِ الدِّين	۳۷۳
تسبیح سے تحمید مقدم ہونے کی وجہ	۳۳۵	عادل نوشیروان کی توبہ	۳۷۹
حمد کا ماضی اور مستقبل کیساتھ تعلق	۳۳۶	ایاک نعبد	۳۸۵
الحمدللہ کا موقع و محل پر استعمال	۳۳۷	توحید وبت پرستی	۳۸۹
الحمدللہ کا نعمت دینیہ پر استعمال	۳۳۷	وایاک نستعین	۴۰۰
آدم کا پہلا اور اولاد آدم کا جنت میں کلمہ	۳۳۷	اِهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ	۴۰۵
الحمدللہ میں نکات۔پہلا نکتہ	۳۳۸	صِرَاطَ الَّذِينَ اَنعَمتَ عَلَيهِم	۴۱۹
دوسرا۔تیسرا۔چوتھا نکتہ	۳۴۰	غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِم وَلَا الضَّآلِّين	۴۲۲

اپنی بات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے جس نے اس سیاہ کار بندے کے قلم سے سورۃ الفاتحہ کی ایک جامع اور مانع تفسیر لکھوادی، اللہ تعالیٰ دیگر دینی خدمات کے ساتھ اس کام کو بھی قبول اور منظور فرمائے۔

گزشتہ سال یعنی سال ۱۳۳۴ھ کے شوال میں فاضل دوست مولانا قاری فضل اللہ صاحب نے خانیوال سے فون کیا کہ حدیث شریف کا سبق ہمارے طلباء کو فون پر مولانا عبد العزیز صاحب خطیب لال مسجد اسلام آباد پڑھائیں گے، ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ تفسیر کا سبق فون پر ہمارے طلباء کو پڑھادیں، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں بندہ نے قاری صاحب سے وعدہ کرلیا کہ یہ کام انشاء اللہ میں کر دوں گا، اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیا، روزانہ سبق تیار کرتا اور اسے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیتا، شام کو مغرب کے بعد فون پر قاری صاحب کے مدرسہ کے طلباء کو پڑھا دیتا، سورۃ الفاتحہ اس قدر تفصیل سے پڑھائی گئی کہ اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا، جسے بعد میں پڑھا اور دیکھا تو قیمتی چیزیں مزید شامل کر دیں، اس طرح یہ ایسا گراں قدر علمی کام ہو گیا جو علماء، طلباء اور عامۃ الناس کے لیے یکساں مفید دکھائی دینے لگا، اس کو دیکھتے پڑھتے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اس پر نظر ثانی کرتے کئی ماہ گزر گئے، اب الحمد للہ یہ استفادے اور افادے کے لیے موجود ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی عالی بارگاہ میں قبول فرمالے، اہل علم سے دست بستہ پیشگی معافی کا خواستگار ہوں، اگر اس میں کسی بھی نوعیت کی کمی رہ گئی ہے تو مطلع فرما کر دارین کی سعادتیں سمیٹیں۔ اللہ کی بارگاہ سے مجھے بھرپور امید ہے کہ میری شبانہ روز کی یہ محنت اہل علم کے حلقوں میں قبولیت پائے گی، اہل علم اس مجموعہ کے مطالعہ سے ہی اندازہ کر سکیں گے کہ اس میں کس قدر گراں بہا موتی جمع کر دیے گئے ہیں۔ اگر قبول افتد زہے عز و شرف

خادم اسلام، **محمود الرشید حدوٹی** عفاء اللہ عنہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

علمِ تفسیر کی حقیقت و اہمیت

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی آخری اور کامل کتاب ہے، جو رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لیے ہدایت، رحمت اور نور بن کر نازل ہوئی، اس کتابِ عظیم کے معانی و مطالب کو سمجھنا، اس کے احکام و حکم کو جاننا، اور اس کے پیغام کو زندگی میں نافذ کرنا ہر مسلمان کے لیے باعثِ سعادت ہے، یہی مقصد علمِ تفسیر کا ہے، جو قرآنِ کریم کے پوشیدہ معانی کو واضح کرتا اور کلامِ الٰہی کے اسرار و حقائق کو انسان کے سامنے منکشف کرتا ہے۔

تفسیر کا لغوی مفہوم: عربی زبان میں تفسیر کے معنی وضاحت، بیان اور پردہ اٹھانے کے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے، وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (الفرقان:۳۳) یعنی :وہ آپ کے پاس جو مثال بھی لاتے ہیں، ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین وضاحت لے آتے ہیں۔

لغت کے ائمہ نے بھی فسر کے معنی کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنا اور ڈھکی ہوئی حقیقت کو کھول دینا بیان کیے ہیں۔ چنانچہ قاموس میں ہے کہ الفسر کے معنی ابانۃ و کشف یعنی وضاحت اور پردہ اٹھانا ہیں، اور لسان العرب میں لکھا ہے کہ تفسیر دراصل مشکل لفظ سے مراد کو واضح کرنے کا نام ہے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ نے ایک لطیف نکتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ عرب کبھی فسرت الفرس بھی کہتے ہیں، یعنی گھوڑے کو اس طرح کھول دینا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ دوڑ سکے۔ گویا تفسیر بھی معانی کے پردے ہٹا کر حقیقت کو نمایاں کر دیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تفسیر کا لفظ کبھی حسی پردہ کشائی کے لیے اور کبھی عقلی و معنوی وضاحت کے لیے استعمال ہوتا ہے، البتہ قرآن کے باب میں اس کا دوسرا مفہوم زیادہ نمایاں ہے۔

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم: علماءِ امت نے تفسیر کی مختلف تعریفیں ذکر کی ہیں، اگرچہ الفاظ میں فرق ہے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے : قرآنِ مجید سے مرادِ الٰہی کو انسانی استطاعت کے مطابق واضح کرنا۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآن کے الفاظ کی ادائیگی، ان کے معانی، ان کے انفرادی و ترکیبی احکام، اور ان معانی پر بحث کی جاتی ہے جو ترکیب کی حالت میں ان الفاظ سے مراد ہوتے ہیں، نیز ان سے متعلق دیگر ضروری امور بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ علمِ تفسیر محض ترجمہ نہیں، بلکہ اس کے لیے قراءات، لغت، صرف، نحو، بلاغت، بیان، بدیع، ناسخ و منسوخ، اسبابِ نزول اور دیگر معاون علوم کی معرفت بھی ضروری ہے، امام زرکشی رحمہ اللہ نے تفسیر کو یوں بیان فرمایا: وہ علم جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ کتاب کو سمجھا جائے، اس کے معانی واضح کیے جائیں، اور اس سے احکام و حکمتیں مستنبط کی جائیں، بعض اہلِ علم نے فرمایا: تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآنِ مجید کے ان احوال پر بحث کی جاتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے، اور یہ سب انسانی طاقت و استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔

قراءات اور رسمِ قرآن کی اہمیت: تفسیر کے باب میں قراءاتِ قرآنیہ اور رسمِ مصحف کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ بسا اوقات معنی قراءت کے اختلاف سے بدل جاتا ہے، اسی طرح مصحف میں بعض الفاظ کے وصل و فصل سے بھی مفہوم میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے مفسر کے لیے ان علوم سے واقفیت ناگزیر ہے۔

علمِ تفسیر کا جامع دائرہ: بعض اہلِ علم نے تفسیر کے دائرے کو مزید وسیع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں نزولِ آیات، اسبابِ نزول، مکی و مدنی، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین، حلال و حرام، وعد و وعید، امر و نہی، عبر و امثال سب شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تعریفیں ایک ہی مرکز پر جمع ہوتی ہیں، اور وہ یہ کہ: علمِ تفسیر وہ عظیم علم ہے جس کے ذریعے بندہ اپنی انسانی استطاعت کے مطابق قرآنِ مجید سے مرادِ الٰہی کو سمجھنے اور واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس مقصد کے لیے ہر وہ علم اس کی خدمت میں شامل ہو جاتا ہے جو فہمِ قرآن میں مددگار ہو۔

اسی احساس کے ساتھ معارف الفرقان کی یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے، تاکہ قرآنِ کریم کے علوم، معانی، ہدایات اور عملی پیغام کو عام فہم مگر علمی انداز میں پیش کیا جاسکے اور قاری کتابِ الٰہی سے براہِ راست تعلق پیدا کرکے اپنی دنیا و آخرت سنوار سکے۔

تأویل کا مفہوم اور اس کی حقیقت: تأویل کا لغوی مفہوم، لفظ تأویل عربی زبان کے مادہ (أول) سے ماخوذ ہے، جس کے بنیادی معنی لوٹنے، رجوع کرنے اور کسی چیز کو اس کے اصل انجام تک پہنچانے کے ہیں۔ اہلِ لغت نے اس کی یہی اصل بیان کی ہے، قاموس المحیط میں ہے کہ آل الشیء کے معنی ہیں: کسی چیز کا اپنے اصل کی طرف لوٹنا۔ اسی طرح أوّل الکلام کے معنی بیان کیے گئے ہیں: کلام کی حقیقت کو واضح کرنا، اس کی تدبیر کرنا، اس کا مفہوم بیان کرنا اور اس کی تعبیر کرنا۔ اسی مناسبت سے خواب کی تعبیر کو بھی تأویل کہا جاتا ہے۔

لسان العرب میں بھی یہی وضاحت ملتی ہے کہ تأویل دراصل رجوع اور بازگشت کے معنی پر مبنی ہے۔ چنانچہ کسی کلام کی تأویل سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے الفاظ کو ان معانی کی طرف لوٹایا جائے جن کا وہ احتمال رکھتے ہیں اور جو اس کے حقیقی مقصود کو واضح کرتے ہیں۔

بعض اہلِ لغت نے تأویل کا ماخذ إیالۃ (حکمرانی اور حسنِ تدبیر) کو قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے مؤوِّل گویا الفاظ و معانی کی ایسی رہنمائی کرتا ہے کہ ہر لفظ کو اس کے مناسب مقام پر رکھ کر اصل مراد تک پہنچا دیتا ہے۔ امام زمخشری نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ إیالۃ کے معنی رعیت کی بہترین تدبیر اور حسنِ سیاست کے ہیں۔ گویا مؤول بھی کلام کی ایسی رہنمائی کرتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم پوری طرح نمایاں ہو جائے۔

ان تمام لغوی توضیحات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تأویل کا اصل مفہوم کسی کلام کو اس کے حقیقی مقصود، انجام یا مراد کی طرف لوٹانا اور اس کے پوشیدہ معنی کو آشکار کرنا ہے۔

قرآنِ کریم میں لفظِ تأویل کے مختلف استعمالات: قرآنِ مجید میں تأویل کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن ہر جگہ اس کا مفہوم ایک جیسا نہیں، بلکہ سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف معانی مراد لیے گئے

ہیں، سورۂ آل عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ... وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ یہاں تأویل سے مراد آیاتِ متشابہات کی حقیقت اور صحیح تفسیر ہے، سورۂ نساء میں فرمایا ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا، اس مقام پر تأویل کا معنی بہترین انجام، عمدہ نتیجہ اور خوشگوار عاقبت ہے۔

سورۂ اعراف اور سورۂ یونس میں فرمایا: هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ اور وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ان دونوں مقامات پر تأویل سے مراد ان خبروں کا عملاً واقع ہو جانا ہے جن کی اطلاع قرآن نے پہلے دے دی تھی، سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں متعدد مرتبہ تأویل کا لفظ آیا ہے، جیسے: وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ اور هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ

یہاں تأویل سے مراد خواب کی تعبیر اور اس کا حقیقی مفہوم ہے: اسی طرح سورۂ کہف میں حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو نقصان پہنچانے، لڑکے کو قتل کرنے اور دیوار کی تعمیر جیسے اعمال کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا یہاں تأویل سے مراد ان اعمال کی حکمت، علت اور پس پردہ مصلحت ہے، نہ کہ کسی لفظ یا عبارت کی تفسیر، ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں تأویل کبھی تفسیر و توضیح، کبھی انجام و عاقبت، کبھی وقوعِ خبر، کبھی خواب کی تعبیر، اور کبھی کسی عمل کی حکمت و مصلحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان تمام معانی میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہر جگہ تأویل کسی چیز کی حقیقت، نتیجے یا اصل مراد کو ظاہر کرتی ہے۔

تأویل کا اصطلاحی مفہوم: اصطلاحی اعتبار سے تأویل کے مفہوم میں اہلِ علم کے درمیان دو نمایاں رجحانات پائے جاتے ہیں، ایک سلفِ صالحین کا اور دوسرا متأخرین علماء کا۔

اول: سلفِ صالحین کے نزدیک تأویل: سلفِ امت کے ہاں تأویل دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے، پہلا معنی یہ ہے کہ کسی کلام کی تفسیر، تشریح اور اس کے مفہوم کو واضح کرنا، اس اعتبار سے تفسیر اور تأویل مترادف الفاظ ہیں، یہی مفہوم حضرت مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء قرآن کی تأویل جانتے ہیں"، یعنی اس کی تفسیر اور معانی سے واقف ہوتے ہیں، اسی مفہوم کے تحت امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بار بار اَلْقَوْلُ فِي تَأْوِيلِ قَوْلِهِ تَعَالَى کے الفاظ استعمال

کرتے ہیں، جہاں تأویل سے مراد محض تفسیر ہوتی ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ کلام جس حقیقت کی خبر دے رہا ہے، اس حقیقت کا خارج میں وقوع پذیر ہونا، اگر کلام میں کسی عمل کا حکم ہو تو اس کی تأویل اس حکم پر عمل کرنا ہے، اور اگر کسی واقعے کی خبر ہو تو اس کی تأویل اس واقعے کا عملاً پیش آجانا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہی وہ مفہوم ہے جس پر قرآنِ کریم میں لفظ تأویل زیادہ تر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ جب قرآن کسی واقعے کی خبر دیتا ہے تو اس کی تأویل اس خبر کا عملاً رونما ہونا ہے، اور جب کسی عمل کا حکم دیتا ہے تو اس کی تأویل اس حکم پر عمل درآمد ہے۔

دوم: متأخرین علماء کے نزدیک تأویل: فقہاء، متکلمین، محدثین اور متصوفہ کی بعد کی علمی روایت میں تأویل کا ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم رائج ہوا، جس کے مطابق، تأویل سے مراد کسی لفظ کو اس کے ظاہری اور راجح معنی سے ہٹا کر کسی دوسرے ایسے معنی پر محمول کرنا ہے جو اگرچہ احتمال رکھتا ہو، لیکن اپنی اصل حیثیت میں مرجوح ہو، اور اس کے لیے کوئی معتبر دلیل موجود ہو۔

اسی اصطلاح پر علمِ اصولِ فقہ اور فقہی اختلافات کی ایک بڑی بنیاد قائم ہے۔ جب کوئی عالم کسی آیت یا حدیث کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ "یہ نص مؤول ہے" تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے ظاہری مفہوم کے بجائے کسی دوسرے معنی کو، معتبر دلیل کی بنا پر، اختیار کیا گیا ہے، لیکن ایسی تأویل اسی وقت درست اور قابلِ قبول ہوتی ہے جب دو بنیادی شرائط پوری ہوں، اول یہ کہ زبان کے اعتبار سے اس لفظ میں اس معنی کا احتمال موجود ہو جسے اختیار کیا جا رہا ہے، دوم یہ کہ کوئی مضبوط شرعی یا عقلی دلیل موجود ہو جو ظاہری معنی کو چھوڑ کر دوسرے معنی کو اختیار کرنے کا تقاضا کرتی ہو۔

اگر یہ دونوں شرطیں موجود نہ ہوں تو ایسی تأویل محض بے بنیاد تاویل، نصوص کے ساتھ کھیل اور علمی اعتبار سے ناقابلِ قبول سمجھی جاتی ہے، اسی لیے اصولیین نے تصریح کی ہے کہ صحیح تأویل وہی ہے جو معتبر دلیل پر قائم ہو، ورنہ وہ یا تو فاسد تأویل ہے یا محض تحکم۔

یہی وہ اصطلاحی تأویل ہے جس کے بارے میں بعد کے ادوار میں خصوصاً صفاتِ باری تعالیٰ کے

باب میں طویل علمی مباحث پیدا ہوئے، بعض علماء نے ضرورت کے تحت اس کی اجازت دی، جبکہ بعض نے اسے غیر ضروری بلکہ ممنوع قرار دیا۔ تاہم یہ اختلاف دراصل اسی اصطلاحی مفہوم سے متعلق ہے، نہ کہ اس تأویل سے جسے سلفِ صالحین تفسیر یا تحقق مراد کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔

تفسیر اور تاویل میں فرق: قرآنِ کریم کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں دو اصطلاحات تفسیر اور تاویل نہایت اہم ہیں، بظاہر دونوں کا مقصد کلامِ الٰہی کے معانی کو واضح کرنا ہے، لیکن اہلِ علم نے ان کے باہمی تعلق اور فرق کے بارے میں مختلف آراء پیش کی ہیں، اسی وجہ سے علومِ قرآن کی کتابوں میں یہ بحث ہمیشہ ایک اہم علمی موضوع رہی ہے۔

علماء کے درمیان اس مسئلے میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض اہلِ علم نے اسے نہایت دقیق اور مشکل مسئلہ قرار دیا ہے، ابنِ حبیب نیشاپوری رحمہ اللہ نے یہاں تک فرمایا کہ ان کے زمانے میں بہت سے ایسے مفسر پیدا ہوئے جو تفسیر اور تاویل کے درمیان صحیح فرق بیان کرنے سے قاصر تھے، بعض محققین کے نزدیک اس اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے لفظ تاویل کو مختلف مواقع پر مختلف معانی میں استعمال کیا، پھر اصولِ فقہ کے علماء نے اسے ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم دیا، جبکہ متکلمین اور اہلِ مذاہب نے بھی اپنے اپنے انداز سے اس لفظ کو استعمال کیا، جس کے نتیجے میں اس کی تعبیرات مختلف ہوتی چلی گئیں۔

تفسیر اور تاویل کے بارے میں علماء کے اہم اقوال: ا۔ تفسیر اور تاویل مترادف ہیں، حضرت ابو عبیدہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک تفسیر اور تاویل میں کوئی حقیقی فرق نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، یہی رائے متقدمین کے بہت سے مفسرین کے ہاں معروف رہی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک دونوں کا مقصد قرآن کے مفہوم کو واضح کرنا ہے۔

۲۔ راغب اصفہانی رحمہ اللہ کی رائے: علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے دونوں اصطلاحات کے درمیان نہایت باریک فرق بیان کیا ہے، ان کے مطابق، تفسیر کا تعلق زیادہ تر الفاظ، لغوی تشریح اور ظاہری مفہوم سے ہوتا ہے، تاویل کا تعلق معانی، مقاصد اور کلام کے حقیقی مدعا سے ہوتا ہے، اسی لیے غریب

الفاظ کی وضاحت، لغوی تحقیق، یا کسی لفظ کے ظاہری معنی بیان کرنا تفسیر کہلاتا ہے، جبکہ آیات کے گہرے مفاہیم، مقاصد اور احتمالی معانی کی تعیین تاویل کے دائرے میں آتی ہے، خواب کی تعبیر کو بھی اسی مناسبت سے تاویلِ رؤیا کہا جاتا ہے۔

۳۔ امام ماتریدی رحمہ اللہ کا موقف: امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے دونوں کے درمیان فرق کو نہایت اصولی انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک: تفسیر یہ ہے کہ کسی آیت کے بارے میں قطعی طور پر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔ اس لیے تفسیر اسی وقت درست ہوگی جب اس پر قرآن، سنت یا قطعی دلیل موجود ہو، ورنہ ایسا کہنا تفسیر بالرائے میں شمار ہوگا، جس سے شریعت نے منع فرمایا ہے، تاویل یہ ہے کہ متعدد ممکنہ معانی میں سے کسی ایک معنی کو دلائل کی بنیاد پر راجح قرار دیا جائے، لیکن اسے قطعی مرادِ الٰہی قرار نہ دیا جائے، اس اعتبار سے دونوں اصطلاحات الگ الگ دائرہ رکھتی ہیں۔

۴۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ کی وضاحت: امام ابو طالب ثعلبی رحمہ اللہ کے نزدیک: تفسیر لفظ کے ظاہری معنی، حقیقت یا مجاز کی وضاحت کا نام ہے۔ تاویل اس باطنی حقیقت اور مقصد کو بیان کرنا ہے جس کی طرف وہ لفظ رہنمائی کرتا ہے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ: إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کی تفسیر یہ ہوگی کہ المرصاد کا لغوی معنی نگرانی اور تاک میں رہنا ہے، جبکہ اس کی تاویل یہ ہوگی کہ یہ آیت انسان کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈراتی اور ہر وقت اس کے حضور جواب دہی کی تیاری کی تلقین کرتی ہے۔

۵۔ امام بغوی رحمہ اللہ اور علامہ کواشی رحمہ اللہ کی رائے: ان حضرات کے نزدیک: تفسیر آیت کے سببِ نزول، اس کے تاریخی پس منظر اور متعلقہ واقعات کی وضاحت کا نام ہے، تاویل آیت کو اس ایسے محتمل معنی پر محمول کرنا ہے جو سیاق و سباق، قرآن و سنت اور شرعی اصولوں کے مطابق ہو اور استنباط کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔

٦۔ روایت اور درایت کا فرق: بعض علماء نے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں فرمایا: تفسیر روایت پر مبنی ہوتی ہے، تاویل درایت اور اجتہاد پر مبنی ہوتی ہے، یعنی تفسیر میں اصل اعتماد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین سے منقول اقوال پر ہوتا ہے جب کہ تاویل میں علمی بصیرت، اصول

استنباط اور دلائل کی روشنی میں کسی راجح معنیٰ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

۷۔ متأخرین کا معروف نظریہ: متأخرین علماء کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک: تفسیر عبارت کے ظاہری اور لفظی معنی کو بیان کرنے کا نام ہے، تاویل ان لطائف، اشارات اور دقیق معارف کو بیان کرنا ہے جو آیاتِ قرآنیہ سے اہلِ معرفت پر منکشف ہوتے ہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اسی رائے کو اپنے زمانے کا معروف عرف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ موجودہ اہلِ علم کے نزدیک تاویل سے مراد وہ روحانی اشارات اور ربانی معارف ہیں جو الفاظِ قرآن کے پردوں کے پیچھے اہلِ سلوک پر منکشف ہوتے ہیں، جبکہ تفسیر اس سے مختلف چیز ہے۔

راجح اور معتدل رائے: ان تمام اقوال پر غور کرنے کے بعد زیادہ متوازن اور جامع رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ: تفسیر وہ ہے جو معتبر روایت پر قائم ہو، یعنی قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین رحمہم اللہ کی روشنی میں آیات کے معانی بیان کیے جائیں، تاویل وہ ہے جس میں کسی آیت کے متعدد محتمل معانی میں سے قواعدِ زبان، اصولِ شریعت، سیاق و سباق اور مضبوط دلائل کی بنیاد پر کسی ایک معنی کو راجح قرار دیا جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قطعی مراد کا دعویٰ صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب اس پر وحی یا معتبر نقل موجود ہو، جبکہ جہاں ایسی صریح روایت موجود نہ ہو وہاں مجتہد اپنے علمی اجتہاد اور دلائل کی بنیاد پر راجح معنی اختیار کرتا ہے اور یہی تاویل ہے۔

اسی حقیقت کو امام زرکشی رحمہ اللہ نے نہایت جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ علماء نے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق اس لیے قائم کیا تاکہ منقول اور مستنبط علوم میں امتیاز قائم رہے؛ منقول امور میں روایت پر اعتماد کیا جائے، جبکہ مستنبط مسائل میں علمی غور و فکر اور اجتہاد سے کام لیا جائے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر اور تاویل ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ قرآن فہمی کے دو تکمیلی مراحل ہیں، تفسیر وحی سے منقول حقائق کی حفاظت کرتی ہے، جبکہ تاویل انہی اصولوں کی

روشنی میں قرآن کے دقیق معانی اور حکمتوں کو اجاگر کرتی ہے، یوں روایت اور درایت، دونوں کے حسین امتزاج سے قرآنِ مجید کے علوم اپنی پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی غیر عربی زبان میں تفسیر

قرآنِ مجید چونکہ تمام انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، اس لیے ہر دور میں یہ سوال زیرِ بحث رہا ہے کہ غیر عربی زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد تک اس کے پیغام کو کس صورت میں پہنچایا جائے، اسی تناظر میں قرآنِ کریم کی غیر عربی زبان میں تفسیر یا تفسیری ترجمہ ایک نہایت اہم علمی موضوع کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، کیونکہ اس کا براہِ راست تعلق تفسیرِ قرآن سے ہے۔

اس مسئلے کی وضاحت کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ **ترجمہ** سے کیا مراد ہے اور اس کی اقسام کیا ہیں، پھر یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون سی قسم تفسیر کے دائرے میں داخل ہوتی ہے اور کون سی نہیں۔

ترجمہ کا لغوی مفہوم: عربی زبان میں ترجمہ دو بنیادی معانی میں استعمال ہوتا ہے، پہلا معنی یہ ہے کہ کسی زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے ہم معنی الفاظ میں منتقل کر دیا جائے، بغیر اس کے کہ اصل کلام کی تشریح یا توضیح کی جائے، گویا ایک زبان کے لفظ کے مقابلے میں دوسری زبان کا مترادف لفظ رکھ دیا جائے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ کسی کلام کے مفہوم، مراد اور مقصود کو دوسری زبان میں واضح کیا جائے، خواہ اس کے لیے لفظی ترتیب برقرار نہ رکھی جائے۔ علامہ زبیدی رحمہ اللہ نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ ترجمان اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی زبان کے کلام کی تشریح دوسری زبان میں کرے۔ امام جوہری کے مطابق ترجمہ کا مفہوم ایک زبان کے کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بھی ہے۔

ترجمہ کی اقسام: ان معانی کی روشنی میں ترجمہ کی دو بنیادی قسمیں سامنے آتی ہیں ①: حرفی (لفظی) ترجمہ ② معنوی یا تفسیری ترجمہ، ① حرفی ترجمہ: حرفی ترجمہ سے مراد یہ ہے کہ اصل عبارت کو دوسری زبان میں اس انداز سے منتقل کیا جائے کہ حتیٰ الامکان الفاظ، جملوں کی ترتیب اور اسلوبِ بیان بھی اصل کے مطابق باقی رہے، اور اصل متن کے تمام معانی کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے۔

②معنوی یا تفسیری ترجمہ: تفسیری ترجمہ سے مراد یہ ہے کہ اصل کلام کے مفہوم اور مقصد کو دوسری زبان میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے، خواہ اس کے لیے اصل عبارت کی لفظی ترتیب یا اسلوب کو برقرار رکھنا ممکن نہ ہو۔ اس میں مقصود الفاظ کی نقل نہیں بلکہ معنی اور مراد کی صحیح تفہیم ہوتی ہے۔

تفسیر کے دائرے میں کون سا ترجمہ داخل ہے؟: یہاں اصل سوال یہ نہیں کہ قرآنِ کریم کے کس قسم کے ترجمہ کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں اور نہ ہی مقصود متقدمین و متأخرین علماء کے تمام اقوال کا تفصیلی جائزہ لینا ہے، بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ تفسیر کے مفہوم میں کون سا ترجمہ شامل ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے حرفی ترجمہ کی حقیقت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم کا حرفی ترجمہ: قرآنِ کریم کے حرفی ترجمہ کی دو صورتیں تصور کی جاسکتی ہیں: حرفی ترجمہ بالمثل حرفی ترجمہ بغیر المثل (الف) حرفی ترجمہ بالمثل: اس سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا دوسری زبان میں ایسا ترجمہ کیا جائے جو اصل قرآن کے الفاظ، جملوں، اسلوب، نظم، بلاغت اور تمام معانی کا مکمل ہم پلہ اور ہم مثل ہو؛ یعنی ترجمہ کے الفاظ بعینہٖ اصل الفاظ کی جگہ لے سکیں، اور اس کی عبارت وہی تمام بلاغی لطائف، تشریعی احکام اور معنوی باریکیوں کو اپنے اندر سمو لے جو اصل قرآن میں موجود ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امر قرآنِ کریم کے بارے میں ناممکن ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید دو عظیم مقاصد کے لیے نازل ہوا ہے۔

پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا زندہ اور دائمی معجزہ ہے، اس کی فصاحت، بلاغت، نظم، اسلوب، معانی اور اعجاز ایسی خصوصیات ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے تمام انسان اور جن عاجز ہیں، خواہ سب مل کر کوشش کریں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ قرآن انسانیت کو دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ دکھائے اور انہیں ایسے احکام و ہدایات عطا کرے جن میں ان کی حقیقی فلاح مضمر ہے۔

اعجازِ قرآن اور حرفی ترجمہ: پہلا مقصد، یعنی اعجازِ قرآن، کسی بھی حرفی ترجمہ کے ذریعے ہرگز

حاصل نہیں ہو سکتا، اگرچہ قرآن کے اعجاز کے متعدد پہلو ہیں، مثلاً غیب کی خبریں، کامل اور بے نقص شریعت، علمی حقائق اور دیگر بے شمار وجوہِ اعجاز، لیکن ہر آیت میں جاری رہنے والا اعجاز دراصل اس کی مخصوص بلاغت، اسلوب اور الفاظ کے انتخاب میں پوشیدہ ہے۔

ہر زبان کی اپنی جداگانہ بلاغت اور اسلوبی خصوصیات ہوتی ہیں، جو دوسری زبان میں جوں کی توں منتقل نہیں کی جاسکتیں، اس لیے اگر بالفرض قرآن کا لفظی ترجمہ ممکن بھی ہو، تب بھی اس کے اعجازی اسلوب اور بلاغی محاسن محفوظ نہیں رہ سکتے، نتیجتاً وہ کلام، جو اپنی اصل صورت میں معجزہ ہے، انسانی کلام کے درجے میں آجائے گا، اور قرآن کے نزول کا ایک عظیم مقصد فوت ہو جائے گا۔

ہدایت کے پہلو سے حرفی ترجمہ: قرآنِ کریم کا دوسرا مقصد انسانوں کی ہدایت ہے، اس مقصد کے تحت اس سے شرعی احکام، اخلاقی تعلیمات اور دینی رہنمائی اخذ کی جاتی ہے، یہ احکام دو طرح کے معانی پر مبنی ہوتے ہیں، ایک وہ اصلی معانی ہیں جنہیں مختلف زبانوں میں کسی حد تک منتقل کیا جاسکتا ہے، اس لیے ان کی بنیاد پر بنیادی مفہوم اور بعض احکام سمجھنا ممکن ہوتا ہے، دوسری قسم ثانوی، ضمنی اور بلاغی معانی کی ہے، جن سے فقہاء اور مجتہدین دقیق شرعی احکام، لطائف اور استنباطات اخذ کرتے ہیں۔

یہی وہ معانی ہیں جو قرآن کے اعجازی اسلوب کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، اور انہی کی بدولت قرآن اپنے کمالات کے ساتھ قرآن ہے، یہ ثانوی معانی کسی حرفی ترجمہ میں محفوظ نہیں رہ سکتے، کیونکہ وہ عربی زبان کے مخصوص اسالیب، تراکیب اور بلاغی خصوصیات سے وابستہ ہیں، اسی لیے اگرچہ حرفی ترجمہ کسی حد تک ابتدائی معانی منتقل کر سکتا ہے، لیکن قرآن کے تمام مقاصد، اسرار اور لطائف کا جامع ترجمان کبھی نہیں بن سکتا۔

حرفی ترجمہ بغیر المثل: اس سے مراد یہ ہے کہ مترجم اپنی علمی استعداد اور دوسری زبان کی وسعت کے مطابق قرآن کے الفاظ اور جملوں کا حتیٰ الامکان لفظی ترجمہ کرے، اگرچہ وہ اصل قرآن کا مکمل ہم مثل نہ ہو، اگرچہ اس نوعیت کا ترجمہ عام انسانی کلام میں قابلِ قبول ہو سکتا ہے، لیکن قرآنِ کریم کے بارے میں اسے درست قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں قرآن کے اصل نظم، اعجازی اسلوب

اور دقیق معانی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، جس سے کلامِ الٰہی کی عظمت و حرمت مجروح ہوتی ہے۔ مزید برآں، ایسی لفظی پابندی کی کوئی شرعی یا عملی ضرورت بھی موجود نہیں، کیونکہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفہیم کا مقصد **تفسیری ترجمہ** کے ذریعے بہتر انداز میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس بنا پر واضح ہوتا ہے کہ تفسیر کے مفہوم سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی چیز "تفسیری یا معنوی ترجمہ" ہے، نہ کہ محض حرفی ترجمہ۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے قرآنِ کریم کے معانی، مقاصد اور ہدایات کو دوسری زبانوں کے جاننے والوں تک زیادہ صحیح، جامع اور مؤثر انداز میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

حرفی ترجمہ، تفسیرِ قرآن نہیں: گزشتہ بحث سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ حرفی ترجمہ کی دو صورتیں ہیں : حرفی ترجمہ بالمثل اور حرفی ترجمہ بغیر المثل۔ نیز یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی صورت فی نفسہٖ ناممکن ہے، جبکہ دوسری اگرچہ عقلاً ممکن ہے، لیکن قرآنِ کریم کے بارے میں شرعاً جائز نہیں۔

اب ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر بالفرض پہلی صورت ممکن اور دوسری جائز مان لی جائے، تو کیا ان میں سے کوئی بھی صورت غیر عربی زبان میں تفسیرِ قرآن کہلائے گی؟ یا یہ دونوں تفسیر کے مفہوم سے خارج ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ حرفی ترجمہ اپنی کسی بھی صورت میں تفسیر نہیں بن سکتا۔

حرفی ترجمہ بالمثل تفسیر کیوں نہیں؟ حرفی ترجمہ بالمثل سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نظم، اسلوب، الفاظ اور معانی کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ ترجمہ اصل قرآن کا مکمل ہم مثل بن جائے، اگرچہ قرآن کے بارے میں یہ صورت عملاً ناممکن ہے، لیکن اگر محض فرض کے طور پر اسے ممکن بھی مان لیا جائے، تب بھی اسے تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے ترجمہ میں شرح و وضاحت نہیں ہوتی، بلکہ صرف ایک زبان کے الفاظ کی جگہ دوسری زبان کے الفاظ رکھ دیے جاتے ہیں، گویا اصل عبارت کا قالب تو تبدیل ہو جاتا ہے، مگر اس کے اسرار، دقائق، احکام، حکمتیں اور معانی کی تشریح پیش نہیں کی جاتی۔

چنانچہ جس طرح عربی جاننے والا شخص قرآن کو سمجھنے کے لیے تفسیر کا محتاج ہے، اسی طرح

دوسری زبان کا قاری بھی ایسے حرفی ترجمہ کے باوجود تفسیر کا محتاج رہے گا، کیونکہ صرف الفاظ کے بدل جانے سے قرآن کے عمیق مفاہیم خود بخود واضح نہیں ہو جاتے۔

حرفی ترجمہ بغیر المثل بھی تفسیر نہیں: اسی طرح حرفی ترجمہ بغیر المثل، جس میں مترجم اپنی زبان کی وسعت اور اپنی علمی استعداد کے مطابق قرآن کے الفاظ کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، تفسیر کے زمرے میں داخل نہیں ہوتا، اس نوعیت کا ترجمہ نہ صرف اصل قرآن کے نظم اور معانی کا مکمل ترجمان نہیں بنتا، بلکہ اس میں صرف بعض معانی کو دوسرے الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں نہ کسی مشکل لفظ کی وضاحت ہوتی ہے، نہ مجمل کی تفصیل، نہ مطلق کی تقیید، نہ احکام کا استنباط، نہ معانی کی توجیہ، اور نہ وہ دیگر علمی مباحث جن پر علمِ تفسیر کی بنیاد قائم ہے۔

لہٰذا حرفی ترجمہ خواہ کسی بھی صورت میں ہو، اس کا دائرہ صرف الفاظ کی تبدیلی تک محدود رہتا ہے، جبکہ تفسیر کا مقصد معانی کو واضح کرنا اور قرآن کے علوم و اسرار کو آشکار کرنا ہے۔

قرآنِ کریم کا تفسیری ترجمہ: اس کے برعکس تفسیری یا معنوی ترجمہ حقیقت میں قرآن کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ اس میں اصل الفاظ اور ان کی ترتیب کو برقرار رکھنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن کا وہ مفہوم، جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، دوسری زبان کے مناسب اور معروف اسلوب میں صحیح طور پر ادا ہو جائے۔ اس طرح مترجم پہلے اصل عبارت کے صحیح معنی کو سمجھتا ہے، پھر انہیں دوسری زبان میں ایسے الفاظ اور اسلوب کے ساتھ بیان کرتا ہے جو اس زبان کے اہلِ علم و فہم کے لیے زیادہ واضح اور مؤثر ہوں۔

حرفی اور تفسیری ترجمہ میں فرق: اس فرق کو ایک قرآنی مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ. اگر اس آیت کا حرفی ترجمہ کیا جائے تو مفہوم یہی بنے گا کہ "اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو، اور نہ اسے پوری طرح پھیلا دو، لیکن جس زبان میں یہ محاورہ رائج نہ ہو، وہاں کا قاری اس عبارت کو لفظی معنی پر محمول کرے گا اور حیران ہو گا کہ آخر کوئی شخص اپنا ہاتھ گردن سے کیوں باندھے گا یا اس طرح کیوں

پھیلائے گا کہ اس سے منع کیا جارہا ہے؟

اس کے برخلاف تفسیری ترجمہ اس آیت کا اصل مقصود واضح کرتا ہے، یعنی یہ کہ انسان نہ بخل اور کنجوسی اختیار کرے اور نہ فضول خرچی اور اسراف میں مبتلا ہو، بلکہ اعتدال کی راہ اپنائے۔ اس طرح قرآن کا مطلوب پیغام پوری وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کا حقیقی مفہوم حرفی ترجمہ کی نسبت تفسیری ترجمہ میں کہیں زیادہ نمایاں اور قابلِ فہم ہوجاتا ہے۔

تفسیری ترجمہ کا شرعی جواز: جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تفسیری ترجمہ درحقیقت دوسری زبان میں قرآن کی تفسیر ہی کا نام ہے، تو اس کے جواز میں کسی تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی، امتِ مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص تفسیر کی شرائط کا حامل ہو، وہ اپنی بشری استطاعت کے مطابق قرآن کے معانی کی وضاحت کرسکتا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی تمام مراد کا احاطہ کسی انسان کے لیے ممکن نہیں، اسی اجماع کے تحت تفسیری ترجمہ بھی مشروع اور جائز ہے، کیونکہ یہ قرآن کا ترجمہ نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر کا ترجمہ ہے۔

جس طرح تفسیر میں الفاظ کی تشریح، مجمل کی توضیح، احکام کی تفصیل، دلائل کی تحقیق، معانی کی توجیہ اور قرآنی ہدایات کی وضاحت کی جاتی ہے، اسی طرح تفسیری ترجمہ بھی انہی امور کو دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ اس لیے وہ درحقیقت تفسیر ہی کی ایک صورت ہے۔

مختصر یہ کہ تفسیر اور اس کا ترجمہ دونوں قرآن کے معانی کو واضح کرتے ہیں، نہ کہ قرآن کے اصل الفاظ کا قائم مقام بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کا اصل متن اپنی جگہ محفوظ اور مستقل رہتا ہے، جبکہ تفسیر اور تفسیری ترجمہ اس کے مفاہیم کو سمجھنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

تفسیر اور تفسیری ترجمہ میں فرق: اگرچہ تفسیری ترجمہ حقیقت کے اعتبار سے تفسیر ہی ہے، تاہم دونوں میں چند نمایاں فرق بھی پائے جاتے ہیں۔ ① زبان کا فرق، سب سے پہلا فرق زبان کا ہے، تفسیر عموماً اسی زبان میں لکھی جاتی ہے جس زبان میں اصل قرآن نازل ہوا، یعنی عربی، یا ایسی زبان میں جس میں اصل آیات کو سامنے رکھ کر وضاحت کی جائے، جبکہ تفسیری ترجمہ کسی

دوسری زبان میں ہوتا ہے، تاکہ غیر عربی جاننے والے افراد بھی قرآن کے مفاہیم سے آگاہ ہو سکیں۔

② اصل متن سے مراجعت کی سہولت: دوسرا فرق یہ ہے کہ تفسیر پڑھنے والا شخص اصل عربی متن کو بھی سامنے رکھ سکتا ہے۔ اگر کسی مقام پر مفسر سے لغزش ہو تو دوسرے اہلِ علم اس کی نشاندہی اور اصلاح کر سکتے ہیں، لیکن وہ شخص جو صرف ترجمہ پڑھ رہا ہو اور عربی زبان سے واقف نہ ہو، اس کے لیے اصل قرآن سے تقابل ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اسی ترجمہ کو قرآن کا صحیح مفہوم سمجھتا ہے۔ اسی لیے تفسیری ترجمہ میں معمولی سی علمی لغزش بھی بڑے فکری نتائج پیدا کر سکتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

تفسیری ترجمہ کی شرائط: قرآنِ کریم کی تفسیر امتِ مسلمہ کے اہم ترین علمی فرائض میں سے ہے، اور چونکہ تفسیری ترجمہ بھی تفسیر ہی کی ایک صورت ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری اور اہمیت بھی غیر معمولی ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ دنیا کی اکثریت عربی زبان سے ناواقف ہے، قرآن کے صحیح پیغام کو مختلف زبانوں میں پہنچانا ایک عظیم دینی خدمت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باطل افکار، گمراہ کن تراجم اور اسلام مخالف پروپیگنڈے کا علمی جواب دیا جائے، کیونکہ بعض معاندین نے قرآن کے ایسے تراجم پیش کیے جن میں اسلامی عقائد کو مسخ کر کے قرآن کا غلط تصور پیش کیا گیا، اس لیے ایک صحیح اور معتبر تفسیری ترجمہ کے لیے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

پہلی شرط: معتبر تفسیر پر اعتماد: ترجمہ ایسے مستند عربی تفاسیر کی روشنی میں کیا جائے جو قرآن، سنتِ نبوی، عربی لغت اور شریعت کے مسلمہ اصولوں پر مبنی ہوں، مترجم اپنی ذاتی رائے کو قرآن کا مفہوم قرار نہ دے، بلکہ معتبر علمی مصادر سے رہنمائی حاصل کرے۔

دوسری شرط: صحیح العقیدہ ہونا: مترجم کا عقیدہ اہلِ حق کے مطابق ہو اور وہ کسی گمراہ کن فکر یا باطل نظریہ سے متاثر نہ ہو، کیونکہ فاسد عقیدہ اکثر انسان کو قرآن کے معانی میں اپنی خواہشات داخل کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے، جس سے قرآن کا حقیقی پیغام مسخ ہو جاتا ہے۔

تیسری شرط: دونوں زبانوں پر کامل عبور: مترجم کو عربی زبان اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا

ہے، دونوں پر مکمل مہارت حاصل ہو، وہ دونوں زبانوں کے اسالیب، محاورات، دلالات اور ادبی خصوصیات سے بخوبی واقف ہو، تاکہ مفہوم کو صحیح اور مؤثر انداز میں منتقل کر سکے۔

چوتھی شرط: اصل قرآن، تفسیر اور ترجمہ کی ترتیب: مناسب طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآنِ کریم کا اصل عربی متن لکھا جائے، اس کے بعد اس کی تفسیر پیش کی جائے، اور پھر اس تفسیر کا دوسری زبان میں ترجمہ درج کیا جائے، تاکہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ عبارت قرآن کا لفظی ترجمہ یا خود قرآن کا قائم مقام ہے۔

ان شرائط کی رعایت کے ساتھ کیا جانے والا تفسیری ترجمہ علمی اعتبار سے قابلِ اعتماد، شرعی لحاظ سے معتبر اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں نہایت مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد قرآن کے الفاظ کا بدل پیش کرنا نہیں بلکہ اس کے ابدی پیغام کو مختلف زبانوں کے انسانوں تک صحیح، واضح اور دیانت دارانہ انداز میں پہنچانا ہے۔

علمِ تفسیر: تصورات میں شامل ہے یا تصدیقات میں؟: علمِ تفسیر کی ماہیت کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان ایک علمی بحث پائی جاتی ہے کہ آیا یہ علومِ تصورات میں شمار ہوتا ہے یا علومِ تصدیقات میں۔ اس اختلاف کی بنیاد دراصل علمِ تفسیر کی حقیقت اور اس کے بنیادی مقصد کے تعین پر ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ علمِ تفسیر تصورات کے قبیل سے ہے، کیونکہ اس کا اصل مقصد قرآنِ کریم کے الفاظ اور تراکیب کے معانی کو واضح کرنا ہے۔ جب کسی لفظ یا ترکیب کے مفہوم کی تشریح کی جاتی ہے تو حقیقت میں اس کا تعارف اور تصور ذہن میں قائم کیا جاتا ہے، اور یہ عمل علومِ تصورات کے دائرے میں آتا ہے۔

اسی بنا پر علامہ حکیم رحمۃ اللہ نے مطول میں لکھا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر علم میں باقاعدہ مسائل ہی پائے جائیں۔ ان کے نزدیک یہ خصوصیت زیادہ تر حکمی علوم سے متعلق ہے، جبکہ لغت، حدیث اور تفسیر جیسے علوم بنیادی طور پر الفاظ اور ان کے مفاہیم کی وضاحت پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے انہیں تصورات کے ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس بعض محققین، خصوصاً سید شریف کی رائے یہ ہے کہ علمِ تفسیر تصدیقات میں شامل ہے، کیونکہ مفسر محض معنی بیان نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ بھی کرتا ہے کہ قرآن کا فلاں لفظ یا عبارت اسی معنی پر دلالت کرتی ہے، گویا مفسر ایک علمی حکم صادر کرتا ہے کہ اس لفظ سے یہی مراد ہے، اور یہی حکم تصدیق کہلاتا ہے۔

مثلاً جب یہ کہا جائے کہ یَا أَیُّهَا النَّاسُ سے عام انسانوں کو خطاب ہے، یایَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا سے اہلِ ایمان مراد ہیں، یا لفظ اللہ سے ذاتِ باری تعالیٰ اور الرحمن سے اس کی صفتِ رحمت مراد ہے، تو یہ سب جزوی قضیے اور علمی فیصلے ہیں، اس لیے ان کا تعلق تصدیقات سے ہے، حقیقت یہ ہے کہ علمِ تفسیر میں دونوں پہلو کسی نہ کسی درجے میں موجود ہیں، اگرچہ غالب حیثیت اس کے مقصد اور زاویۂ نظر کے اعتبار سے متعین کی جاتی ہے۔

تفسیر کا اولین دور: عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم

قرآنِ کریم ایسے معاشرے میں نازل ہوا جس کے نبی بھی اُمّی تھے اور جس قوم میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے وہ بھی عمومی طور پر رسمی تعلیم و تحریر سے ناواقف تھی۔ البتہ عرب اپنے فطری ذوقِ زبان، قوتِ حافظہ اور فصاحت و بلاغت میں بے مثال تھے۔ ان کی پوری علمی و ادبی زندگی زبان ہی کے گرد گھومتی تھی، اور وہ اپنے کلام میں فصاحت، بلاغت، محاورہ، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، ایجاز اور اطناب جیسے اسالیب سے بخوبی واقف تھے۔

ان کی ادبی روایت زیادہ تر وصف و مدح، حکمت و نصیحت، نسب ناموں، تاریخی واقعات اور قبائلی روایات پر مشتمل تھی۔ ان کے کلام میں حقیقت بھی ہوتی تھی اور مجاز بھی، تصریح بھی ہوتی تھی اور کنایہ بھی، اختصار بھی پایا جاتا تھا اور بلیغ تفصیل بھی۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہر رسول کو اسی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ اللہ کا پیغام پوری وضاحت کے ساتھ اپنی قوم تک پہنچا سکے۔ اسی اصول کے مطابق قرآنِ مجید بھی عربی زبان میں نازل ہوا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ

لَهُمْ ہم نے ہر رسول کو اسی کی قوم کی زبان دے کر بھیجا تاکہ وہ ان کے لیے حق کو خوب واضح کر دے۔ (ابراہیم:۴) چنانچہ قرآنِ کریم کی زبان خالص عربی ہے۔ اگرچہ چند الفاظ کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ان کی اصل دوسری زبانوں سے ہے یا نہیں، لیکن دونوں آراء کا حاصل یہی ہے کہ وہ الفاظ عربی استعمال میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ قرآن کے عربی ہونے میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

قرآنِ مجید نے بھی اپنے اسلوب میں وہی معروف عربی طرزِ بیان اختیار کیا جس سے اہلِ عرب مانوس تھے۔ اس میں حقیقت و مجاز، کنایہ و تصریح، ایجاز و اطناب سب کچھ موجود ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن کا اسلوب ہر انسانی کلام سے بلند، اس کے معانی ہر فکر سے برتر، اور اس کی بلاغت ہر ادبی شاہکار سے کہیں زیادہ کامل ہے، یہی اس کا اعجاز ہے، کیونکہ یہ کسی انسان کا نہیں بلکہ حکیم و خبیر پروردگار کا کلام ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا فہمِ قرآن: یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآنِ کریم کو اس کے تمام اجمالی اور تفصیلی معانی کے ساتھ سب سے زیادہ جانتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت، قراءت اور بیان کی ذمہ داری اپنے ذمے لی تھی۔ ارشادِ ربانی ہے: إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ، اسے جمع کرنا، پڑھوانا اور پھر اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔" (القیامۃ:۱۷-۱۹) اسی لیے رسول اللہ ﷺ قرآن کے ظاہری اور باطنی معانی، احکام، اسرار اور مقاصد سے کامل طور پر آگاہ تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ اس سے مختلف تھا، وہ عربی زبان کے اہل تھے، اس لیے قرآن کے عمومی مفاہیم، ظاہری احکام اور بنیادی ہدایات کو بڑی حد تک سمجھ لیتے تھے، لیکن قرآن کے تمام دقیق معانی، اسرار، ناسخ و منسوخ، اسباب نزول، متشابہات اور دیگر باریک علمی مباحث کا مکمل ادراک صرف عربی زبان جان لینے سے ممکن نہ تھا۔

اسی وجہ سے جب کبھی کوئی آیت ان پر مشکل ہوتی تو وہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی خدمت

میں حاضر ہو کر اس کی وضاحت حاصل کرتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے صرف زبان کافی نہیں، بلکہ وحی کی تشریح، اسبابِ نزول اور نبوی تعلیمات بھی ناگزیر ہیں۔

کیا تمام عرب قرآن کو یکساں سمجھتے تھے؟ بعض اہلِ علم، خصوصاً ابن خلدون نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا، اس لیے تمام اہلِ عرب اس کے الفاظ اور تراکیب کو بخوبی سمجھتے تھے، لیکن یہ رائے مکمل طور پر درست معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ کسی کتاب کا ایک زبان میں ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس زبان کا ہر فرد اس کے تمام دقیق مفاہیم بھی سمجھ لے، آج بھی دنیا کی ہر زبان میں نہایت بلند علمی اور ادبی کتابیں لکھی جاتی ہیں، لیکن اسی زبان کے بے شمار افراد ان کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فہمِ کلام صرف زبان دانی پر موقوف نہیں، بلکہ اس کے لیے علمی استعداد، فکری گہرائی اور مناسب ذوق بھی درکار ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فہمِ قرآن میں تفاوت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگرچہ سب کے سب ایمان، تقویٰ اور اخلاص میں ممتاز تھے، لیکن فہم قرآن کے اعتبار سے ان کے درجات یکساں نہ تھے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آیت کا وہ مفہوم سمجھ لیتے تھے جو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگاہ سے اوجھل رہتا تھا، اس تفاوت کی متعدد وجوہ تھیں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم عربی لغت پر زیادہ گہری نظر رکھتے تھے، بعض اسبابِ نزول سے زیادہ واقف تھے، بعض مسلسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہتے تھے، جبکہ بعض کو فقہی استنباط اور تدبر کی غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی۔

اسی لیے بعض الفاظ ایسے بھی تھے جن کا معنی بعض جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی مخفی رہ جاتا تھا اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ کسی بھی زبان کے تمام الفاظ پر کامل احاطہ صرف معصوم ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب منبر پر سورہ عبس کی آیت وَفَاكِهَةً وَأَبًّا تلاوت فرمائی تو فرمایا: "پھل تو ہم جانتے ہیں، لیکن اَبّ سے کیا مراد ہے؟" پھر خود ہی فرمایا کہ اس قسم کی بے جا تکلف آمیز بحث سے بچنا چاہیے، اسی طرح سورۂ نحل میں لفظ تَخَوُّفٍ کا معنی بھی آپ رضی اللہ عنہ پر واضح نہ تھا، حتیٰ

کہ قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے بتایا کہ ان کی زبان میں اس کا معنیٰ تدریجاً کمی واقع ہونا ہے اوراس نے عربی شعر سے بھی اس کی تائید کی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جنہیں ترجمان القرآن کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں کہ میں مدت تک فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکا، یہاں تک کہ دو بدویوں کو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے سنا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا :أنا فطرتها یعنی "میں نے اس کی ابتدا کی "تب مجھے معلوم ہوا کہ فاطر کا معنی پیدا کرنے والا اور ابتدا کرنے والا ہے۔

یہ واقعات اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہر لفظ کے معنی میں یکساں درجے پر نہیں تھے، اسی طرح صحیح بخاری کی مشہور روایت میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے آیت: وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ کو لفظی معنی پر محمول کرتے ہوئے سفید اور سیاہ دھاگے اپنے پاس رکھ لیے تاکہ ان کے ذریعے وقتِ سحری معلوم کریں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ یہاں سفید اور سیاہ دھاگے سے مراد رات کی تاریکی اور صبح کی سفیدی ہے، نہ کہ حقیقی دھاگے۔

ان تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں فہمِ قرآن کے درجات مختلف تھے اوروہ ضرورت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اسی حقیقت کو تابعی بزرگ مسروق رحمہ اللہ نے نہایت خوبصورت مثال سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی صحبت اختیار کی تو انہیں پانی کے مختلف ذخائر کی مانند پایا؛ کوئی ایسا تھا جو ایک شخص کی پیاس بجھا دے، کوئی دو کی، کوئی دس کی، کوئی سو کی، اور کوئی ایسا عظیم سمندر تھا کہ اگر پوری دنیا اس سے سیراب ہونا چاہے تو وہ سب کو سیراب کر دے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے بھی اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام عرب قرآن کے غریب الفاظ اور متشابہات کے علم میں برابر نہ تھے، بلکہ بعض کو بعض پر نمایاں فضیلت حاصل تھی۔

خود علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے بھی بعد میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ رسول

اللہ ﷺ مجمل آیات کی وضاحت فرماتے، ناسخ و منسوخ بیان کرتے اور اسبابِ نزول سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو آگاہ فرماتے تھے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صرف عربی زبان جان لینا قرآن کے تمام معانی تک رسائی کے لیے کافی نہیں تھا بلکہ نبوی تعلیم و تشریح ہی اس کی حقیقی کنجی تھی۔

دورِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مصادرِ تفسیر قرآن

① پہلا مصدر: قرآنِ کریم خود: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں تفسیرِ قرآن کا سب سے پہلا، مستند اور بنیادی سرچشمہ خود قرآنِ مجید تھا، وہ جب کسی آیت کے معنی یا مفہوم میں مزید وضاحت چاہتے تو سب سے پہلے قرآن ہی کی دوسری آیات کی طرف رجوع کرتے، کیونکہ ایک ہی ذات نے پورا قرآن نازل فرمایا ہے، اس لیے اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی بہترین تشریح کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ کہیں کسی مضمون کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور کہیں اسی مضمون کی تفصیل مذکور ہے، بعض مقامات پر حکم مجمل ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت موجود ہے۔ کہیں کوئی حکم مطلق ہے تو دوسری جگہ اسی پر قید وارد ہو گئی ہے اور کہیں کوئی حکم عام ہے تو دوسری آیت میں اس کی تخصیص بیان کر دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مفسر کے لیے اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ متعلقہ تمام آیات کو یکجا کرے، انہیں باہم ملا کر دیکھے اور قرآن کو قرآن ہی کی روشنی میں سمجھے۔

یہی وہ اصول ہے جسے "تفسیر القرآن بالقرآن" کہا جاتا ہے، اور یہی تفسیر کا سب سے اعلیٰ اور قابلِ اعتماد طریقہ ہے، کیونکہ کلام کا اصل مفہوم سب سے بہتر اس کے متکلم ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے کلام کا سب سے صحیح مفہوم بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دوسرے کلام سے ہی متعین ہو گا، اس اصول کی متعدد صورتیں ہیں۔

سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ کسی مقام پر بیان کردہ مختصر واقعہ کو دوسرے مقام پر مذکور مفصل بیان سے سمجھا جائے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ، یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ، بعض سورتوں میں نہایت اختصار سے بیان ہوا ہے جبکہ دیگر مقامات پر اس کی تمام تفصیلات مذکور ہیں، اس طرح ایک آیت دوسری آیت کی مکمل وضاحت بن جاتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مجمل آیت کو مبین آیت کی روشنی میں سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کے متعلق سورۂ بقرہ میں صرف یہ فرمایا گیا: فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، لیکن وہ کلمات کون سے تھے؟ اس کی وضاحت سورۂ اعراف میں کر دی گئی، جہاں حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کی یہ دعا نقل ہوئی: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ، اسی طرح سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کی حلت کا ذکر ہے، مگر کون سے جانور اس سے مستثنیٰ ہیں، اس کی وضاحت اسی سورت کی تیسری آیت میں کر دی گئی جہاں حرام جانوروں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

اسی اصول کے تحت مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر محمول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وضو میں ہاتھ دھونے کا حکم کہنیوں تک مقید ہے، جبکہ تیمم میں صرف ہاتھوں کا ذکر آیا ہے۔ فقہاء نے قرآن ہی کی روشنی میں اس اطلاق کو اس قید کے ساتھ سمجھا ہے۔ اسی طرح بہت سے عمومی احکام دوسری آیات کے ذریعے مخصوص ہو جاتے ہیں۔

قرآن کی تفسیر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ بظاہر مختلف نظر آنے والی آیات میں تطبیق پیدا کی جائے۔ مثال کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں کہیں مٹی، کہیں گارا، کہیں سیاہ بدبودار کیچڑ اور کہیں خشک بجنے والی مٹی کا ذکر آیا ہے، حقیقت میں یہ مختلف اقوال نہیں بلکہ تخلیقِ آدم کے مختلف مراحل کا بیان ہے، اس لیے ان میں کوئی تعارض نہیں۔

اسی طرح قراءاتِ قرآنیہ بھی بعض مواقع پر تفسیر کا اہم ذریعہ بنتی ہیں، متواتر قراءات ایک دوسرے کے معانی کو مزید واضح کرتی ہیں، جبکہ بعض شاذ قراءات کو جمہور علماء نے قرآن کا حصہ قرار دینے کے بجائے تفسیری روایت کی حیثیت دی ہے، کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بعض اوقات تفسیر کو بھی مصحف کے حاشیے میں لکھ دیا کرتے تھے، بعد کے لوگوں نے ان میں سے بعض کو قراءت سمجھ لیا۔

مشہور تابعی امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ قول اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اگر انہیں ابتدا ہی میں

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت معلوم ہو جاتی تو بہت سے مقامات پر انہیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، کیونکہ ان قراءات میں بہت سی آیات کی تفسیری وضاحت موجود تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی تفسیر، قرآن کے ذریعے کرنا محض ظاہری مشابہت تلاش کرنے کا نام نہیں، بلکہ یہ نہایت دقیق علمی کام ہے، جس کے لیے علومِ قرآن، اصولِ تفسیر، عربی زبان اور سیاق وسباق پر گہری نظر درکار ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ مقام ہر شخص کے بس کی بات نہیں بلکہ اہلِ علم اور اصحابِ بصیرت ہی اس ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کر سکتے ہیں۔

بعض مستشرقین نے اگرچہ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ تفسیر کا اولین مرحلہ خود قرآن سے شروع ہوتا ہے، لیکن انہوں نے قراءات کے حوالے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر بے بنیاد اعتراضات بھی کیے ہیں، گویا مختلف قراءات بعد کے لوگوں کی ایجاد تھیں، یہ دعویٰ علمی اور تاریخی دونوں اعتبار سے باطل ہے، کیونکہ امتِ مسلمہ نے ہمیشہ صرف انہی قراءات کو قبول کیا ہے جو تواتر، صحتِ سند، رسمِ عثمانی اور قواعدِ عربیت کے مطابق ثابت ہوں۔ رہی شاذ قراءات، تو اہلِ علم نے انہیں قرآن نہیں بلکہ تفسیر واستشہاد کے درجے میں رکھا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ صحابۂ کرام نے قرآن میں تبدیلی یا تحریف کی، نہایت بے بنیاد اور انصاف کے خلاف دعویٰ ہے، جسے امت کے محدثین، مفسرین اور قراء نے ہمیشہ رد کیا ہے۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن نہ صرف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اولین منہج تھا بلکہ آج بھی علمِ تفسیر کا سب سے مضبوط، محفوظ اور قابلِ اعتماد اصول یہی ہے، یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآنِ کریم کی صحیح فہم، صحیح استنباط اور صحیح تفسیر کی پوری عمارت قائم ہے۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کی تفسیر بیان فرمائی؟

قرآنِ کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک عظیم مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کی وضاحت فرمائیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے، وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ اور ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن) اس لیے نازل کیا ہے کہ

آپ لوگوں کے لیے اس چیز کو کھول کر بیان کریں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

اس آیت کی روشنی میں اہلِ علم کے درمیان ایک اہم علمی بحث پیدا ہوئی کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآنِ کریم کے تمام معانی و مطالب بیان فرما دیے تھے، یا صرف ان مقامات کی وضاحت فرمائی جہاں تشریح کی ضرورت تھی؟ اس مسئلے میں علماء کے دو معروف نقطۂ نظر ہیں۔

پہلا موقف: رسول اللہ ﷺ نے پورے قرآن کی تفسیر بیان فرمائی، اس رائے کے نمایاں ترجمان شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، ان کے نزدیک جس طرح نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے الفاظ مکمل طور پر پہنچائے، اسی طرح اس کے تمام معانی بھی واضح فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو "بیان" کی ذمہ داری سونپی تھی اور اس ذمہ داری کی تکمیل اسی صورت میں ممکن تھی کہ قرآن کے تمام معانی امت کے سامنے بیان کر دیئے جاتے۔

اس موقف کی تائید میں متعدد دلائل پیش کیے جاتے ہیں، سب سے پہلی دلیل یہی مذکورہ آیت ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی وضاحت کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ دوسری دلیل حضرت ابو عبد الرحمن سلمی رحمہ اللہ کی وہ مشہور روایت ہے جس میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے دس آیات سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے جب تک ان آیات کے علم، مفہوم اور عملی تقاضوں کو اچھی طرح نہ سمجھ لیتے۔ اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کو صرف حفظ نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر تدبر اور عمل کو بھی لازم سمجھتے تھے۔

اسی تناظر میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سورۂ بقرہ کو مکمل سمجھنے اور اس پر عمل سیکھنے میں کئی سال صرف کیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصد صرف الفاظ یاد کرنا نہیں بلکہ اس کے معانی کو سمجھنا اور زندگی میں نافذ کرنا ہے۔

تیسری دلیل عقل و عادت پر مبنی ہے، اگر کوئی شخص طب، فقہ یا کسی اور فن کی کتاب پڑھے تو لازماً اس کی تشریح طلب کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنی ہدایت، نجات اور

کامیابی کی اصل کتاب کو بغیر مکمل تشریح کے قبول کر لیتے؟

چوتھی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ سود سے متعلق آخری آیات نازل ہوئیں، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کی مکمل تشریح فرمانے سے پہلے وصال فرما گئے، اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر عموماً آپ ﷺ تمام آیات کی تفسیر نہ فرمایا کرتے تو اس ایک آیت کے متعلق یہ تخصیص بے معنی ہوتی۔

دوسرا موقف: رسول اللہ ﷺ نے صرف ضروری مقامات کی وضاحت فرمائی، دوسرے گروہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر معنی کی الگ الگ تفسیر بیان نہیں فرمائی، بلکہ صرف ان آیات کی تشریح فرمائی جن میں وضاحت کی ضرورت تھی، اس موقف کے نمایاں علماء میں امام خُوَیّی رحمہ اللہ اور امام سیوطی رحمہ اللہ شامل ہیں۔

ان کی پہلی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول وہ روایت ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی صرف چند مخصوص آیات کی تفسیر فرمائی، جو آپ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سکھائی تھیں۔

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ قرآن کے ہر ہر مفہوم کو الگ الگ بیان فرما دیتے تو تدبر، اجتہاد اور غور و فکر کا دروازہ تقریباً بند ہو جاتا، جبکہ قرآن بار بار انسان کو تفکر، تدبر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔

تیسری دلیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی وہ مشہور دعا ہے: اللَّهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ اگر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو تمام معانی یکساں طور پر سکھا دیئے گئے ہوتے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے اس خصوصی دعا کی کوئی خاص حکمت باقی نہ رہتی۔

دونوں آراء کا تنقیدی جائزہ: تحقیق کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے موقف میں کسی حد تک مبالغہ اختیار کیا ہے، پہلی رائے کے دلائل اس بات کو قطعی طور پر ثابت نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ہر ہر لفظ کی الگ الگ تفسیر فرمائی، جبکہ دوسری رائے کے دلائل بھی یہ ثابت نہیں کرتے کہ آپ ﷺ نے صرف چند آیات ہی کی وضاحت فرمائی تھی۔

مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت، جسے دوسری رائے کی بنیادی دلیل بنایا جاتا ہے، محدثین کے نزدیک سند کے اعتبار سے قوی نہیں، متعدد ائمہ حدیث رحمہم اللہ نے اس کے بعض راویوں پر جرح کی ہے، اور اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ لیا جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غیبی امور کی وضاحت فرمائی جن تک عقل یا زبان کے ذریعے رسائی ممکن نہ تھی۔

اسی طرح پہلی رائے کے دلائل بھی صرف اس قدر ثابت کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کو سمجھتے تھے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر ہر آیت کی تشریح براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منقول ہو۔

معتدل اور راجح موقف: ان تمام دلائل کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کے بہت سے معانی و احکام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تفصیل سے بیان فرمائے، لیکن ہر ہر آیت کی الگ مستقل تفسیر نہیں فرمائی۔

اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کے مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جنہیں عرب اپنی زبان کی فصاحت کے باعث خود بخوبی سمجھتے تھے، اس لیے ان کی الگ تشریح کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بعض احکام ایسے تھے جنہیں ہر مسلمان کے لیے جاننا ضروری تھا، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ بعض آیات غیبی حقائق پر مشتمل تھیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو تھا، اس لیے ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی۔

اسی حقیقت کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا ہے کہ تفسیر چار قسموں پر مشتمل ہے، ① وہ جسے عرب اپنی زبان کے ذریعے سمجھ لیتے ہیں۔ ② وہ جسے ہر مسلمان کے لیے جاننا ضروری ہے۔ ③ وہ جسے اہلِ علم اپنے اجتہاد اور تحقیق سے سمجھتے ہیں۔

④ اور وہ جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بعض آیات کی تفسیر میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، اگر ہر آیت کی قطعی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوتی تو اس قسم کے علمی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

سنتِ نبوی: قرآن کی سب سے مستند شارح

اس بحث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سنتِ نبوی قرآنِ کریم سے الگ کوئی مستقل تشریعی نظام نہیں، بلکہ قرآن کی سب سے پہلی، سب سے معتبر اور سب سے مستند شرح ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صرف قرآن پہنچانے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ اس کی توضیح، تشریح اور عملی تطبیق بھی آپ ہی کے سپرد فرمائی۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، أَلَآ إِنِّي أُوتِيتُ الكِتَابَ وَمِثلَهُ مَعَهُ، خبردار! مجھے کتاب بھی عطا کی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز بھی عطا کی گئی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی صرف قرآنِ کریم تک محدود نہیں، بلکہ سنتِ نبوی بھی وحیِ الٰہی کی روشنی میں قرآن کی عملی اور تشریعی تفسیر ہے۔ چنانچہ قرآن اور سنت ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں؛ قرآن اصل ہے اور سنت اس کی شرح و توضیح۔ اسی لیے قرآنِ کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سنتِ رسول ﷺ سے بے نیاز ہونا کبھی ممکن نہیں۔

تیسرا مصدرِ تفسیر: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد اور قوت استنباط

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں تفسیرِ قرآن کا تیسرا اہم مصدر اجتہاد، تدبر اور قوتِ استنباط تھا۔ جب کسی آیت کی تفسیر نہ تو قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ ملتی، نہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی واضح تشریح منقول ہوتی، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے علمی ذوق، فہمِ سلیم اور اجتہادی بصیرت کی روشنی میں اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

البتہ یہ اجتہاد ہر آیت میں نہیں کیا جاتا تھا، جن آیات کا مفہوم صرف عربی زبان کے عام محاورے اور اسلوب سے واضح ہو جاتا، ان میں اجتہاد کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خالص عرب تھے، وہ عربی زبان کی لطافتوں، محاورات، استعارات، اسالیبِ بیان اور لغوی اسرار سے بخوبی واقف تھے۔ جاہلی عرب کے اشعار، جو عربی زبان کا مستند سرمایہ سمجھے جاتے تھے، ان

کے لیے الفاظ کے معانی متعین کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھے، اسی حقیقت کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اشارہ فرمایا کہ جاہلی شاعری عربی زبان کا دیوان ہے، اس سے قرآن کے بہت سے الفاظ کی تشریح میں مدد ملتی ہے۔

اجتہادِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بنیادی ذرائع

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد محض ذاتی رائے یا قیاس آرائی پر مبنی نہیں تھا، بلکہ وہ متعدد مضبوط علمی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا۔ ان میں اہم ترین امور درج ذیل ہیں:

اوّل: عربی زبان پر کامل عبور: قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا، اس لیے اس کے صحیح مفہوم تک رسائی کے لیے عربی زبان کے الفاظ، تراکیب، محاورات اور بلاغت سے گہری واقفیت ضروری تھی۔ صحابۂ کرام اس نعمت سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے، لہٰذا وہ زبان کے فطری ذوق سے بہت سی آیات کا صحیح مفہوم اخذ کر لیتے تھے۔

دوم: عرب معاشرے کے رسوم و رواج سے آگاہی: قرآنِ کریم کی بعض آیات ایسے رسوم و عادات کا ذکر کرتی ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت اہلِ عرب میں رائج تھیں۔ ان عادات سے ناواقف شخص ان آیات کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ یا سورۂ بقرہ میں فرمایا: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا ان آیات کا حقیقی مفہوم اسی وقت واضح ہوتا ہے جب انسان جاہلیت کے عربوں کے مذہبی رسوم اور معاشرتی روایات سے واقف ہو۔

سوم: یہود و نصاریٰ کے حالات سے واقفیت: قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر یہود و نصاریٰ کے عقائد، اعمال، تحریفات اور تاریخی واقعات کا ذکر آیا ہے۔ چونکہ صحابۂ کرام ان کے درمیان رہتے تھے، اس لیے وہ ان کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے، جس سے ان آیات کی مراد سمجھنے میں سہولت حاصل ہوتی تھی۔

چہارم: اسبابِ نزول کا علم: کسی آیت کے نزول کا پس منظر اس کے مفہوم کو سمجھنے میں نہایت اہم

کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے علماءِ امت نے اسبابِ نزول کو تفسیر کا بنیادی وسیلہ قرار دیا ہے، امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کسی آیت کی صحیح تفسیر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے نزول کا سبب معلوم نہ ہو۔

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ لکھتے ہیں سببِ نزول کا علم قرآن کے معانی سمجھنے کا ایک نہایت مضبوط ذریعہ ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سببِ نزول کا علم آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے، کیونکہ سبب کا علم مسبب کے فہم کا ذریعہ بنتا ہے۔

پنجم: غیر معمولی قوتِ فہم اور نورِ بصیرت: یہ وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات ایسی ہوتی ہیں جن کے باریک نکات ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتے، بلکہ اللہ تعالیٰ جسے فہمِ صحیح عطا فرماتا ہے، وہی ان کے گہرے معانی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس میدان میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ یہ امتیاز انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مبارک دعا کی برکت سے حاصل ہوا: **اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ** اے اللہ! انہیں دین کی گہری سمجھ عطا فرما اور قرآن کی تاویل کا علم سکھا۔

اسی حقیقت کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اشارہ فرمایا، جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی کوئی وحی موجود ہے؟ تو انہوں نے فرمایا": اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو پھاڑا اور جان کو پیدا فرمایا! ہمارے پاس قرآن کے سوا کوئی الگ وحی نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ جس بندے کو چاہے قرآن کے فہم کی خاص صلاحیت عطا فرماتا ہے، یہی وہ عطیۂ الٰہی تھا جس نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے دقیق معانی اور لطیف نکات تک پہنچایا۔

فہمِ قرآن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات

اگرچہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم علم و فضل میں ممتاز تھے، لیکن قرآن فہمی کے اعتبار سے ان کے درجات یکساں نہ تھے۔ بعض کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ وسعتِ علم، گہرائیِ فکر اور غیر معمولی قوتِ استنباط عطا فرمائی تھی، اسی وجہ سے بعض آیات کے مفہوم میں ان کے درمیان جزوی اختلاف بھی سامنے آیا،

اگرچہ یہ اختلاف نہایت محدود اور علمی نوعیت کا تھا۔

اس کی ایک نمایاں مثال حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جب ان پر شراب نوشی کا الزام ثابت ہوا تو انہوں نے سورۂ مائدہ کی آیت: لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس آیت کے مصداق ہیں، لہٰذا ان پر مواخذہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس موقع پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نہایت دقیق استنباط پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے حرمتِ شراب نازل ہونے سے پہلے شراب پی تھی، نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو حرمت کے بعد اس کا ارتکاب کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس تشریح کو درست قرار دیا اور اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

اسی طرح جب سورۂ مائدہ کی آیت، الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ نازل ہوئی تو اکثر صحابۂ کرام خوش ہوئے کہ دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بصیرت نے اس آیت میں ایک اور حقیقت دیکھی، وہ رونے لگے اور فرمایا "کمال کے بعد زوال کا مرحلہ آتا ہے"۔

انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ دین کی تکمیل درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حیات کے اختتام کی علامت ہے، اور حقیقت بھی یہی ثابت ہوئی، کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ عرصہ دنیا میں تشریف نہ رکھ سکے۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ نصر کی تفسیر میں وہ معنی بیان کیے جو اکابر صحابۂ کرام کی نگاہ سے بھی اوجھل رہے تھے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے سورۂ نصر کے متعلق دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے فتحِ مکہ کی بشارت کے ساتھ اشارۃً بیان فرمایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں بھی اس سورت کا یہی مفہوم سمجھتا ہوں۔ یہ مثالیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد محض رائے زنی نہیں تھا، بلکہ قرآن، سنت، عربی زبان، اسبابِ نزول اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فہم و بصیرت کی مضبوط

بنیادوں پر قائم تھا۔

چوتھا مصدرِ تفسیر: اہلِ کتاب سے مروی روایات

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں تفسیر کا چوتھا اور آخری مصدر اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ کی روایات تھیں، لیکن ان کی حیثیت پہلے تین مصادر کے مقابلے میں نہایت محدود اور ثانوی تھی۔

قرآنِ کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام، بنی اسرائیل اور سابقہ امتوں کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، لیکن قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ تاریخی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے صرف اتنا حصہ ذکر کرتا ہے جس میں ہدایت، نصیحت اور عبرت مضمر ہو۔ چنانچہ بہت سے جزوی واقعات، افراد کے نام، مقامات اور دیگر تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں۔

ان تفصیلات کو جاننے کا فطری شوق بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان اہلِ کتاب کی طرف لے جاتا تھا جو اسلام قبول کر چکے تھے، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، کعب الاحبار اور بعض دیگر اہلِ علم، البتہ یہ رجوع صرف انہی معاملات میں ہوتا تھا جن کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی واضح بیان موجود نہ ہوتا، کیونکہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت موجود ہوتی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کسی دوسرے ذریعے کی طرف ہرگز رجوع نہ کرتے۔

تاہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس باب میں انتہائی محتاط تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ تورات اور انجیل میں تحریف واقع ہو چکی ہے، اس لیے وہ اہلِ کتاب کی ہر بات قبول نہیں کرتے تھے بلکہ تین اصولوں کو سامنے رکھتے تھے ①: جو روایت قرآن و سنت کے مطابق ہوتی، اسے قبول کر لیا جاتا۔ ② جو قرآن و سنت کے خلاف ہوتی، اسے فوراً رد کر دیا جاتا۔ ③ اور جس کے صحیح یا غلط ہونے پر کوئی دلیل موجود نہ ہوتی، اس کے بارے میں توقف اختیار کیا جاتا؛ نہ اس کی تصدیق کی جاتی اور نہ تکذیب، یہی وہ منہج ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی: اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب، بلکہ کہو: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک تفسیر کے اصل اور قابلِ اعتماد مصادر

صرف قرآن، سنت اور صحیح اجتہاد تھے، جبکہ اسرائیلی روایات محض ایک محدود معاون ذریعہ تھیں، جنہیں ہمیشہ قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول یا رد کیا جاتا تھا۔ یہی متوازن اور محتاط منہج بعد کے مفسرین کے لیے بھی ایک روشن نمونہ بن گیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ممتاز مفسرینِ قرآن

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگرچہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآنِ کریم کے علوم سے بہرہ ور تھے، لیکن تفسیرِ قرآن کے میدان میں چند جلیل القدر شخصیات کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی، ان حضرات نے قرآنِ کریم کی تفسیر کبھی براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں، کبھی دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطے سے حاصل شدہ روایات کی بنیاد پر، کبھی اسبابِ نزول کے اپنے مشاہدات سے، اور کبھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فقاہت، بصیرت اور اجتہادی قوت کے ذریعے بیان فرمائی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں مشہور مفسرین

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے "الاتقان" میں جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تفسیر کے اعتبار سے نمایاں قرار دیا ہے، ان میں خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت اُبی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

ان کے علاوہ حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیرِ قرآن کے اقوال منقول ہیں، لیکن ان کی تعداد نسبتاً کم ہے، اس لیے انہیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو مذکورہ دس جلیل القدر صحابہ کو حاصل ہوئی۔

روایتِ تفسیر میں تفاوت کے اسباب

مشہور مفسرینِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی روایت کی کثرت و قلت میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے،

حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے تفسیر کے بہت کم آثار منقول ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگیاں خلافت، ریاستی انتظام، فتوحات اور امت کی قیادت جیسے عظیم فرائض میں مصروف رہیں۔ مزید برآں ان کے زمانے میں قرآن کے علوم سے واقف صحابہ کی بڑی تعداد موجود تھی، اس لیے ہر مسئلے میں ان کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کم پیش آتی تھی۔

اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات منقول ہیں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بیشتر دور میں انہیں تدریس اور تعلیم کا زیادہ موقع ملا، اور دوسری وجہ یہ کہ ان کی وفات نسبتاً بعد میں ہوئی، اس وقت اسلام کی سرحدیں وسیع ہو چکی تھیں، غیر عرب بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور عربی زبان کی فصاحت و سلاست میں تدریجاً کمی آ رہی تھی، ایسے حالات میں لوگوں کو قرآن کے معانی سمجھانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مفسرین کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہونے لگی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم سے بھی کثرت کے ساتھ تفسیری روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان حضرات کو عربی زبان پر گہری دسترس حاصل تھی، قرآن کے اسالیب اور محاورات پر کامل عبور تھا، اجتہاد کرنے میں انہیں کسی قسم کا تردد نہ تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے انہیں اسبابِ نزول اور قرآنی ماحول سے گہری واقفیت عطا کی تھی۔

اگرچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم عمر تھے، تاہم انہوں نے اس کمی کو اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طویل صحبت اختیار کر کے پورا کیا اور ان سے حدیث، اسبابِ نزول اور تفسیر کا عظیم ذخیرہ حاصل کیا۔

حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی تفسیر میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، لیکن ان سے مروی تفسیری آثار نسبتاً کم ہیں۔ اسی بنا پر بعد کے مفسرین نے بالخصوص چار شخصیات کو تفسیرِ صحابہ کا مرکزی ستون قرار دیا، یعنی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت

عبد اللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم۔

اگر روایت کی کثرت کو معیار بنایا جائے تو ان چاروں میں سب سے نمایاں مقام حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن مسعود، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کا نمبر آتا ہے۔

ترجمانُ القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

حضرت عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہما بنو ہاشم کے چشم و چراغ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ آپ کی والدہ حضرت لبابہ کبریٰ بنت حارث رضی اللہ عنہا تھیں، جو ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔

آپ کی ولادت مکہ مکرمہ میں شعبِ ابی طالب کے ایام میں ہوئی، ہجرت سے تقریباً تین سال قبل، پیدائش کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک لعابِ دہن سے ان کی تحنیک فرمائی، جو ان کے لیے عظیم سعادت کا باعث بنی۔

کم عمری ہی سے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت نصیب ہوئی، خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر آنے جانے کی وجہ سے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہنے، آپ کے ارشادات سننے اور آپ کے معمولات کا مشاہدہ کرنے کے متعدد مواقع ملتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر تقریباً تیرہ برس تھی، اگرچہ اس عمر میں طویل مدت تک صحبتِ نبوی سے استفادہ ممکن نہ ہو سکا، لیکن آپ نے اس کمی کو غیر معمولی علمی محنت سے پورا کیا۔ آپ اکابر صحابہ کے دروازوں پر حاضر ہوتے، ان سے احادیث سنتے، اسبابِ نزول معلوم کرتے اور قرآن کے دقائق سیکھتے، اسی مسلسل علمی جدوجہد نے انہیں امت کا سب سے بڑا مفسر بنا دیا۔

آپ کا وصال ۶۸ ہجری میں طائف میں ہوا، تدفین کے وقت حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: آج اس امت کا سب سے بڑا عالم اور ترجمانِ قرآن دنیا سے رخصت ہو گیا۔

علمی عظمت: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ان کے بے پایاں علم کی وجہ سے حَبْرُ الْأُمَّة اور بَحْرُ الْعِلْم کے القابات سے یاد کیا جاتا تھا، فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ، شعر، لغت اور انساب سمیت متعدد علوم میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، لیکن قرآن فہمی میں آپ کا مقام سب سے ممتاز تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، باوجود یکہ آپ عمر میں بہت چھوٹے تھے، انہیں مجلسِ شوریٰ میں اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بٹھاتے اور فرمایا کرتے: یہ نوجوان تم سب میں قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے والا ہے۔

کئی مشکل فقہی اور تفسیری مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، جس سے ان کی غیر معمولی علمی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، عبد اللہ بن عباس قرآن کے بہترین ترجمان ہیں۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابن عباس کی مجلس سے زیادہ باوقار، جامع اور علمی مجلس کبھی نہیں دیکھی۔ فقہاء بھی ان کے پاس بیٹھتے، محدثین بھی، مفسرین بھی اور شعراء بھی، اور ہر شخص اپنے علم کے مطابق سیراب ہو کر اٹھتا۔ اسی طرح حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ابن عباس سے زیادہ کسی شخص کو حدیث، فقہ، قضاء، تاریخ، شعر، تفسیر اور عرب کے ایام کا عالم نہیں دیکھا۔ یہی وجہ تھی کہ تابعین کی بڑی جماعت ہر علمی اختلاف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف رجوع کرتی تھی اور ان کے فیصلے کو ترجیح دیتی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی علمی عظمت کے اسباب: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی غیر معمولی علمی رفعت کئی اسباب کا نتیجہ تھی، سب سے پہلا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مبارک دعا تھی: اے اللہ! انہیں کتاب و حکمت کا علم عطا فرما، دین کی سمجھ عطا فرما اور انہیں قرآن کی تاویل سکھا، یہ دعا ان کی پوری علمی زندگی میں نمایاں طور پر جلوہ گر رہی، دوسرا سبب ان کی پرورش کا نبوی ماحول تھا، اگرچہ ان کی عمر کم تھی، لیکن انہیں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے علمی ماحول سے استفادہ حاصل ہوا۔

تیسرا سبب ان کی بے مثال علمی محنت تھی، وہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھروں کے باہر گھنٹوں انتظار

کرتے تاکہ بیدار ہونے پر ان سے ایک حدیث یا ایک علمی مسئلہ دریافت کر سکیں، خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہتا تو صحابی کو جگا دیتا، لیکن ادب کا تقاضا یہ تھا کہ میں دروازے پر بیٹھا رہتا، حتیٰ کہ وہ خود تشریف لاتے، چوتھا سبب عربی زبان پر ان کی حیرت انگیز گرفت تھی، وہ قرآن کے غریب الفاظ کی تشریح کے لیے جاہلی عرب کے اشعار سے استدلال کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک شعر عرب قرآن کی لغت سمجھنے کا معتبر ذریعہ تھا، پانچواں سبب ان کی اجتہادی جرأت تھی، وہ دلیل کی بنیاد پر اپنی رائے بیان کرتے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے متاثر نہ ہوتے۔ بعد ازاں بہت سے اکابر صحابہ بھی ان کی رائے کی صحت کا اعتراف کرتے تھے۔

ان تمام اسباب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت، وسیع حافظہ، بلند فکری صلاحیت اور گہری بصیرت عطا فرمائی، جس نے انہیں "ترجمان القرآن" کا دائمی لقب عطا کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منسوب تفسیر کی حقیقت اور اس کی علمی حیثیت: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو قرآنِ کریم کے سب سے ممتاز مفسر صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان کی طرف تفسیر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ منسوب کیا گیا ہے۔ مصر سے متعدد مرتبہ تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی، جسے لغت کی مشہور کتاب القاموس المحیط کے مصنف ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی شافعی رحمہ اللہ نے مرتب کیا ہے۔

اس کتاب کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام روایات تقریباً ایک ہی سند پر گردش کرتی ہیں، ابتدا میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں یہ سند ذکر کی گئی ہے: عبداللہ الثقہ بن المامون الہروی، ان کے والد ابو عبداللہ محمود بن محمد الرازی، عمار بن عبدالمجید الہروی، علی بن اسحاق السمرقندی، محمد بن مروان، کلبی، ابو صالح، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی ابتداء میں بھی سند کا محور محمد بن مروان السدی الصغیر، محمد بن السائب الکلبی، ابو صالح اور پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی ہیں، جبکہ ہر نئی سورت کے آغاز میں بھی صرف اتنا لکھ دیا جاتا ہے: وَبِإِسْنَادِهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

یہ امر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس پوری تفسیر کی بنیاد ایک ہی سلسلۂ روایت پر قائم ہے، اور محدثین کے نزدیک محمد بن مروان السدی الصغیر اور محمد بن السائب الکلبی کی روایات قابلِ اعتماد نہیں سمجھی جاتیں۔ اسی بنا پر اس تفسیر کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتی، اسی تناظر میں امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مشہور قول بھی نقل کیا جاتا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر میں تقریباً سو کے قریب احادیث ہی صحیح طور پر ثابت ہیں۔

اگر یہ قول صحیح سند سے ثابت ہو تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کے ادوار میں بعض لوگوں نے حضرت ابن عباس کی طرف بے شمار تفسیری اقوال منسوب کر دیے، حالانکہ وہ فی الحقیقت ان سے ثابت نہ تھے، اس کی ایک نمایاں دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی طرف منسوب بعض تفسیری روایات میں باہمی تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے، جو خود ان کے غیر مستند ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

تاہم اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کتاب میں مذکور ہر بات لازماً غلط نہیں ہے۔ بہت سا علمی مواد اپنی جگہ درست اور مفید ہو سکتا ہے، لیکن اس کی اصل کمزوری یہ ہے کہ اسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کرنا قابل اعتماد نہیں، لہذا اس کتاب سے استفادہ کرتے وقت اس نسبت کو قطعی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف موضوع روایات کی کثرت کے اسباب: یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی طرف اتنی زیادہ غیر ثابت روایات کیوں منسوب کی گئیں؟ اس کے متعدد اسباب بیان کیے گئے ہیں۔

سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ تھے، کسی قول کو اگر ایسے عظیم صحابی کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ لوگوں کے نزدیک فوراً قبولیت اور اعتماد حاصل کر لیتا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی نسل سے بعد میں عباسی خلفاء پیدا ہوئے، بعض خوشامدی اور دنیا طلب افراد حکمرانوں کی قربت حاصل کرنے کے لیے ان کے جدِ امجد کی طرف مختلف روایات منسوب کر دیتے تھے، تاکہ ان کی خوشنودی حاصل ہو سکے، یہی رجحان بعد

میں وضعِ حدیث اور وضعِ تفسیر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب بن گیا۔

بعد کے مباحث میں مفسرین نے موضوع روایات کے اسباب اور ان کی علمی قدر و قیمت پر مفصل گفتگو کی ہے، جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے کہ ہر ضعیف یا موضوع نسبت کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں موجود ہر علمی بات بھی باطل ہو، بلکہ اصل احتیاط اس کی سند اور نسبت کے بارے میں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت عبد اللہ بن مسعود بن غافل ہذلی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی، فقیہِ امت اور اکابر مفسرینِ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی کنیت ابو عبد الرحمن تھی، جبکہ والدہ کا نام ام عبد بنت عبدود تھا، اسی مناسبت سے آپ کو ابنِ اُمِّ عبد بھی کہا جاتا تھا، آپ ابتدائی دور ہی میں اسلام قبول کرنے والوں میں شامل تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے: میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب روئے زمین پر صرف چھ مسلمان تھے اور میں ان میں چھٹا تھا۔

مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جس شخصیت نے علانیہ قرآنِ کریم کی تلاوت کر کے قریش کو سنائی، وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود تھے، اس جرأت ایمانی کی وجہ سے آپ کو سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، مگر حق کی دعوت سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنی خصوصی خدمت کے لیے منتخب فرمایا۔ آپ سفر و حضر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہتے، وضو کا پانی مہیا کرتے، مسواک، جوتے اور دیگر ضروری اشیاء کی خدمت انجام دیتے، حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ یمن سے مدینہ آئے تو کثرتِ آمد و رفت کی وجہ سے انہیں گمان ہوا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ اہلِ بیتِ نبوی ہی میں سے ہیں۔

آپ نے حبشہ اور مدینہ دونوں ہجرتیں کیں، دونوں قبلوں کی طرف نماز ادا کی، غزوۂ بدر، اُحد، خندق، بیعتِ رضوان اور دیگر تمام اہم معرکوں میں شریک رہے، اور غزوۂ بدر میں ابو جہل کے خاتمے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر آپ کے علم و فضل کی تحسین فرمائی، ایک موقع پر ارشاد فرمایا: اگر میں اہلِ ایمان سے مشورہ کیے بغیر کسی کو امیر مقرر کرتا تو ابنِ اُمِّ عبد کو مقرر کرتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کوفہ کے بیت المال کے نگران رہے، عمرِ مبارک کے آخری حصے میں مدینہ واپس تشریف لائے اور ۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ وصیت کے مطابق رات کے وقت جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ساٹھ برس سے کچھ زائد تھی۔

علمی مقام و مرتبہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآنِ کریم کے نہایت گہرے عالم اور حفاظ صحابہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی قراءت بے حد محبوب تھی، ایک مرتبہ آپ کو سورۃ نساء پڑھنے کا حکم دیا، آپ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں آپ کو قرآن سناؤں، حالانکہ قرآن تو آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا": میں چاہتا ہوں کہ اسے کسی دوسرے کی زبان سے سنوں۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تلاوت شروع کی، یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا (النساء: ۴۱) یہ آیت سن کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص قرآن کو اسی تازگی کے ساتھ پڑھنا چاہے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، وہ ابنِ اُمِّ عبد کی قراءت کے مطابق پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنے اس علمی مقام کا بھی احساس تھا، جب حضرت عثمان کے زمانے میں مصاحف کی کتابت کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپی گئی تو انہوں نے فرمایا کیا مجھے مصاحف کی کتابت سے الگ رکھا جا رہا ہے، حالانکہ میں اس وقت مسلمان ہو چکا تھا جب زید ابھی ایک کافر کے صلب میں تھے؟ یہ اعتراض دراصل اپنی قدامتِ اسلام اور قرآن سے گہری وابستگی کے اظہار کے طور پر تھا، نہ کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تنقیص کے لیے۔

حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم بالآخر چھ بزرگوں پر مرکوز ہو گئے تھے، حضرت عمر، حضرت علی ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوالدرداء اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ، پھر ان چھ کے علوم کا زیادہ حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ، سیرت اور انداز کے اعتبار سے ابنِ اُمِّ عبد سے زیادہ مشابہ کسی شخص کو نہیں جانتے، اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب لوگوں میں سے ہیں۔

جب حضرت عمر نے انہیں کوفہ روانہ کیا تو اہل کوفہ کے نام اپنے خط میں لکھا "میں نے عمار بن یاسر کو تمہارا امیر اور عبداللہ بن مسعود کو تمہارا معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں اہلِ بدر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتخب اصحاب میں سے ہیں۔ ان کی بات سنو، ان کی اطاعت کرو، اور میں نے عبداللہ کو تم پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے اوپر بھی مقدم رکھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں رہ کر حدیث، فقہ اور تفسیر کی ایسی علمی بنیاد قائم کی جس نے بعد کے فقہی و تفسیری مکاتب فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے اخلاق، علم، ورع اور حسن تعلیم کی کھلے الفاظ میں تحسین فرمائی۔

یہ تمام شواہد اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صرف ایک جلیل القدر صحابی ہیں نہیں بلکہ قرآن کریم کے اسرار و معارف کے ایسے امام تھے جن کی علمی عظمت پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متفق تھے اور تفسیر قرآن میں ان کا مقام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد سب سے نمایاں شمار کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول تفسیر کی علمی حیثیت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیرِ قرآن، تفسیر بالماثور کا سب سے اہم سرمایہ ہے، محدثین اور اصولیین نے اس کی حجیت اور شرعی حیثیت پر تفصیلی بحث کی ہے، کیونکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نزول وحی

کے عینی شاہد، اسباب نزول کے واقف، عربی زبان کے فطری ماہر اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے براہ راست فیض یاب تھے۔

کیا صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے؟: امام حاکم رحمہ اللہ نے المستدرک میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ جو صحابی نزولِ وحی کا مشاہدہ کرنے والا ہو، اس کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے، گویا اس نے وہ بات براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہو، ان کے نزدیک شیخین (امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ) کا بھی یہی منہج تھا۔

لیکن بعد کے محدثین، خصوصاً امام ابن صلاح رحمہ اللہ، امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر اہلِ علم نے اس اصول کو مطلق نہیں رکھا بلکہ اس میں ایک اہم قید بیان کی۔ ان کے نزدیک صحابی کی تفسیر صرف اسی وقت مرفوع کے حکم میں ہوگی جب وہ کسی آیت کے سببِ نزول سے متعلق ہو، یا ایسے امور سے متعلق ہو جن میں رائے اور اجتہاد کی کوئی گنجائش نہ ہو، مثلاً غیبی امور یا وہ حقائق جو صرف رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت، جس میں انہوں نے یہود کے ایک باطل عقیدے کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (البقرہ: ۲۲۳) یہ روایت سببِ نزول سے متعلق ہے، اس لیے اسے مرفوع حدیث کا درجہ حاصل ہے، اس کے برعکس اگر کوئی صحابی کسی آیت کی تفسیر اپنے فہم، لغوی تحقیق یا اجتہاد کی بنیاد پر بیان کرے اور اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہ کرے، تو وہ موقوف روایت شمار ہوگی۔

امام حاکم رحمہ اللہ کی وضاحت: اگرچہ امام حاکم رحمہ اللہ نے المستدرک میں مطلق انداز اختیار کیا، لیکن اپنی دوسری معروف کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں انہوں نے خود اس کی وضاحت کر دی، وہاں انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک تفسیری روایت کو موقوف قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ہر صحابی کی تفسیر مرفوع نہیں ہوتی، ایک تفسیری روایت کو موقوف قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ہر صحابی کی تفسیر مرفوع نہیں ہوتی، بلکہ صرف وہی تفسیر مرفوع کے حکم میں ہے جو سبب نزول یا ایسے امور سے متعلق

ہو جن تک رائے کے ذریعے رسائی ممکن نہ ہو۔

اسی بنا پر بعد کے علماء نے امام حاکم رحمہ اللہ کے اسی مقید قول کو اختیار کیا اور مطلق عبارت کو اسی پر محمول کیا، البتہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس مقام پر یہ اشکال بھی ذکر کیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت آخرت کے احوال سے متعلق ہے اور چونکہ آخرت کے معاملات میں ذاتی رائے کی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے اسے بھی مرفوع کے حکم میں شمار کیا جانا چاہیے۔

اس تفصیلی بحث سے چند بنیادی اصول سامنے آتے ہیں: اول : صحابی کی وہ تفسیر جو سببِ نزول یا ایسے امور سے متعلق ہو جن میں رائے و اجتہاد کی کوئی گنجائش نہ ہو، مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ دوم : ایسی روایت کو قبول کرنا واجب ہے، اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے قول کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ سوم : وہ تفسیری اقوال جو صحابہ کے اجتہاد پر مبنی ہوں، ان کے بارے میں علماء کے دو رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا موقف یہ ہے کہ چونکہ یہ صحابی کا اجتہاد ہے، اس لیے اس میں صحت و خطا دونوں کا احتمال موجود ہے، لہٰذا اسے قطعی حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جبکہ دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تفسیری اجتہادات کو قبول کرنا چاہیے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یافتہ تھے، نزولِ قرآن کے حالات و واقعات کے عینی شاہد تھے، عربی زبان ان کی مادری زبان تھی، ان کا فہم، تقویٰ، اخلاص اور دینی بصیرت بعد والوں سے کہیں بڑھ کر تھی، خصوصاً اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ علمِ قرآن میں غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔

ائمۂ امت کی آراء: امام زرکشی رحمہ اللہ البرہان میں لکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تفسیر دو قسموں پر مشتمل ہے: ایک وہ جو نقل سے ثابت ہے اور دوسری وہ جس میں اجتہاد کا دخل ہے، اگر تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو تو اس کی سند کی تحقیق کی جائے گی، اور اگر صحابہ سے منقول ہو تو دیکھا جائے گا کہ آیا وہ لغت کی بنیاد پر ہے یا اسبابِ نزول اور مشاہدات پر، دونوں صورتوں میں ان کا قول قابلِ اعتماد ہے،

کیونکہ وہ اہلِ زبان بھی تھے اور نزولِ قرآن کے حالات کے عینی شاہد بھی۔

اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ جب قرآن اور سنت میں کسی آیت کی تفسیر نہ ملے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ وہ قرآن کے مفاہیم، اسباب نزول اور حالاتِ وحی سے سب سے زیادہ واقف تھے اور ان کے علم، عمل اور فہم کا کوئی بدل نہیں، حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی موقف زیادہ مضبوط، معتدل اور اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا فہمِ قرآن براہِ راست سرچشمۂ نبوت سے مستفاد تھا۔

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں تفسیر کی نمایاں خصوصیات

عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تفسیر چند منفرد امتیازات کی حامل تھی، جو اسے بعد کے تمام ادوار سے ممتاز کرتے ہیں۔ ① پورے قرآن کی تفسیر نہیں کی گئی: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی ہر آیت کی مستقل تفسیر مرتب نہیں کی، بلکہ صرف ان مقامات کی وضاحت فرمائی جہاں کسی لفظ یا مفہوم کے سمجھنے میں ضرورت پیش آتی تھی، بعد کے زمانوں میں عربی زبان کی فصاحت کم ہوتی گئی اور عہد نبوت سے فاصلہ بڑھتا گیا تو تفسیر کی ضرورت بھی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ پورے قرآن کی تفاسیر مدون ہوئیں۔

② اختلاف نہایت کم تھا: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تفسیر اختلافات بہت محدود تھے، کیونکہ ان کے مصادرِ علم ایک تھے، زبان ایک تھی، ماحول ایک تھا اور سب نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کی تھی۔

③ اجمالی تشریح پر اکتفا: اکثر مواقع پر وہ آیات کی اجمالی وضاحت کو کافی سمجھتے تھے اور غیر ضروری تفصیلات میں نہیں جاتے تھے، مثلاً سورۂ عبس میں وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا کی تفسیر میں وہ صرف یہ بیان کر دیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہے، اس سے زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

④ مختصر لغوی تشریح: اگر کسی لفظ کی وضاحت مطلوب ہوتی تو نہایت مختصر الفاظ میں اس کا مفہوم بیان کر دیتے، مثلاً غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ کی تفسیر یہ کر دیتے کہ اس سے مراد گناہ کی طرف مائل نہ ہونا ہے، اگر مزید وضاحت کرتے تو وہ بھی عموماً اسبابِ نزول کی روشنی میں ہوتی۔

⑤ فقہی استنباط کی قلت: اس دور میں آیات سے فقہی مسائل کے دقیق استنباط یا مختلف فقہی مکاتب کی تائید و ترجیح کا رجحان نہیں تھا، کیونکہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم عقیدہ و منہج میں متحد تھے اور بعد کے ادوار کی طرح فقہی مکاتب ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔

⑥ تفسیر کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں تفسیر مستقل کتابی صورت میں مدون نہیں ہوئی، اگرچہ بعض صحابہ نے اپنے ذاتی مصاحف میں چند تفسیری توضیحات لکھی لی تھیں، لیکن وہ صرف ذاتی یادداشتیں تھیں، قرآن مجید کا حصہ نہیں، بعد کے بعض لوگوں نے غلط فہمی سے ان توضیحات کو قرآنی قراءات یا متن کا جز سمجھ لیا۔

⑦ تفسیر، حدیث کا ایک حصہ تھی: اس دور میں تفسیر کی کوئی مستقل علمی صنف وجود میں نہیں آئی تھی، بلکہ وہ علمِ حدیث ہی کی ایک شاخ تھی، احادیث کی طرح مختلف آیات کی تفسیری روایات بھی منتشر انداز میں روایت کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ایک ہی مجلس یا کتاب میں نماز، جہاد، میراث اور کسی آیت کی تفسیر سے متعلق روایات یکے بعد دیگرے بیان ہو جاتی تھیں۔

اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب مستقل تفسیر کو اس دور کی تصنیف قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس کی نسبت خود تحقیق کی کسوٹی پر ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، "تنویر المقیاس" کی بنیاد محمد بن مروان السدی الصغیر، محمد بن السائب الکلبی اور ابو صالح کی اس سند پر ہے جسے محدثین نے سخت کمزور بلکہ بعض نے "سلسلۃ الکذب" (جھوٹ کا سلسلہ) تک قرار دیا ہے، لہٰذا اس کتاب کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مستند تفسیر سمجھنا درست نہیں، اگرچہ اس میں بعض صحیح علمی فوائد موجود ہو سکتے ہیں۔

تفسیر کا دوسرا دور: عہدِ تابعین

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دور کے اختتام کے ساتھ ہی تفسیرِ قرآن کے ارتقائی سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے، جسے عہدِ تابعین کہا جاتا ہے، یہ وہ خوش نصیب جماعت تھی جس نے براہِ راست صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن، سنت اور علومِ نبوت کا فیض حاصل کیا اور انہی کی علمی امانت کو

اگلی نسلوں تک منتقل کیا، جس طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں چند جلیل القدر حضرات تفسیرِ قرآن کے حوالے سے مرجع و مقتدا بن گئے تھے، اسی طرح تابعین میں بھی ایسے بلند پایہ علماء پیدا ہوئے جنہوں نے قرآنِ کریم کے معانی و مطالب کو نہایت بصیرت کے ساتھ واضح کیا اور اپنے زمانے کے علمی حلقوں میں تفسیر کی مضبوط بنیادیں استوار کیں۔

عہدِ تابعین میں تفسیر کے مصادر

تابعین نے قرآنِ مجید کی تفسیر کرتے ہوئے متعدد بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا، جن میں درج ذیل نمایاں ہیں ①: قرآنِ کریم کی خود اپنی تفسیر، یعنی ایک آیت کو دوسری آیت کی روشنی میں سمجھنا۔ ② احادیثِ نبویہ، جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے ان تک پہنچی تھیں۔ ③ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیری آراء، کیونکہ وہ نزولِ قرآن کے عینی شاہد تھے۔ ④ اہلِ کتاب کی روایات، جن سے تاریخی اور قصصی نوعیت کی معلومات اخذ کی جاتی تھیں، تاہم انہیں شرعی اصولوں کے تابع رکھا جاتا تھا۔ ⑤ اجتہاد، تدبر اور لغوی تحقیق، جن کے ذریعے وہ ان مقامات کی تشریح کرتے تھے جہاں کوئی صریح روایت موجود نہ ہوتی۔

تفاسیر کی کتابوں میں تابعین کے بے شمار ایسے اقوال محفوظ ہیں جو ان کے اپنے اجتہاد اور عمیق تدبر کا نتیجہ تھے۔ ان اقوال کی بنیاد نہ کسی مرفوع حدیث پر تھی اور نہ کسی صحابی کے قول پر، بلکہ قرآن کے الفاظ، عربی زبان، اسبابِ نزول اور شرعی اصولوں پر غور و فکر کے بعد انہوں نے اپنی رائے قائم کی۔

اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنِ کریم کی ہر آیت کی مستقل تفسیر بیان نہیں فرمائی، بلکہ صرف ان آیات کی وضاحت کی جنہیں اس زمانے کے لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل تھا، وقت گزرنے کے ساتھ جب عہدِ نبوت اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے فاصلہ بڑھتا گیا تو فہمِ قرآن میں دشواریاں بھی بڑھتی گئیں، چنانچہ تابعین نے انہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تفسیری ذخیرے میں اضافہ کیا، بعد کے ادوار میں تبع تابعین اور پھر بعد کے مفسرین نے بھی اسی سلسلے کو آگے بڑھایا اور عربی زبان، اسالیبِ کلام، اسبابِ نزول، تاریخی واقعات اور دیگر علمی ذرائع

کی مدد سے قرآن کی مزید تشریح وتوضیح کی۔

عہدِ تابعین میں قائم ہونے والے مکاتبِ تفسیر

اسلامی فتوحات کے نتیجے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مختلف علاقوں میں پھیل گئے، اگرچہ مدینہ منورہ علم وہدایت کا مرکزی سرچشمہ تھا، لیکن بہت سے صحابہ مختلف اسلامی شہروں میں جاکر آباد ہوئے، ان میں بعض گورنر تھے، بعض قاضی، بعض معلم اور بعض مبلغ، وہ اپنے ساتھ قرآن وسنت کا عظیم علمی سرمایہ بھی لے گئے، انہی کے گرد تابعین کی علمی مجالس قائم ہوئیں اور مختلف شہروں میں مستقل مدارسِ تفسیر وجود میں آئے۔

ان مدارس میں تین مراکز کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق (خصوصاً کوفہ) یہی تین مکاتبِ تفسیر بعد کی پوری تفسیری روایت کی بنیاد بنے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تفسیر کے سب سے بڑے علماء اہلِ مکہ تھے، کیونکہ وہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے، جیسے مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، طاؤس، ابو الشعثاء اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ، اسی طرح اہل کوفہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ تھے، جبکہ مدینہ میں زید بن اسلم رحمہ اللہ جیسے علماء تفسیر کے امام تھے، جن سے امام مالک رحمہ اللہ اور عبد الرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے علم حاصل کیا۔

پہلی تفسیر گاہ: مکہ مکرمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا علمی فیض، مکہ مکرمہ کا مکتبِ تفسیر درحقیقت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے گرد قائم ہوا، آپ مسجد حرام میں بیٹھ کر تابعین کو قرآن کریم کی تفسیر پڑھاتے، مشکل آیات کی وضاحت کرتے اور نزولِ قرآن کے پس منظر سے آگاہ فرماتے، آپ کے شاگرد نہایت اہتمام سے ان تفسیری نکات کو محفوظ کرتے اور آگے منتقل کرتے رہے۔

مکہ کے ممتاز مفسرین تابعین: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نمایاں شاگرد یہ تھے، سعید بن جبیر رحمہ اللہ مجاہد بن جبر رحمہ اللہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس رحمہ اللہ طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ عطاء بن ابی

رباح رحمہ اللہ یہ پانچوں حضرات تفسیرِ قرآن کے درخشاں ستارے تھے، اگرچہ روایت، فقاہت اور علمی مقام میں ان کے درمیان درجات کا فرق موجود تھا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ: سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا شمار تابعین کے اکابر علماء میں ہوتا ہے، آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا، تفسیر، حدیث، فقہ اور قراءات میں آپ کی مہارت مسلم تھی۔

آپ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول قراءات کے مطابق نماز میں قرآن پڑھایا کرتے تھے، جس سے ان کی وسعتِ علمی اور قرآنی علوم پر گہری دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ متعدد علماء نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ قراءات کا یہ تنوع انہیں معانیِ قرآن کو زیادہ جامع انداز میں سمجھنے میں مدد دیتا تھا۔

باوجود اس کے، سعید بن جبیر رحمہ اللہ نہایت محتاط تھے اور ذاتی رائے سے تفسیر بیان کرنے سے گریز کرتے تھے، روایت ہے کہ ایک شخص نے ان سے قرآن کریم کی تفسیر لکھوانے کی درخواست کی تو انہوں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے جسم کا ایک حصہ گر جانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں محض اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر لکھوں۔

خصیف رحمہ اللہ کا قول ہے": تابعین میں طلاق کے مسائل کے سب سے بڑے عالم سعید بن مسیب رحمہ اللہ، حج کے مسائل میں عطاء رحمہ اللہ، حلال و حرام میں طاؤس رحمہ اللہ، تفسیر میں مجاہد رحمہ اللہ، جبکہ ان تمام علوم کا جامع سعید بن جبیر رحمہ اللہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ اہل کوفہ سے فرمایا کرتے "کیا تمہارے درمیان ابنِ اُمِّ دہماء (سعید بن جبیر) موجود نہیں؟" قتادہ رحمہ اللہ انہیں تابعین کا سب سے بڑا مفسر قرار دیتے تھے، جب کہ محدثین نے متفقہ طور پر انہیں ثقہ، حجت اور امام تسلیم کیا ہے۔

سن ۹۵ ہجری میں ظالم گورنر حجاج بن یوسف نے انہیں شہید کر دیا، شہادت سے قبل حجاج کے ساتھ ان کی تاریخی گفتگو ان کے ایمان، استقامت اور توکل علی اللہ کا روشن نمونہ ہے۔

مجاہد بن جبر رحمہ اللہ: مجاہد بن جبر رحمہ اللہ مکہ کے ممتاز مفسر، قاری اور محدث تھے، آپ حضرت عبداللہ

بن عباس رضی اللہ عنہما کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، انہوں نے متعدد مرتبہ پورا قرآن اپنے استاذ کے سامنے پڑھا اور ہر آیت پر رک کر اس کے سبب نزول معنیٰ اور مفہوم کے بارے میں سوال کیا۔

ان کی تفسیر پر محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ اور محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ نے اعتماد کیا، خصوصاً امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں جگہ جگہ ان کے تفسیری اقوال نقل کیے ہیں، جو ان کے علمی مقام کی سب سے بڑی سند ہے۔

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے": جب تمہارے پاس مجاہد کی تفسیر پہنچ جائے تو وہ تمہارے لیے کافی ہے۔" اگرچہ بعض علماء نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ مجاہد رحمہ اللہ کبھی کبھار اہلِ کتاب سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے، لیکن کسی معتبر محدث نے ان کی دیانت یا عدالت پر اعتراض نہیں کیا، غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے صرف انہی روایات سے استفادہ کیا جن کی حدود شریعت نے اجازت دی تھی۔

اجتہادی تفسیر میں مجاہد رحمہ اللہ کا مقام: مجاہد رحمہ اللہ نے بعض آیات کی تشریح میں اجتہادی اسلوب اختیار کیا، مثال کے طور پر سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بندر بنائے جانے کو انہوں نے حقیقی جسمانی تبدیلی کے بجائے اخلاقی و روحانی مسخ سے تعبیر کیا، جبکہ محمد بن جریر الطبری نے اس رائے سے اختلاف کیا اور ظاہری معنی کو راجح قرار دیا۔

اسی طرح رؤیتِ باری تعالیٰ سے متعلق بعض آیات کی تفسیر میں بھی ان کی رائے بعد میں معتزلہ کے لیے استدلال کا ذریعہ بنی، اگرچہ اس سے ان کے علمی مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ مجموعی طور پر امت نے انہیں تفسیر کا امام اور قابلِ اعتماد مفسر تسلیم کیا ہے۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ ابو عبد اللہ عکرمہ البربری المدنی جلیل القدر تابعی، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام اور ان کے ممتاز شاگرد تھے، اصل وطن شمالی افریقہ کا علاقہ بربر (مغرب) تھا، لیکن مدینہ منورہ

میں رہائش اختیار کی، انہوں نے اپنے استاذ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا، خصوصاً تفسیرِ قرآن میں ان کا شمار تابعین کے عظیم ترین ائمہ میں ہوتا ہے۔

ثقاہت کے بارے میں اختلاف: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی شخصیت کے بارے میں محدثین رحمہم اللہ کے ہاں دو آراء ملتی ہیں، بعض علماء نے ان پر چند اعتراضات کیے، جب کہ جمہور ائمہ حدیث و رجال نے انہیں ثقہ، عادل اور قابلِ اعتماد راوی قرار دیا، علمِ رجال کے اصولوں کے مطابق جمہور محدثین رحمہم اللہ کی توثیق کو زیادہ وزن حاصل ہے، اسی لیے حدیث و تفسیر میں ان کی روایات کو قبول کیا گیا ہے۔

اعتراضات اور ان کا جائزہ: جن علماء نے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ پر نقد کیا، ان کے اہم اعتراضات یہ تھے کہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بہت زیادہ روایت کرتے تھے، بعض لوگوں نے ان پر کذب کی تہمت لگائی اور بعض نے انہیں خوارج کی طرف منسوب کیا، لیکن محدثینِ محققین نے ان اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا اور واضح کیا کہ یہ الزامات مضبوط دلائل سے ثابت نہیں ہوتے۔

سب سے پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی طویل صحبت اور مسلسل ملازمت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان سے کثرتِ روایت بالکل فطری امر تھا، صرف زیادہ روایت کرنا کسی راوی کے ضعف کی دلیل نہیں بن سکتا، جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی کثرتِ روایت نے ان کی عدالت کو کبھی متاثر نہیں کیا۔

خود حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بھی ان الزامات سے آگاہ تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ان پر پسِ پشت جھوٹ کا الزام لگاتے ہیں، مگر سامنے آکر گفتگو نہیں کرتے، حضرت ابوامامہ بن سہل رحمہ اللہ نے گواہی دی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے "عکرمہ میری طرف سے جو روایت بیان کرے، اسے سچا سمجھو، کیونکہ اس نے مجھ پر کبھی جھوٹ نہیں بولا"۔

بعض دیگر روایات، جن میں ان پر سخت اعتراضات منقول ہیں، محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک یا تو سنداً ضعیف ہیں یا ناقابلِ اعتماد راویوں سے مروی ہیں، اس لیے ان سے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی

ثقاہت مجروح نہیں ہوتی، رہا یہ الزام کہ وہ خوارج کے عقائد رکھتے تھے، تو حافظ ابن حجر عسقلانی اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ یہ بات ثابت نہیں، حتیٰ کہ اگر کسی راوی سے کوئی اجتہادی خطا ثابت بھی ہو، تب بھی جب تک وہ اس کی دعوت نہ دیتا ہو اس کی روایت قابل قبول رہتی ہے، جب کہ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کے بارے میں ایسی بات بھی ثابت نہیں۔

ائمۂ حدیث رحمہم اللہ کی توثیق: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکابر محدثین نے ان کی ثقاہت پر اعتماد کیا، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کی حدیث سے استدلال کو درست قرار دیا، امام یحیٰ بن معین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص حضرت عکرمہ رحمہ اللہ پر بے جا طعن کرے، اس کے بارے میں احتیاط کرنی چاہیے، امام عجلی رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ تابعی قرار دیتے ہوئے خوارج کی نسبت کو باطل کہا، امام بخاری فرماتے تھے "ہمارے اصحاب میں کوئی ایسا نہیں جس نے عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال نہ کیا ہو"۔

امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ابوداؤد اور دیگر ائمہ حدیث رحمہم اللہ نے اپنی کتب میں ان کی روایات نقل کی ہیں، جو ان کے اعتماد کی واضح دلیل ہے، مروزی نے یہاں تک لکھا کہ اہل حدیث کی اکثریت حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی روایات کے حجت ہونے پر متفق تھی اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے انہیں "امام الدنیا" کے الفاظ سے یاد کیا۔

علمی مقام اور تفسیر میں عظمت: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ اپنے زمانے کے ممتاز مفسر، فقیہ اور قرآن شناس تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طویل شاگردی نے انہیں تفسیر قرآن کا بے مثال ذوق عطا کیا، امام ابن حبان رحمہ اللہ نے انہیں اپنے زمانے کے بڑے علماءِ قرآن وفقہ میں شمار کیا، عمرو بن دینار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر بن زید رحمہ اللہ مسائل تفسیر کے لیے انہیں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کے پاس بھیجتے اور فرماتے "یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد عکرمہ رحمہ اللہ ہیں، یہ علم کا سمندر ہیں، ان سے پوچھو۔" امام شعبی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے، "آج کتاب اللہ کا عکرمہ رحمہ اللہ سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا"۔

حبیب بن ابی ثابت رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں مجاہد، سعید بن جبیر، طاؤس، عطاء اور حضرت عکرمہ رحمہم اللہ جمع تھے، جہاں مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ بھی تفسیر کے مسائل حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے دریافت کرتے رہے اور وہ ہر آیت کی نہایت بصیرت کے ساتھ تشریح کرتے رہے۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے تو یہاں تک فرمایا، "جس نے عکرمہ سے علم حاصل نہیں کیا، وہ گویا علم کے دو تہائی حصے سے محروم رہ گیا"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اعتماد: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا غیر معمولی اعتماد بھی ان کے علمی مقام کا روشن ثبوت ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ سورۂ اعراف کی ایک آیت کے مفہوم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اشکال پیش آیا تو حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کی، جس سے حضرت ابن عباس مطمئن ہو گئے اور خوش ہو کر انہیں ایک قیمتی جوڑا عطا فرمایا، یہ واقعہ ان کے فہم قرآن اور اپنے استاذ کے نزدیک ان کی علمی منزلت کو نمایاں کرتا ہے۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا وصال ۱۰۴ ہجری میں ہوا، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور امت مسلمہ کو ان کے علمی ذخیرے سے ہمیشہ مستفید فرماتا رہے۔ آمین

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی، مفسرِ قرآن، محدث اور فقیہ تھے، آپ مکہ مکرمہ کے رہنے والے اور قریش کے موالی میں سے تھے، آپ کی ولادت ۲۷ ہجری میں ہوئی، جبکہ راجح قول کے مطابق ۱۱۴ ہجری میں آپ کا وصال ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی علمی عظمت عطا فرمائی، اگرچہ جسمانی اعتبار سے آپ کو متعدد عوارض لاحق تھے، آپ کا رنگ سیاہ تھا، ایک آنکھ سے محروم، ناک مبارک چپٹی، ایک ہاتھ سے معذور اور لنگڑے تھے، پھر عمر کے آخری حصے میں بینائی بھی جاتی رہی، لیکن یہ جسمانی کمزوریاں آپ کے بلند علمی مقام، تقویٰ اور عزیمتِ عمل میں کبھی حائل نہ ہو سکیں، بلکہ آپ نے اپنے علم و عمل سے ثابت کیا کہ انسان کی اصل فضیلت اس کے ایمان، تقویٰ اور علم میں ہوتی ہے، نہ کہ ظاہری صورت و ہیئت میں۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اور دیگر اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا، خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ انہیں دو سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے علمی ذخیرے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علم، فقہ اور حدیث میں آپ کا مقام اس قدر بلند تھا کہ اہلِ مکہ کی دینی رہنمائی اور فتویٰ کا مرکز آپ ہی کی ذات بن گئی، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اہلِ مکہ سے فرمایا کرتے تھے": اے اہلِ مکہ! تم میرے پاس کیوں آتے ہو، جبکہ تمہارے درمیان عطاء موجود ہیں۔" یہ جملہ حضرت عطاء رحمہ اللہ کے علمی مقام پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غیر معمولی اعتماد کی روشن دلیل ہے۔

ائمۂ علم وحدیث نے بھی حضرت عطاء رحمہ اللہ کی عظمت کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں،" میں نے جن علماء سے ملاقات کی، ان میں عطاء سے بڑھ کر کسی کو افضل نہیں پایا۔" امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا": جس دن عطاء کا انتقال ہوا، اس دن لوگوں کے نزدیک وہ روئے زمین کے سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ انسان تھے"۔

اسی طرح سلمہ بن کہیل رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے علم کو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حاصل کرنے والوں میں صرف تین شخصیات کو نمایاں پایا، حضرت عطاء رحمہ اللہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت طاؤس رحمہ اللہ۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے انہیں فقہ، علم، ورع اور فضیلت میں ساداتِ تابعین میں شمار کیا ہے، جبکہ صحاحِ ستہ کے تمام مصنفین نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، جو ان کی ثقاہت اور جلالتِ علمی کا واضح ثبوت ہے۔

مختصراً، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ تابعین کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنہوں نے تفسیرِ قرآن، حدیث اور فقہ کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، زہد و تقویٰ، اخلاص اور علمی رسوخ نے انہیں اپنے عہد کی ایک منفرد اور باوقار شخصیت بنا دیا اور ان کا نام ہمیشہ مفسرین و فقہائے اسلام کی اولین صف میں یاد رکھا جائے گا۔

تفسیرِ قرآن میں حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کا مقام: حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کے بارے میں ائمۂ علم کی آراء اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے عہد کے نہایت بلند پایہ عالم، ثقہ راوی اور صاحبِ فضل تابعی تھے، ان کے علمی مقام کی سب سے بڑی دلیل ان کے استاذ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ گواہی ہے جس میں انہوں نے اہلِ مکہ سے فرمایا": تم میرے پاس کیوں آتے ہو، جبکہ تمہارے درمیان عطاء موجود ہیں۔" یہ جملہ حضرت عطاء رحمہ اللہ کے علم، فقاہت اور ثقاہت پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غیر معمولی اعتماد کا مظہر ہے۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ خصوصاً مناسک حج کے علم میں امتیازی مقام رکھتے تھے، قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تابعین میں چار حضرات اپنے اپنے فن میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ مناسک حج کے سب سے بڑے عالم تھے، حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ تفسیر قرآن میں سب سے نمایاں تھے، حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سیر و مغازی کے سب سے بڑے ماہر تھے، جبکہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حلال و حرام کے مسائل میں سب سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے۔

اگرچہ حضرت عطاء رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر کی روایات نسبتاً کم نقل کیں اور اس اعتبار سے حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ ان سے زیادہ مشہور ہوئے، لیکن اس سے ان کے علمی مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ وہ تفسیر کے معتبر ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، البتہ وہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں اپنی ذاتی رائے سے اظہار کرنے میں نہایت محتاط تھے۔

عبدالعزیز بن رفیع رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عطاء رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا، انہوں نے فرمایا" : میں نہیں جانتا۔ "لوگوں نے عرض کیا" : اپنی رائے سے ہی جواب دے دیجیے، "اس پر حضرت عطاء رحمہ اللہ نے فرمایا" مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ زمین میں میرے ذاتی رائے کے مطابق دین بیان کیا جائے۔"

یہ واقعہ حضرت عطاء رحمہ اللہ کے غیر معمولی تقویٰ، علمی احتیاط اور تفسیرِ قرآن میں ذمہ داری کے

احساس کو نمایاں کرتا ہے، یہی اوصاف انہیں تابعین کے ممتاز مفسرین اور فقہاء کی صفِ اول میں جگہ دیتے ہیں۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ

امام ابوسعید حسن بن ابی الحسن یسار بصری جلیل القدر تابعی، بلند پایہ مفسر، محدث، فقیہ، عابد اور زاہد تھے، آپ کی والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین کی آزاد کردہ باندی تھیں، اس لیے بچپن ہی سے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ صحبت اور علمی ماحول میسر آیا، آپ کی ولادت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دو برسوں میں ہوئی، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور اپنی غیر معمولی علمی صلاحیت، تقویٰ اور کردار کے باعث جلد ہی بصرہ کے ممتاز علماء اور اکابر تابعین میں شمار ہونے لگے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فصاحت و بلاغت، زہد و عبادت، اخلاص و للّٰہیت اور وعظ و نصیحت میں اپنی مثال آپ تھے، آپ کی گفتگو دلوں پر گہرا اثر چھوڑتی، غفلت کے پردے چاک کرتی اور آخرت کی فکر تازہ کر دیتی تھی، اسی لیے اہل علم نے آپ کو اپنے عہد کا عظیم واعظ، مربی اور مقتدیٰ قرار دیا ہے۔

علمی مقام: امام حسن بصری رحمہ اللہ قرآن کریم، سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور احکامِ شریعت کے عظیم امام تھے، متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے براہِ راست استفادہ کرنے کے باعث آپ کا علمی سرمایہ نہایت وسیع اور مستند تھا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "حسن سے مسائل دریافت کیا کرو، اس لیے کہ انہوں نے وہ علوم محفوظ کر لیے ہیں، جنہیں ہم میں سے بہت سے لوگ محفوظ نہ رکھ سکے" سلیمان تیمی رحمہ اللہ نے آپ کو اہلِ بصرہ کا شیخ قرار دیا، جبکہ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے جس فقیہ کی بھی مجلس اختیار کی، حسن بصری رحمہ اللہ کو اس پر علمی فضیلت رکھتے ہوئے پایا۔ بکر مزنی رحمہ اللہ کے نزدیک ان کے زمانے میں حسن بصری رحمہ اللہ سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ انہیں ایسا عظیم امام قرار دیتے تھے جس کی اقتدا کی جاتی ہے، جبکہ امام ابو جعفر باقر رحمہ اللہ فرمایا کرتے

تھے کہ حسن بصری رحمہ اللہ کا کلام انبیائے کرام علیہم السلام کے کلام سے مشابہت رکھتا ہے۔

امام ابن سعد رحمہ اللہ نے انہیں جامع الصفات شخصیت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ثقہ، امین، فقیہ، عابد، زاہد، نہایت صاحبِ علم، فصیح اللسان اور نہایت باوقار انسان تھے، ائمہ حدیث رحمہم اللہ نے ان کی ثقاہت پر اعتماد کیا ہے، اور صحاحِ ستہ کے تمام مصنفین رحمہم اللہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں، جو ان کی علمی عظمت اور اعتماد کا روشن ثبوت ہے۔

تفسیر میں مقام: امام حسن بصری رحمہ اللہ تابعین کے ممتاز مفسرین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، آپ نے قرآنِ مجید کی تفسیر میں گہرے تدبر، سلفِ صالحین کے فہم اور کتاب و سنت کی روشنی کو بنیاد بنایا۔ آپ کی تفسیری آراء میں ایمان کی حرارت، اخلاقی اصلاح، تزکیۂ نفس، خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے، اسی وجہ سے آپ کی تفسیر محض الفاظ کی تشریح تک محدود نہیں بلکہ قرآن کے عملی اور تربیتی پیغام کو اجاگر کرتی ہے۔

اگرچہ آپ سے مروی تفسیری اقوال کی تعداد بعض دوسرے مفسرینِ تابعین کے مقابلے میں کم ہے، تاہم جو آثار منقول ہیں وہ علمی بصیرت، فکری گہرائی اور قرآنی حکمت سے بھرپور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے آپ کے اقوال کو بڑی قدر و منزلت کے ساتھ نقل کیا ہے اور انہیں تفسیرِ مأثور کے معتبر مصادر میں شمار کیا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے تفسیر، حدیث، فقہ، وعظ و ارشاد اور اصلاحِ امت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، آپ کا وصال ۱۱۰ ہجری میں اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور امتِ مسلمہ کو ان کے علمی و روحانی فیوض سے ہمیشہ مستفید فرماتا رہے۔ آمین۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ کے ارشادات اور اقوال جب ایک ذی عقل کتابوں میں دیکھتا ہے تو اسے ایک کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، ان کے ارشادات سے زندگیاں پلٹتی ہیں، کچھ کر گزرنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، تمام بڑے مفسرین تفسیری حواشی میں ان کے حوالے نقل کرتے ہیں۔

حضرت طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ

حضرت طاؤس بن کیسان یمانی رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی، مفسرِ قرآن اور یمن کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سمیت متعدد جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور خود بیان کرتے تھے کہ انہیں پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت نصیب ہوئی۔

علمِ تفسیر میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، اگرچہ انہوں نے مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کا تعلق سب سے زیادہ مضبوط تھا، اسی لیے انہیں مکتبِ تفسیرِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نمایاں تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت طاؤس رحمہ اللہ علم کے ساتھ زہد، تقویٰ، امانت اور عبادت میں بھی بے مثال تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے" میرا گمان ہے کہ طاؤس اہلِ جنت میں سے ہیں "اسی طرح عمرو بن دینار رحمہ اللہ نے انہیں اپنے زمانے کا بے نظیر عالم قرار دیا۔

ائمۂ حدیث رحمہم اللہ نے بھی ان کی ثقاہت پر اتفاق کیا ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ قرار دیا، جبکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے انہیں یمن کے بڑے عبادت گزار اور ساداتِ تابعین میں شمار کیا اور لکھا کہ وہ مستجاب الدعوات تھے اور انہوں نے چالیس مرتبہ حج ادا کیا۔

صحاحِ ستہ کے تمام مصنفین رحمہم اللہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں، جو ان کے علمی مقام اور ثقاہت کی روشن دلیل ہے، حضرت طاؤس رحمہ اللہ کا وصال ۱۰۶ ہجری میں مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمہ اللہ

حضرت ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ سدوسی تابعین کے نامور ائمہ، جلیل القدر مفسر، محدث، فقیہ اور عربی علوم کے ممتاز ماہر تھے، آپ اصلاً عرب تھے اور بصرہ میں سکونت پذیر رہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی قوت حافظہ، وسیع علمی بصیرت اور بے مثال ذہانت سے نوازا تھا، آپ نے حضرت انس بن مالک، حضرت ابو الطفیل، محمد بن سیرین، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح اور دیگر اکابر تابعین سے علم

حاصل کیااوراپنی محنت، ذوقِ تحقیق اور علمی انہماک کے باعث اپنے دور کے ممتاز ترین اہل علم میں شمار ہوئے۔

علمی مقام: حضرت قتادہ رحمہ اللہ کو صرف تفسیر ہی میں امتیاز حاصل نہ تھابلکہ حدیث، فقہ، لغت، انساب عرب، ایام عرب اور عربی شاعری پر بھی انہیں گہری دسترس حاصل تھی، عربی زبان کی باریکیوں سے ان کی واقفیت نے ان کے تفسیری ذوق کو مزید نکھارا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیری آراء اہل علم میں بڑی قدر و منزلت رکھتی ہیں۔

آپ کی غیر معمولی قوت حافظہ ضرب المثل تھی، روایت ہے کہ جب حضرت سعید بن مسیب نے متعدد دنوں تک مختلف مسائل دریافت کیے تو حضرت قتادہ نے تمام جوابات اسی ترتیب کے ساتھ ازبرسنادیے، یہ سن کر سعید بن مسیب نے فرمایا" : مجھے گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم جیسا شخص بھی پیدا کیا ہو گا "اسی طرح امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے" : قتادہ رحمہ اللہ تمام لوگوں سے بڑھ کر حافظے والے تھے۔"

اکابر ائمہ نے بھی ان کے علمی مقام کا برملا اعتراف کیا، حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے فرمایا "میرے پاس عراق سے آنے والوں میں قتادہ سے بہتر کوئی شخص نہیں آیا "امام زہری رحمہ اللہ سے جب ان کا موازنہ امام مکحول رحمہ اللہ سے کیا گیا تو انہوں نے بلاتردد فرمایا کہ قتادہ رحمہ اللہ زیادہ صاحبِ علم ہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کے علم، فقاہت، تفسیر، اختلافِ فقہ کی معرفت اور قوتِ حفظ کی غیر معمولی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ان جیسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

مشہور نحوی امام ابو عمرو بن علاء رحمہ اللہ نے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کے مفہوم میں حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی تشریح کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ان کے بارے میں مسئلہ قدر سے متعلق گفتگو نہ ہوتی تو میں اپنے زمانے میں کسی کو ان پر ترجیح نہ دیتا۔

تفسیر میں مقام: حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا شمار تابعین کے عظٰم ترین مفسرین میں ہوتا ہے، ان کی تفسیر کی بنیاد قرآن، سنت، آثار صحابہ اور عربی زبان کے دقیق فہم پر قائم ہے، چونکہ وہ عربی لغت، محاورات،

انساب اور تاریخ عرب پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے آیات قرآنیہ کے مفاہیم بیان کرتے وقت ان کا استدلال نہایت مضبوط اور مدلل ہوتا تھا۔

ان کی بیشتر تفسیری روایات حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تلامذہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے واسطے سے منقول ہیں، بعد کے مفسرین نے ان کے اقوال سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی آراء تفاسیر بالمأثور کا اہم سرمایہ بن گئیں۔

اگرچہ بعض لوگوں نے مسئلۂ تقدیر کے حوالے سے ان پر تنقید کی، تاہم ائمۂ حدیث نے ان کی ثقاہت اور علمی عظمت کو برقرار رکھا، امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں نہایت مضبوط راوی قرار دیا، امام ابن سعد رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ، امین اور حجت لکھا، جبکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ اپنے زمانے میں قرآن، فقہ اور حدیث کے بڑے حفاظ میں سے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحاحِ ستہ کے محدثین رحمہم اللہ نے ان کی روایات کو قبول کیا اور ان سے استدلال کیا۔

حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمہ اللہ کا وصال ۱۱۷ ہجری میں تقریباً چھپن برس کی عمر میں ہوا، آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ کے میدان میں جو علمی سرمایہ امت کو عطا کیا، وہ آج بھی علومِ قرآن کے طالب علموں اور مفسرین کے لیے ایک قابلِ اعتماد اور گراں قدر سرمایہ ہے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے اور امتِ مسلمہ کو ان کے علمی فیوض سے ہمیشہ مستفید فرماتا رہے۔ آمین۔

تابعین رحمہم اللہ کی ماثور تفسیر کی علمی حیثیت

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تفسیر قرآن کا سب سے اہم سرچشمہ تابعین کا دور ہے، مفسرین نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت موجود ہو اور نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے، تو کیا تابعین کے اقوال کو حجت مانا جائے؟

اس مسئلے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، امام احمد بن حنبل سے اس بارے میں دو مختلف روایات منقول ہیں، ایک روایت کے مطابق تابعین کی تفسیر کو قبول کیا جائے، جبکہ دوسری

روایت میں اسے مستقل حجت قرار نہیں دیا گیا، ابن عقیل اور امام شعبہ رحمہما اللہ جیسے بعض علماء بھی اس رائے کے قائل ہیں کہ تابعی کے قول کو بذات خود دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

ان حضرات کے دلائل یہ ہیں کہ تابعین کو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کا شرف حاصل نہیں تھا، اس لیے ان کے اقوال کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح مرفوع کے حکم میں نہیں رکھا جاسکتا، مزید یہ کہ وہ نزولِ قرآن کے حالات، اسباب اور قرائن کے عینی شاہد بھی نہیں تھے، لہذا ان سے فہم میں اجتہادی خطا کا امکان موجود ہے، اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت پر تو نصوص شرعیہ موجود ہیں، لیکن تابعین کے بارے میں ایسی عمومی نص موجود نہیں، اسی تناظر میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا معروف قول نقل کیا جاتا ہے

"جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو اس میں ہم ان کے درمیان ترجیح دے سکتے ہیں اور جو تابعین سے منقول ہو تو وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں"

دوسری طرف جمہور مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ تابعین کی تفسیری آراء معتبر ہیں، کیونکہ ان کی اکثریت نے اپنی علمی دولت براہِ راست صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے حاصل کی تھی، حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ انہوں نے تین مرتبہ پورا قرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے پڑھا اور ہر آیت پر رک کر اس کی تفسیر دریافت کی، اسی طرح قتادہ کہتے ہیں کہ قرآن کی کوئی ایسی آیت نہیں جس کے بارے میں انہوں نے کچھ نہ سنا ہو، اسی وجہ سے ماثور تفاسیر کے مصنفین نے تابعین کے اقوال کو اپنی کتابوں میں بڑی اہمیت کے ساتھ نقل کیا اور ان پر اعتماد بھی کیا۔

معتدل اور راجح موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تابعی کا قول اس وقت قابلِ قبول ہوگا جب وہ ایسے امور سے متعلق ہو جن میں ذاتی رائے کو دخل نہ ہو اور اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ بھی نہ پایا جاتا ہو، البتہ اگر معلوم ہو کہ کسی تابعی نے اسرائیلی روایات سے استفادہ کیا ہے تو ایسی روایت کو بلا تحقیق قبول نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر کسی مسئلے پر تمام تابعین کا اجماع ہو تو وہ نہایت مضبوط دلیل شمار ہوگا اور اس

سے انحراف درست نہیں ہو گا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں نہایت متوازن وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تابعین کے اقوال اس معنیٰ میں حجت نہیں کہ وہ اپنے بعد آنے والوں پر لازم ہوں، لیکن اگر تمام تابعین کسی مسئلے پر متفق ہوں تو ان کے اجماع کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہو تو فیصلہ قرآن کی زبان، سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، عربی لغت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی روشنی میں کیا جائے گا۔

تابعین کے دورِ تفسیر کی نمایاں خصوصیات

تابعین کے زمانے میں علمِ تفسیر نے کئی نئی خصوصیات اختیار کیں، جن میں درج ذیل امور نمایاں ہیں:

۱۔ اسرائیلی اور نصرانی روایات کا داخل ہونا: اس دور میں اہلِ کتاب کی ایک بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوئی۔ اگرچہ وہ مسلمان ہو چکے تھے، لیکن ان کے ذہنوں میں سابقہ مذاہب کی بہت سی تاریخی روایات، قصے اور داستانیں محفوظ تھیں، خصوصاً تخلیقِ کائنات، انبیائے سابقین کے واقعات اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق معلومات۔

دوسری طرف مسلمانوں میں بھی ان اجمالی واقعات کی تفصیلات جاننے کا شوق موجود تھا جن کا قرآن کریم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نتیجتاً بعض تابعین نے تحقیق و تنقید کے بغیر ایسی بہت سی اسرائیلی اور نصرانی روایات کو تفسیر میں نقل کر دیا، اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، کعب الاحبار رحمہ اللہ، وہب بن منبہ رحمہ اللہ اور عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج رحمہ اللہ سے متعدد روایات منقول ہیں۔ اگرچہ ان روایات سے بعض تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں، لیکن ان پر بلا تحقیق اعتماد کرنا درست نہیں، اور یہی بات بعد کے مفسرین کے لیے بھی محلِ تنبیہ رہی۔

۲۔ تفسیر کی علاقائی علمی روایت: اس دور میں تفسیر کا بنیادی طریقہ اب بھی روایت اور تلقی ہی تھا، لیکن اب اس میں علاقائی علمی مدارس نمایاں ہو گئے تھے، مکہ کے علماء زیادہ تر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی علمی روایت کے وارث تھے، مدینہ کے علماء حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کے مکتب

سے وابستہ تھے، عراق کے علماء حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایت کو آگے بڑھاتے تھے، یوں ہر شہر میں ایک مضبوط علمی مکتب وجود میں آگیا۔

۳۔ فقہی اور کلامی رجحانات کا ابتدائی اثر: تابعین کے آخری دور میں مختلف فقہی اور اعتقادی رجحانات کی ابتدائی شکلیں سامنے آنے لگیں، جن کے اثرات بعض تفسیری آراء میں بھی محسوس ہونے لگے، مثلاً قتادہ بن دعامہ سدوسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان پر مسئلۂ قدر میں مخصوص رجحان کا اثر تھا، جس کی وجہ سے بعض اہلِ علم ان سے روایت کرنے میں احتیاط کرتے تھے، اسی طرح حسن بصری رحمہ اللہ تقدیر کے اثبات کے قائل تھے اور اپنی تفسیر میں بھی اسی عقیدے کی تائید کرتے تھے۔

۴۔ اختلافِ تفسیر میں نسبتاً اضافہ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں تابعین کے درمیان تفسیری اختلافات کی مقدار کچھ بڑھ گئی، اگرچہ بعد کے ادوار کے مقابلے میں یہ اختلاف نہایت محدود تھا، زیادہ تر اختلافات الفاظ کے تنوع، اسلوب کے فرق اور مثالوں کے اختلاف پر مبنی تھے، نہ کہ اصولی تضاد پر۔

سلف کے اختلافِ تفسیر کی حقیقت

بظاہر جب صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے مختلف اقوال کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت کی متعدد متعارض تفسیریں موجود ہیں، لیکن گہرا علمی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر اختلافات حقیقی تضاد نہیں بلکہ اختلافِ تنوع ہیں، یعنی ہر مفسر نے ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو کو بیان کیا ہے۔

علماء نے اس اختلاف کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں، جن میں اہم درج ذیل ہیں، ایک ہی حقیقت کو مختلف تعبیرات سے بیان کرنا، بسا اوقات مختلف مفسرین ایک ہی مفہوم کو الگ الگ الفاظ میں بیان کرتے ہیں، مثلاً الصراط المستقیم کی تفسیر میں کسی نے "اسلام" کہا، کسی نے "اتباعِ قرآن"، کسی نے "سنت وجماعت"، کسی نے "اطاعتِ الٰہی ورسول" اور کسی نے "راہِ عبودیت" کہا، حقیقت میں یہ سب ایک ہی راستے کے مختلف اوصاف ہیں، اس لیے ان میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔

ایک صورت یہ ہے، عام مفہوم کی مختلف مثالیں بیان کرنا، کبھی مفسر کسی عام مفہوم کے صرف ایک فرد یا مثال کو بیان کرتا ہے، نہ کہ پورے مفہوم کو محدود کرتا ہے، مثلاً سورۂ فاطر کی آیت: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ کی تفسیر میں بعض نے نماز کی مثال دی، بعض نے زکوٰۃ کی، حالانکہ دونوں کا مقصد صرف ایک عملی مثال پیش کرنا تھا، نہ کہ آیت کے مفہوم کو انہی اعمال تک محدود کرنا، اسی اصول کے تحت کبھی ایک صحابی کسی آیت کے نزول کا ایک واقعہ ذکر کرتا ہے اور دوسرا صحابی دوسرا واقعہ، جبکہ آیت دونوں مواقع پر منطبق ہو سکتی ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ ایسے الفاظ جن میں متعدد معانی کی گنجائش ہو، قرآن کے بعض الفاظ لغوی اعتبار سے ایک سے زیادہ معانی رکھتے ہیں، یا ان کا اطلاق مختلف افراد پر ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں سلف کے مختلف اقوال درحقیقت مختلف احتمالات کی وضاحت ہوتے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کی نفی۔

ایک صورت یہ ہے کہ قریب المعنی الفاظ سے تفسیر کرنا، عربی زبان میں کامل مترادفات بہت کم ہیں، اس لیے مفسرین کسی لفظ کے قریب ترین مفہوم کو بیان کرتے ہیں، مثلاً تُبْسَلَ کی تفسیر میں کسی نے "روک لیا جائے"، کسی نے "گروی رکھ دی جائے" کہا، دونوں تعبیرات اصل مفہوم کے قریب ہیں اور ان میں کوئی حقیقی تعارض نہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ مختلف قراءات کی بنیاد پر اختلاف پایا جاتا ہے، بعض اوقات اختلاف صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ایک مفسر نے ایک قراءت کے مطابق تفسیر کی اور دوسرے نے دوسری قراءت کے مطابق، اس صورت میں دونوں اقوال درست ہوتے ہیں، کیونکہ ہر ایک اپنی متعلقہ قراءت کی تشریح کر رہا ہوتا ہے، نہ کہ دوسرے کی تردید۔

اشاری تفاسیر کا تعارف اور ان کا منہج تفسیر

صوفیانہ یا اشاری تفسیر کی روایت میں متعدد ایسی تفاسیر سامنے آئیں جن میں قرآنِ کریم کے باطنی، روحانی اور سلوکی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا، ان تفاسیر کا بنیادی مقصد ظاہری تفسیر کی جگہ لینا نہیں، بلکہ اہلِ سلوک کے ذوق، احوال اور روحانی واردات کی روشنی میں قرآنی آیات سے لطائف و اشارات

اخذ کرنا تھا، ذیل میں اس مکتبِ تفسیر کی چند نمایاں کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ تفسیر القرآن العظیم: اس تفسیر کے مصنف امام ابو محمد سہل بن عبد اللہ تستری رحمہ اللہ ہیں، آپ ۲۰۰ھ (بعض کے نزدیک ۲۰۱ھ) میں تُستر میں پیدا ہوئے، زہد، تقویٰ، عبادت، مجاہدہ اور معرفتِ الٰہی میں آپ کا بلند مقام تھا، مکہ مکرمہ میں حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ سے ملاقات کی، ایک عرصہ بصرہ میں قیام فرمایا، اور ۲۸۳ھ (بعض کے نزدیک ۲۷۳ھ) میں وفات پائی۔

تفسیر کا منہج: یہ تفسیر حجم کے اعتبار سے مختصر ہے۔ اس میں پورے قرآن کی مسلسل تفسیر موجود نہیں، بلکہ مختلف سورتوں کی منتخب آیات پر گفتگو کی گئی ہے، غالب قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب خود امام تستری نے تصنیف نہیں کی، بلکہ ان کے مختلف مواقع پر بیان کردہ تفسیری اقوال کو ابو بکر محمد بن احمد البلدی نے جمع کر کے مرتب کیا۔

امام تستری رحمہ اللہ قرآن کے چار درجات بیان کرتے ہیں ①: ظاہر: تلاوت اور لفظی معنی۔ ② باطن: آیات کا حقیقی فہم۔ ③ حد: حلال و حرام کی حدود۔ ④ مطلع: اللہ تعالیٰ کی عطا سے دل پر منکشف ہونے والے اسرار۔ ان کے نزدیک ظاہری معانی ہر عربی دان شخص سمجھ سکتا ہے، لیکن باطنی حقائق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے۔

نمایاں خصوصیات: اس تفسیر کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں: کہیں صرف ظاہری تفسیر بیان کی گئی ہے، کہیں ظاہری معنی کے بعد اشاری معنی ذکر کیے گئے ہیں، کہیں صرف اشاری تفسیر پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کا بنیادی مقصد تزکیۂ نفس، اصلاحِ قلب اور اخلاقی تربیت ہے، صالحین کے اقوال اور واقعات سے استدلال کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر نہایت بعید اشارات بھی ملتے ہیں، تاہم مجموعی طور پر اس کی بیشتر اشاری تعبیریں قرآن کے الفاظ سے کسی نہ کسی درجے میں مناسبت رکھتی ہیں اور شرعی یا عقلی اصولوں سے متصادم نہیں ہوتیں۔

۲۔ حقائق التفسیر: اس کتاب کے مصنف ابو عبد الرحمن محمد بن الحسین السلمی رحمہ اللہ ہیں، آپ ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، خراسان کے عظیم صوفی، محدث اور مصنف تھے، حدیث، تصوف اور تاریخ

سمیت مختلف علوم میں ایک سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ۴۱۲ھ میں وفات پائی۔ اگرچہ بعض ناقدین نے ان پر سخت اعتراضات کیے، لیکن بہت سے ائمہ، خصوصاً ابن سبکی نے انہیں ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔

تفسیر کا منہج: یہ تفسیر تقریباً پورے قرآن پر مشتمل ہے، لیکن تمام آیات کی تفسیر موجود نہیں، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں: صرف اشاری معانی نقل کیے گئے ہیں، ظاہری تفسیر بیان نہیں کی گئی، مؤلف نے اپنی طرف سے زیادہ اجتہاد نہیں کیا بلکہ سابق صوفیہ کے اقوال جمع کیے ہیں، جعفر صادق، جنید بغدادی، فضیل بن عیاض، سہل تستری اور دیگر مشائخ رحمہم اللہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

علمی نقد: اس کتاب پر متعدد علماء نے اعتراضات کیے، امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسے غیر محمود قرار دیا، امام ذہبی رحمہ اللہ نے بعض مقامات کو قرامطہ کے طرز سے مشابہ کہا، امام واحدی رحمہ اللہ نے نہایت سخت کلام کیا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی طرف منسوب بہت سی روایات صحیح نہیں۔

مصنفِ کتاب شیخ محمد حسین ذہبی رحمہ اللہ ان اعتراضات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں سلمی باطنی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے، انہوں نے ظاہری معانی کا انکار نہیں کیا، اصل اشکال یہ ہے کہ انہوں نے صرف اشاری معانی نقل کیے ہیں، حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کی طرف منسوب متعدد اقوال واقعی قابلِ اعتماد نہیں، اس لیے اس کتاب سے استفادہ احتیاط کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔

۳۔ عرائس البیان فی حقائق القرآن: اس کے مصنف روزبہان بقلی شیرازی رحمہ اللہ ہیں، جن کا انتقال ۶۶۶ھ میں ہوا۔

منہج تفسیر: یہ مکمل طور پر اشاری تفسیر ہے، اگرچہ مؤلف ظاہری تفسیر کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن پوری کتاب میں صرف روحانی اشارات بیان کیے گئے ہیں۔

ان کے نزدیک قرآن کے ہر حرف کے بے شمار اسرار ہیں، مفسر صرف ان میں سے چند قطرے بیان کر سکتا ہے، ان کے بیان کردہ معانی قرآن کے باطنی حقائق کی جھلک ہیں۔

علمی جائزہ: مصنف کے مطابق: مؤلف کا یہ اعتراف درست ہے کہ قرآن کے معانی لامحدود ہیں، لیکن ان کا یہ تصور درست نہیں کہ ان کی تمام اشاری تعبیرات ہی اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں، ان اشارات کو زیادہ سے زیادہ اہلِ سلوک کے ذوقی معانی سمجھا جاسکتا ہے، قطعی تفسیر نہیں۔

۴۔ التأویلات النجمیہ: اس عظیم تفسیر کی تصنیف دو بزرگوں نے مکمل کی۔ ① نجم الدین دایہ (وفات ۶۵۴ھ) ② علاء الدولہ سمنانی (۶۵۹-۷۳۶ھ) نجم الدین دایہ سورۂ ذاریات تک تفسیر لکھ سکے، ان کے بعد علاء الدولہ سمنانی نے اسے مکمل کیا۔

منہج تفسیر: یہ تفسیر پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے دو حصوں میں واضح فرق ہے، نجم الدین دایہ کا حصہ: پہلے ظاہری معنی بیان کرتے ہیں، اس کے بعد اشاری تفسیر ذکر کرتے ہیں، اشارات نسبتاً آسان اور قابلِ فہم ہیں، آیات کے باہمی ربط کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ جب کہ علاء الدولہ سمنانی کا حصہ میں صرف اشاری تفسیر بیان کی گئی، انتہائی دقیق صوفیانہ اصطلاحات استعمال کی گئیں، ہر آیت کے متعدد باطنی مراتب بیان کیے گئے، سات، ستر بلکہ سات سو بطونِ قرآن کا نظریہ پیش کیا گیا۔

علمی حیثیت: یہ اشاری تفاسیر میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے، لیکن اس کا بعد والا حصہ نہایت دقیق اور فلسفیانہ ہونے کی وجہ سے عام اہلِ علم کے لیے آسان نہیں۔

۵۔ ابن عربی سے منسوب تفسیر: یہ تفسیر عموماً شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن متعدد دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے حقیقی مصنف عبد الرزاق کاشانی ہیں، مصنف نے اس نسبت کے خلاف چند مضبوط دلائل ذکر کیے ہیں، تمام قدیم مخطوطات اسے کاشانی کی طرف منسوب کرتے ہیں، کشف الظنون میں بھی اسے "تأویلات القاشانی" کہا گیا ہے، کتاب کے اندر ایسے شیوخ کا ذکر ہے جو زمانی اعتبار سے ابن عربی کے استاد ہو ہی نہیں سکتے تھے، لہٰذا صحیح نسبت عبد الرزاق کاشانی کی طرف ہے۔

منہج تفسیر: اس تفسیر میں دو رجحانات نمایاں ہیں ①: صوفیانہ اشاری تفسیر۔ ② وحدت الوجود پر مبنی نظریاتی تفسیر، کئی مقامات پر آیات کی ایسی تاویلات کی گئی ہیں جو وحدت الوجود کے فلسفے کو ثابت

کرنے کے لیے اختیار کی گئی معلوم ہوتی ہیں۔

علمی جائزہ: ڈاکٹر محمد حسین ذہبی فرماتے ہیں، کاشانی باطنی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے، وہ ظاہری معانی کے منکر نہیں، تاہم ان کی بہت سی اشاری تعبیرات نہایت بعید ہیں، وحدت الوجود کے اثرات نے اس تفسیر کو علمی اعتبار سے متنازع بنادیا ہے۔ (التفسیر والمفسرون)

ابن عربی اور ان کا تفسیری منہج: محی الدین محمد بن علی بن عربی ۵۶۰ھ میں اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے، بعد ازاں اشبیلیہ، مکہ، شام، مصر اور دیگر علاقوں کا سفر کیا اور آخر عمر دمشق میں گزاری، جہاں ۶۳۸ھ میں وفات پائی، تصوف، حدیث، فقہ، ادب اور فلسفہ میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی، ابن عربی کی شخصیت ہمیشہ اختلاف کا مرکز رہی، ان کے مداحوں میں امام سیوطی رحمہ اللہ فیروزآبادی رحمہ اللہ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ سراج الدین بلقینی رحمہ اللہ جیسے اکابر شامل ہیں، جبکہ ابن عربی کے ناقدین میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ابن الخیاط رحمہ اللہ جیسے علماء نمایاں ہیں، اختلاف کی اصل وجہ ان کا نظریۂ وحدت الوجود اور بعض مبہم عبارات ہیں۔

وحدت الوجود کا اثر: شیخ ابن عربی رحمہ اللہ کے نزدیک حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، کائنات اسی وجود کے مظاہر ہیں، متعدد قرآنی آیات کی تفسیر اسی نظریے کی روشنی میں کی گئی، مصنف اس طرزِ تفسیر کو محلِ نقد قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس میں قرآن کو پہلے سے قائم ایک فلسفیانہ نظریے کے تابع کر دیا جاتا ہے۔

ابن عربی رحمہ اللہ اشاری تفسیر کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں، اہلِ معرفت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معانی منکشف ہوتے ہیں، یہ اشارات بھی درحقیقت مرادِ الٰہی ہی ہوتے ہیں، اہلِ ظاہر صرف الفاظ تک محدود رہتے ہیں، جبکہ اہلِ حقیقت اصل مراد تک پہنچتے ہیں، جب کہ ارباب ذوق اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتے اور واضح کرتے ہیں کہ الہام یا کشف کو قرآن کی تفسیر کا مستقل اور قطعی معیار نہیں بنایا جاسکتا۔

اشاری تفسیر اسلامی تفسیری روایت کا ایک معروف رجحان ہے، جس نے تزکیۂ نفس، اخلاق،

سلوک اور روحانی تربیت کے باب میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن اس سے استفادہ اسی وقت درست ہو گا جب چند بنیادی اصول ملحوظ رکھے جائیں، ① اشاری معنی، ظاہری تفسیر کے مخالف نہ ہوں، ② وہ قرآن کے الفاظ سے کسی نہ کسی درجے میں مناسبت رکھتے ہوں، ③ شریعت کے قطعی اصولوں سے متصادم نہ ہوں، ④ انہیں قطعی مرادِ الٰہی قرار نہ دیا جائے، بلکہ اہلِ سلوک کے ذوقی اشارات سمجھا جائے، ⑤ جہاں فلسفیانہ تصوف یا وحدت الوجود کی بنا پر آیات کو اصل مفہوم سے ہٹا دیا گیا ہو، وہاں احتیاط اور تنقیدی نظر ضروری ہے۔

اسی اعتدال کے ساتھ اشاری تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن اور روحانی تربیت کے متعدد قیمتی نکات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جبکہ قرآن کے ظاہری، لغوی اور شرعی مفہوم کو ہمیشہ اصل بنیاد کی حیثیت حاصل رہے گی۔

معارف الفرقان کے مصادر

بندہ عاجز و مسکین نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں عربی اور اردو تفاسیر سے خوب استفادہ کیا ہے، ان میں امہات التفاسیر بھی ہیں اور مختصر بھی، اردو کی بڑی بڑی تفاسیر بھی ہیں اور چھوٹی تفاسیر بھی، کوشش یہی کی گئی ہے کہ آیات کی وضاحت ہر صورت میں کی جائے، اس دوران اندازہ ہوا کہ بڑے بڑے اہل تفسیر بعض مقامات سے بڑی خاموشی کے ساتھ آگے گزر گئے، ایسے مقامات پر ہم نے بہت کوشش کی کہ اپنے پڑھنے والوں کو مواد پیش کریں تاکہ ان کی علمی تشنگی بجھ سکے، اس پر کئی گنا مسرت ہوئی کہ ہم نے اہم ترین اور مشکل ترین مقامات کا احاطہ کیا ہے، چند تفاسیر جن پر ہماری نظر رہی ان کا اختصار کے ساتھ یہاں تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

جامع البیان فی تاویل القرآن

امام ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری رحمہ اللہ (۲۲۴ھ–۳۱۰ھ) اسلامی تاریخ کے ان نابغہ روزگار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، جنہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، قراءات اور تاریخ کے علوم میں گراں قدر خدمات انجام دیں، آپ طبرستان کے شہر آمل میں ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے، بارہ برس کی عمر میں

طلب علم کے لیے وطن چھوڑا اور مصر، شام، عراق اور دیگر علمی مراکز کا سفر کر کے علماء سے استفادہ کیا، آخر کار بغداد کو اپنا مستقل مسکن بنایا، جہاں تدریس، تصنیف اور تحقیق میں پوری زندگی بسر کی اور ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

امام طبری رحمہ اللہ غیر معمولی حافظے، وسعتِ مطالعہ اور تحقیقی بصیرت کے مالک تھے، قرآنِ کریم، علومِ حدیث، فقہ، اختلافِ فقہاء، اقوالِ صحابہ و تابعین، ناسخ و منسوخ، قراءات، عربی زبان اور اسلامی تاریخ پر انہیں گہری دسترس حاصل تھی، اسی جامع علمی استعداد کے باعث وہ اپنے دور کے مجتہدِ مطلق، جلیل القدر محدث، مفسر، مؤرخ اور فقیہ کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے تھے۔

اکابر علماء نے ان کی علمی عظمت کا برملا اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے انہیں اپنے زمانے کا بے مثال عالم قرار دیا، جب کہ ابن خلکان نے انہیں مجتہد ائمہ میں شمار کیا ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ کے مطابق وہ ابتدا میں فقہ شافعی کے پیرو تھے، لیکن بعد میں اجتہاد کی اس بلند منزل پر فائز ہوئے کہ انہوں نے مستقل فقہی مسلک اختیار کیا، جس کے ماننے والے "جریریہ" کہلاتے تھے، اگرچہ یہ مسلک بعد کے ادوار میں باقی نہ رہ سکا۔

امام طبری رحمہ اللہ نے متعدد علوم میں قیمتی تصانیف یادگار چھوڑیں، ان کی معروف کتابوں میں جامع البیان عن تأویل آي القرآن، تفسیر طبری (، تاریخ الأمم والملوک) قراءات، فقہ، اختلافِ علماء اور اصولِ دین پر متعدد تصنیفات شامل ہیں، اگرچہ ان کی بیشتر کتابیں وقت کے ساتھ ناپید ہو گئیں، تاہم تفسیر طبری اور تاریخ طبری آج بھی اسلامی علمی ورثے کی عظیم ترین یادگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔

تفسیر اور تاریخ کے میدان میں امام طبری رحمہ اللہ کی خدمات اس قدر غیر معمولی ہیں کہ انہیں بجا طور پر امام المفسرین اور اسلامی تاریخ نویسی کے بانی ائمہ میں شمار کیا جاتا ہے، ان کی علمی دیانت، تحقیق، وسعتِ نظر اور استدلالی قوت نے ان کی تصانیف کو ہر دور کے اہلِ علم کے لیے مرجع بنا دیا ہے۔

بعض افراد کی جانب سے ان پر تشیع یا دیگر اعتراضات بھی کیے گئے، لیکن جمہور محدثین و ائمۂ

جرح وتعدیل نے انہیں ثقہ، صادق اور قابلِ اعتماد امام قرار دیا ہے، محققین نے واضح کیا ہے کہ ان پر لگائے گئے شدید الزامات بے بنیاد ہیں اور ان کی علمی عظمت پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔

امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی پوری زندگی علمِ دین کی خدمت، تحقیق اور تصنیف میں صرف کی، ان کی گراں قدر علمی میراث بالخصوص تفسیر طبری آج بھی علومِ قرآن کا ایک بنیادی اور مستند ماخذ سمجھی جاتی ہے، اور دنیا بھر کے علماء و مفسرین اس سے استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔

تفسیرِ طبری کا تعارف اور اس کا منہجِ تفسیر: جامع البیان عن تأویل آی القرآن امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ کی وہ شہرۂ آفاق تفسیر ہے جسے علومِ قرآن کی تاریخ میں بنیادی اور مستند ترین تفاسیر میں شمار کیا جاتا ہے، یہ تفسیر صرف تفسیرِ بالمأثور کا عظیم سرمایہ ہی نہیں بلکہ تدبر، استنباط، علمی تحقیق اور تنقیدی تجزیے کا بھی بہترین نمونہ ہے، بعد کے تقریباً تمام بڑے مفسرین نے کسی نہ کسی درجے میں اس سے استفادہ کیا، اسی لیے اسے تفاسیر کی اساس اور مفسرین کا اولین مرجع قرار دیا جاتا ہے۔

یہ تفسیر تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب اسے نایاب بلکہ مفقود سمجھا جانے لگا، لیکن بعد میں اس کا مکمل مخطوطہ دریافت ہوا اور اس کی اشاعت نے علمی دنیا میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑادی، یوں تفسیرِ بالمأثور کا یہ عظیم خزانہ دوبارہ اہلِ علم کی دسترس میں آگیا۔

علمائے امت نے اس تفسیر کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تفسیرِ طبری تمام تفاسیر میں سب سے زیادہ جلیل القدر اور جامع ہے، کیونکہ اس میں مختلف اقوال کی توجیہ، ان کے درمیان ترجیح، نحوی مباحث اور دقیق استنباط سب یکجا ملتے ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا کہ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تفسیرِ طبری جیسی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تفاسیر میں سب سے زیادہ صحیح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس میں سلفِ صالحین کے آثار صحیح سندوں کے ساتھ

نقل کیے گئے ہیں اور یہ غیر معتبر روایات سے بڑی حد تک محفوظ ہے، امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد فرمایا کہ "روئے زمین پر میں نے ابن جریر سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں جانتا"۔

مغربی مستشرق تھیوڈور نولڈیکے نے بھی اس تفسیر کی غیر معمولی علمی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ اگر یہ کتاب ابتدا ہی سے دستیاب ہوتی تو بعد کی بہت سی تفاسیر کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ ابتدا میں اس تفسیر کو تقریباً تیس ہزار صفحات پر مرتب کرنا چاہتے تھے، لیکن جب شاگردوں نے اس قدر ضخامت کو دشوار محسوس کیا تو آپ نے خود ہی اسے اختصار کے ساتھ تقریباً تین ہزار صفحات میں مرتب کر دیا، اسی طرح اپنی مشہور کتاب "تاریخ الامم والملوک" کو بھی اختصار کے ساتھ مکمل فرمایا اور اس موقع پر افسوس کے ساتھ فرمایا، إِنَّا لِلّٰهِ، مَاتَتِ الْهِمَمُ افسوس! لوگوں کے بلند حوصلے گویا ختم ہو گئے ہیں۔

تفسیر کا منہج: امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نہایت منظم اور علمی اسلوب اختیار کیا ہے، ہر آیت کی تشریح کا آغاز عموماً اَلْقَوْلُ فِي تَأْوِيلِ قَوْلِهِ تَعَالَى سے کرتے ہیں، پھر آیت کی تفسیر میں صحابۂ کرام رحمہم اللہ اور تابعین رحمہم اللہ کی مرویات اپنی اسناد کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اگر کسی آیت میں متعدد اقوال ہوں تو تمام معروف آراء پوری دیانت کے ساتھ نقل کرتے ہیں، ان کے دلائل بیان کرتے ہیں اور پھر علمی بنیادوں پر راجح قول کا انتخاب کرتے ہیں۔

امام طبری رحمہ اللہ صرف روایات کے ناقل نہیں بلکہ ایک صاحبِ نظر محقق بھی ہیں، اسی لیے وہ مختلف اقوال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، ان کے درمیان تطبیق یا ترجیح قائم کرتے ہیں، ضرورت کے مطابق نحوی و لغوی مباحث پیش کرتے ہیں، قراءات کا ذکر کرتے ہیں اور آیات سے فقہی و شرعی احکام بھی نہایت عمدہ انداز میں مستنبط کرتے ہیں۔

تفسیر بالرائے پر تنقید: امام طبری رحمہ اللہ اس بات کے سخت قائل ہیں کہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں سلفِ صالحین کے آثار کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے، وہ محض ذاتی رائے یا صرف لغوی احتمالات کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کو پسند نہیں کرتے، چنانچہ سورۂ یوسف کی آیت: ثُمَّ يَأْتِي مِنْ

بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ کی تفسیر میں پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے اقوال ذکر کرتے ہیں، پھر ایک ایسے مفسر کی رائے کی تردید کرتے ہیں جس نے صرف لغت کی بنیاد پر يَعْصِرُونَ کا مفہوم "نجات پانا" بیان کیا تھا، اس رائے کی تائید میں عربی شعر بھی پیش کیا گیا تھا، جنہیں امام طبری رحمہ اللہ نے نقل کیا:

صَادِيًا يَسْتَغِيثُ غَيْرَ مُغَاث وَلَقَدْ كَانَ عَصْرَةُ الْمَنْجُودِ

ترجمہ: وہ پیاسا فریاد کر رہا تھا مگر کوئی اس کی فریاد کو نہ پہنچا، حالانکہ مصیبت زدہ کے لیے نجات کا وقت آچکا تھا۔ اسی طرح دوسرا شعر نقل کیا:

فَبَاتَ وَأَسْرَى الْقَوْمُ آخِرَ لَيْلِهِمْ وَمَا كَانَ وَقَّافًا بِغَيْرِ مُعَصِّرِ

ترجمہ: قافلہ رات کے آخری حصے میں روانہ ہو گیا، اور وہ اس مقام پر نہیں رکا جہاں نجات یا آسودگی کا کوئی سبب موجود نہ ہو۔

ان اشعار کے باوجود امام طبری رحمہ اللہ واضح کرتے ہیں کہ یہ تاویل درست نہیں، کیونکہ اس کے برخلاف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی متفقہ تفسیر موجود ہے اور قرآن کی تفسیر میں انہی کے فہم کو اصل معیار قرار دیا جانا چاہیے۔ مختصراً، جامع البیان روایت و درایت، نقل و عقل، تحقیق و تنقید اور استنباط و ترجیح کا ایسا حسین امتزاج ہے جس نے بعد کی تمام تفسیری روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے، یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر آج بھی اہلِ علم کے نزدیک علومِ تفسیر کا بنیادی، مستند اور ناقابلِ استغنا ماخذ سمجھی جاتی ہے، راقم الحروف کی تفسیر معارف الفرقان میں جگہ جگہ جامع البیان فی تاویل القرآن کے حوالہ جات موجود ہیں۔

تفسیر بحر العلوم

بحر العلوم کے مصنف امام ابو اللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی رحمہ اللہ متوفیٰ ۳۷۳ھ، بعض کے نزدیک ۳۷۵ھ فقہِ حنفی کے ممتاز امام، مفسر، محدث اور واعظ تھے، آپ "امام الہدیٰ" کے لقب سے معروف تھے اور فقہ کی تعلیم اپنے استاذ امام ابو جعفر ہندوانی رحمہ اللہ سے حاصل کی، علمی وسعت،

زہد و تقویٰ اور مفید تصنیفات کی بنا پر آپ کو اپنے عہد کے اکابر علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔

امام سمرقندی رحمۃ اللہ نے متعدد اہم علمی کتابیں تصنیف کیں، جن میں بحر العلوم، النوازل، خزانۃ الفقہ، تنبیہ الغافلین اور البستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی یہ تصانیف صدیوں سے اہلِ علم کے درمیان مقبول اور مستند سمجھی جاتی رہی ہیں۔

بحر العلوم، جسے تفسیرِ ابو اللیث سمرقندی بھی کہا جاتا ہے، تفسیرِ بالمأثور کی معروف اور معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے، علامہ حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ نے کشف الظنون میں اسے ایک مشہور، لطیف اور نہایت مفید تفسیر قرار دیا ہے، بعد میں علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی رحمۃ اللہ نے اس میں مذکور احادیث کی تخریج بھی کی، جس سے اس کی علمی اہمیت مزید نمایاں ہوگئی، یہ تفسیر طویل عرصے تک مخطوطات کی صورت میں محفوظ رہی اور متعدد علمی کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود رہے، جس سے اس کی تاریخی اور تحقیقی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

منہجِ تفسیر: امام ابو اللیث سمرقندی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر کے آغاز میں تفسیرِ قرآن کی فضیلت، اس کے آداب اور مفسر کے لیے ضروری شرائط پر مفصل گفتگو کی ہے، انہوں نے واضح کیا کہ قرآنِ کریم کی تفسیر محض ذاتی رائے سے کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کے لیے عربی زبان، اسالیبِ قرآن، اسبابِ نزول اور سلفِ صالحین کے اقوال سے واقفیت ناگزیر ہے۔

عملی تفسیر میں امام سمرقندی رحمۃ اللہ نے زیادہ تر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین کے آثار کو بنیاد بنایا ہے، تاہم اکثر روایات بغیر مکمل سند کے نقل کی ہیں، اگر کسی آیت کے متعدد اقوال ہوں تو عموماً انہیں ذکر کر دیتے ہیں، لیکن امام طبری رحمۃ اللہ کی طرح ان کے درمیان ترجیح یا تفصیلی تنقید کم کرتے ہیں۔

تفسیر میں آپ نے ضرورت کے مطابق قراءات، لغوی مباحث اور تفسیر القرآن بالقرآن سے بھی استفادہ کیا ہے، بعض مقامات پر آیات کے ظاہری اشکالات، باہمی تعارض کے شبہات اور دقیق علمی مسائل کی نہایت عمدہ توضیح بھی کی ہے۔

اگرچہ اس تفسیر میں بعض اسرائیلی روایات اور بعض ایسے رُواۃ کی روایات بھی موجود ہیں جن پر محدثین رحمہم اللہ نے کلام کیا ہے، مثلاً کلبی رحمہ اللہ اور اسباط عن السدی کی بعض روایات، تاہم ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اور مجموعی طور پر کتاب کا اصل اعتماد آثارِ سلف پر ہی ہے۔

مختصراً، بحر العلوم روایت اور درایت کا حسین امتزاج ہے، اگرچہ اس میں تفسیرِ بالمأثور کا رنگ زیادہ غالب ہے، اسی بنا پر یہ تفسیر اہلِ سنت کی روایتی تفسیری کتب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور بعد کے متعدد مفسرین نے اس سے استفادہ کیا ہے، اپنی تفسیر معارف الفرقان میں راقم الحروف نے خوب فائدہ اٹھایا ہے، اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں حوالہ کے ساتھ مواد پیش کیا ہے۔

الکشف والبیان عن تفسیر القرآن (تفسیرِ ثعلبی)

الکشف والبیان عن تفسیر القرآن کے مصنف امام ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیشاپوری رحمہ اللہ متوفیٰ ۴۲۷ھ اپنے زمانے کے ممتاز مفسر، محدث، قاری، ادیب اور صاحبِ وعظ عالم تھے، تفسیر، عربی زبان اور علومِ قرآن میں انہیں غیر معمولی مہارت حاصل تھی، جبکہ دیانت، تقویٰ اور علمی وسعت کے باعث وہ اہلِ علم میں بلند مقام رکھتے تھے۔

امام ابن خلکان رحمہ اللہ نے انہیں اپنے دور کا سب سے نمایاں مفسر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ایسی عظیم تفسیر تصنیف کی جو اپنے زمانے کی دوسری تفاسیر پر سبقت لے گئی، یاقوت حموی رحمہ اللہ نے بھی انہیں ثقہ، حافظ، مفسر اور ادیب قرار دیتے ہوئے ان کی تفسیر کو معانیِ قرآن، لطائف، اشارات، وجوہِ اعراب اور قراءات کا جامع مجموعہ بتایا ہے، ان کی دیگر معروف تصانیف میں عرائس المجالس فی قصص الأنبیاء بھی شامل ہے، جو انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات پر ایک مشہور کتاب ہے۔

اگرچہ بعض ناقدین نے ان کی بعض روایات پر کلام کیا ہے، تاہم جمہور اہلِ علم نے ان کے علمی مقام، وسعتِ مطالعہ اور تفسیری خدمات کا اعتراف کیا ہے، امام واحدی رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر مفسر نے بھی ان سے تفسیر کا علم حاصل کیا، جو ان کی علمی عظمت کا روشن ثبوت ہے۔

الکشف والبیان تفسیرِ بالمأثور کی اہم اور جامع کتابوں میں شمار ہوتی ہے، امام ثعلبی رحمہ اللہ نے اس کی

تمہید میں اپنے علمی سفر، علومِ تفسیر کے حصول میں مسلسل محنت اور اس کتاب کی تصنیف کے محرکات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، انہوں نے اپنے سے پہلے لکھی جانے والی تفاسیر کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی، پھر ایک ایسی جامع تفسیر مرتب کرنے کا عزم کیا جس میں روایت، درایت اور مختلف علومِ قرآن کا حسین امتزاج موجود ہو۔

امام ثعلبی رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق یہ تفسیر تقریباً سو سے زائد علمی مراجع اور تین سو کے قریب مشائخ سے حاصل کردہ علمی سرمایہ کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے، جس سے اس کے تحقیقی اور علمی وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔

منہجِ تفسیر: امام ثعلبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سلفِ صالحین کی روایات کو بنیادی حیثیت دی ہے، انہوں نے کتاب کے آغاز میں اپنے تمام اساتذہ اور مرویات کی اَسناد ذکر کر دی ہیں، پھر پوری تفسیر میں انہی اسناد پر اعتماد کرتے ہوئے روایات نقل کی ہیں، جس سے کتاب کا اسلوب نسبتاً مختصر اور رواں ہو گیا ہے۔

اس تفسیر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے علومِ قرآن کے متعدد پہلوؤں کو یکجا کیا ہے، چنانچہ اس میں اسبابِ نزول، قصصِ قرآن، قراءات، وجوہ و نظائر، لغت، اعراب، معانی، فقہی احکام، استدلال، حکمتیں، اشارات، فضائل اور دیگر علمی مباحث کو نہایت جامع انداز میں سمویا گیا ہے۔

امام ثعلبی رحمہ اللہ نحوی اور لغوی مباحث میں بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں، بسا اوقات کسی لفظ یا ترکیب کی نحوی تحقیق پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ کی تفسیر میں نِعْمَ اور بِئْسَ کے نحوی اور لغوی مسائل پر نہایت مفصل بحث پیش کی ہے، جو ان کے عربی زبان پر گہرے عبور کی دلیل ہے۔

اگرچہ اس تفسیر میں روایتی تفسیر کا رنگ غالب ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ لغوی، ادبی، نحوی، فقہی اور بلاغی مباحث بھی مناسب مقدار میں شامل ہیں، جس سے یہ کتاب صرف روایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک جامع علمی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

مختصراً، الکشف والبیان ان تفاسیر میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے تفسیرِ بالمأثور کو علمی تحقیق، ادبی ذوق اور لسانی مباحث کے ساتھ جمع کیا، اسی وجہ سے بعد کے متعدد مفسرین، بالخصوص امام واحدی اور دیگر اہلِ تفسیر نے اس سے بھرپور استفادہ کیا اور یہ کتاب آج بھی علومِ تفسیر کے اہم مراجع میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہے، بندہ راقم الحروف نے معارف الفرقان میں کہیں کہیں اس کے حوالہ جات نقل کیے ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل اور امام بغوی رحمہ اللہ

تفسیر معالم التنزیل کے مصنف امام ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد البغوی رحمہ اللہ (متوفی ۵۱۰ھ) ہیں، جو محدث، فقیہ، مفسر اور جلیل القدر شافعی عالم تھے، علمی دنیا میں آپ "محی السنہ" اور "رکن الدین" کے القاب سے معروف ہیں، آپ رحمہ اللہ نے قاضی حسین رحمہ اللہ جیسے ممتاز اساتذہ سے فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کی اور اپنی علمی زندگی کو زہد، تقویٰ اور اتباعِ سنت کے ساتھ آراستہ رکھا۔

امام بغوی نہایت متقی، قانع اور عبادت گزار شخصیت کے مالک تھے، درس وتدریس کے وقت طہارت کا خصوصی اہتمام کرتے اور سادگی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھتے، ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت اور سنت نبوی ﷺ کی اشاعت میں گزری، شوال ۵۱۰ ہجری میں "مروالروذ" میں آپ کا وصال ہوا اور اپنے استاذ قاضی حسین کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔

علمی مقام وخدمات: امام بغوی رحمہ اللہ اپنے عہد کے ممتاز محدث، فقیہ اور مفسر تھے، علامہ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ نے انہیں اکابر علماءِ شافعیہ میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ علم وعمل کا حسین امتزاج، زہد وورع کا پیکر اور سلف صالحین کے منہج پر گامزن امام تھے۔

آپ کی تصانیف کو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی، جن میں، معالم التنزیل (تفسیر) شرح السنۃ، مصابیح السنۃ، الجمع بین الصحیحین، التہذیب (فقہ) خصوصی شہرت رکھتی ہیں، اہلِ علم کے نزدیک یہ قبولیت آپ رحمہ اللہ کے اخلاص، تقویٰ اور علمی دیانت کا ثمرہ ہے۔

تفسیر معالم التنزیل کا تعارف: معالم التنزیل تفسیر بالمأثور کی اہم اور معتبر کتابوں میں شمار ہوتی

ہے، یہ ایک متوسط الحجم مگر نہایت جامع تفسیر ہے جس میں مصنف نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ اور ائمۂ سلف کے اقوال کو اختصار اور حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کیا ہے۔

خازن نے اس تفسیر کو صحیح اقوال کا جامع، احادیث نبویہ سے مزین، احکامِ شرعیہ سے آراستہ اور نہایت عمدہ اسلوب میں مرتب شدہ کتاب قرار دیا ہے، اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے تفاسیر مأثورہ میں ممتاز مقام دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ دراصل تفسیر ثعلبی کا خلاصہ ہے، لیکن امام بغوی رحمہ اللہ نے اس سے موضوع روایات اور بدعتی آراء کو حذف کر کے اسے زیادہ قابل اعتماد بنا دیا ہے۔

امام بغوی کا منہج تفسیر: امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سلف صالحین کے اقوال کو بنیادی حیثیت دی ہے، وہ آیات کی تفسیر نہایت سادہ، مختصر اور واضح انداز میں بیان کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے عموماً اسناد ذکر نہیں کرتے، کیونکہ انہوں نے مقدمۂ کتاب میں اپنے طرقِ روایت بیان کر دیے ہیں۔

اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں، قرآن کی تفسیر میں اقوالِ صحابہ و تابعین سے استفادہ، صحیح احادیث کے انتخاب میں خاص احتیاط، ضعیف اور منکر روایات سے حتی المقدور اجتناب، قراءاتِ قرآنیہ کا معتدل اور مختصر ذکر، غیر ضروری نحوی، بلاغی اور فلسفیانہ مباحث سے گریز، بعض فقہی مسائل اور تفسیری اشکالات کی وضاحت، اختلافی اقوال کا ذکر، لیکن عموماً ان کے درمیان ترجیح سے احتراز، البتہ بعض مقامات پر اسرائیلی روایات اور بعض ضعیف راویوں، خصوصاً کلبی وغیرہ کی روایات بھی نقل ہوئی ہیں، اگرچہ ان کی مقدار نسبتاً کم ہے، بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں امام بغوی کی تفسیر سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، منقول عبارات کے ساتھ حوالہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

علمی حیثیت: مجموعی طور پر معالم التنزیل تفسیر بالمأثور کی نہایت معتمد، معتدل اور مفید تفسیر ہے، اس میں روایت اور درایت دونوں سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن روایت کو بنیادی مقام حاصل ہے، یہی وجہ

ہے کہ صدیوں سے اہلِ علم اس تفسیر کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور یہ آج بھی علمی حلقوں میں یکساں مقبول اور متداول ہے۔

المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز

تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز کے مصنف امام ابو محمد عبد الحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی رحمہ اللہ (متوفیٰ ۴۸۱ھ۔۵۴۶ھ) ہیں، جو اندلس کے نامور مفسر، محدث، فقیہ، قاضی، ادیب اور ماہر عربی تھے، آپ رحمہ اللہ ایک ایسے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں علم و فضل نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، آپ کے والد ابو بکر غالب بن عطیہ رحمہ اللہ اپنے زمانے کے جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے، جن کی علمی تربیت نے ابن عطیہ رحمہ اللہ کی شخصیت کو جلا بخشی۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے مختلف علوم میں گہری مہارت حاصل کی، فقہ، حدیث، تفسیر، نحو، لغت اور ادب میں آپ کو امتیازی مقام حاصل تھا، قضا کے منصب پر بھی فائز رہے اور اپنی دیانت، عدل اور حق پسندی کی بنا پر خاص شہرت حاصل کی، امام ابو حیان رحمہ اللہ نے انہیں علمِ تفسیر کا عظیم محقق قرار دیا، جبکہ ابن فرحون رحمہ اللہ نے انہیں اکابر فقہائے مالکیہ میں شمار کیا، امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی انہیں نحو و لغت کے ممتاز ائمہ میں جگہ دی ہے۔

آپ کی اہم ترین تصنیف المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ہے، جس نے آپ کو مفسرین کی صفِ اول میں نمایاں مقام عطا کیا، اس کے علاوہ آپ رحمہ اللہ نے اپنے اساتذہ اور مرویات پر مشتمل ایک علمی مجموعہ بھی مرتب کیا، ۵۴۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

المحرر الوجیز اسلامی تفاسیر میں نہایت بلند پایہ اور معتمد تفسیر شمار ہوتی ہے، علامہ خلدون کے مطابق امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے سابقہ تفاسیر، خصوصاً تفاسیر مأثورہ کا عمیق مطالعہ کرکے ان کا بہترین خلاصہ پیش کیا اور صرف وہی اقوال اختیار کیے جو صحت کے زیادہ قریب تھے، یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر صدیوں سے اہلِ مغرب، اندلس اور اہلِ علم میں یکساں مقبول رہی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے تفسیر زمخشری کے مقابلے میں زیادہ صحیح، زیادہ مستند، سنت

کے قریب اور بدعات سے محفوظ قرار دیا ہے، جب کہ امام ابو حیان رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابن عطیہ کی تفسیر نقل روایات کے اعتبار سے زیادہ جامع اور قابل اعتماد ہے، اگرچہ زمخشری کا اسلوب اختصار اور دقیق نکات کے اعتبار سے منفرد ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ کا منہجِ تفسیر: امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں روایت اور درایت دونوں کو نہایت متوازن انداز میں جمع کیا ہے، وہ پہلے آیت کا آسان اور بامحاورہ مفہوم بیان کرتے ہیں، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمہم اللہ اور ائمۂ سلف کے اقوال نقل کرتے ہیں، لیکن غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے ہیں، خصوصاً امام طبری رحمہ اللہ سے بکثرت استفادہ کرتے ہیں، تاہم جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں ان کے اقوال پر علمی نقد بھی کرتے ہیں۔

تفسیر کی نمایاں خصوصیات: اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں، تفسیرِ مأثور کو بنیادی حیثیت دینا، صحیح اور قوی روایات کا انتخاب، اقوالِ مفسرین کا علمی تجزیہ اور تنقیدی جائزہ، عربی لغت، نحو اور ادب سے وسیع استدلال، عربی اشعار سے معنی کی تائید اور استشہاد، قراءاتِ قرآنیہ کا اہتمام اور ان کے مطابق معانی کی وضاحت، فقہی، لغوی اور تفسیری مسائل میں معتدل اور محققانہ طرزِ بحث۔

اگرچہ بعض مقامات پر امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ایسے اقوال کو بھی قابلِ غور قرار دیا ہے جو اہلِ کلام یا معتزلہ کے بعض رجحانات سے قریب محسوس ہوتے ہیں، تاہم مجموعی طور پر ان کی تفسیر اہلِ سنت والجماعت کے منہج سے قریب تر سمجھی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے اپنے زمانے کی بہترین تفاسیر میں شمار کیا، اگرچہ چند علمی مقامات پر نقد بھی کیا ہے۔

علمی حیثیت: المحرر الوجیز اپنی تحقیق، اعتدال، علمی دیانت اور دقیق اسلوب کی وجہ سے اسلامی تفاسیر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس میں روایت کی صحت، درایت کی گہرائی، لغوی تحقیق، نحوی استدلال اور ادبی حسن ایک ساتھ جمع ہو گئے ہیں، یہی اوصاف اسے اہلِ علم، محققین اور طلبۂ تفسیر کے لیے ایک نہایت قیمتی اور قابلِ اعتماد مرجع بناتے ہیں اور اسے اسلامی تفسیری ذخیرے کی نمایاں ترین علمی کاوشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)

تفسیر القرآن العظیم کے مصنف امام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی رحمہ اللہ (۷۰۰۔۷۷۴ھ) ہیں، جو اسلامی تاریخ کے ممتاز محدث، مفسر، فقیہ، مؤرخ اور حافظِ حدیث تھے، آپ کا اصل تعلق بصرہ سے تھا، تاہم کم عمری ہی میں والد کے انتقال کے بعد دمشق منتقل ہو گئے، جہاں علم و فضل کے عظیم مراکز سے استفادہ کیا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنے دور کے نامور اساتذہ سے علم حاصل کیا، جن میں حافظ مزی رحمہ اللہ، ابن عساکر رحمہ اللہ اور بالخصوص شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نمایاں ہیں، ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے آپ کو گہرا علمی تعلق تھا، جس کے باعث بعض مواقع پر آزمائشوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، فقہ، حدیث، تفسیر اور تاریخ میں آپ کو امامت کا درجہ حاصل تھا اور اپنے زمانے کے اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔

آپ نے متعدد علمی شاہکار تصنیف کیے، جن میں تفسیر القرآن العظیم، البدایہ والنہایہ، طبقات الشافعیہ اور حدیث و فقہ کی دیگر اہم کتابیں شامل ہیں، شعبان ۷۷۴ھ میں دمشق میں آپ کا وصال ہوا اور آپ کو اپنے استاذ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔

علمی مقام: امام ابن کثیر رحمہ اللہ علمِ حدیث، تفسیر اور تاریخ میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے انہیں جلیل القدر محدث، مفسر اور مؤرخ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں عالمِ اسلام میں مقبول ہو گئی تھیں اور وفات کے بعد بھی اہلِ علم برابر ان سے استفادہ کرتے رہے۔

امام ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں "امام، مفتی، محدثِ متقن، فقیہ، مفسر اور صاحبِ تصانیفِ مفیدہ" قرار دیا، جبکہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے دور میں حدیث کے متون، رجال، جرح و تعدیل اور صحیح و ضعیف روایات کا ابن کثیر رحمہ اللہ سے بڑھ کر کوئی ماہر نہ تھا، ان کے معاصرین اور اساتذہ بھی ان کے علمی رسوخ کے معترف تھے، آپ کی علمی عظمت کا سب سے روشن مظہر ان کی دو شہرۂ آفاق تصانیف، تفسیر القرآن العظیم اور البدایۃ والنہایۃ ہیں، جو آج بھی اپنے

اپنے فن میں بنیادی مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تفسیر القرآن العظیم تفسیر بالمأثور کی نہایت مستند، مقبول اور متداول کتاب ہے، اہلِ علم کے نزدیک یہ تفسیر طبری کے بعد اس میدان کی سب سے اہم اور قابلِ اعتماد تفسیر شمار ہوتی ہے، اس میں قرآنِ کریم کی تفسیر قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین رحمہم اللہ کی روشنی میں نہایت محققانہ انداز سے کی گئی ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس تفسیر کے آغاز میں ایک جامع مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں علومِ قرآن اور اصولِ تفسیر کے اہم مباحث بیان کیے ہیں، اس مقدمے پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے افکار کا واضح اثر نمایاں ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا منہجِ تفسیر: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں روایت اور تحقیق کو نہایت خوبصورتی سے یکجا کیا ہے، ان کا اسلوب نہایت سادہ، رواں اور علمی ہے، وہ پہلے آیت کریمہ کا واضح مفہوم بیان کرتے ہیں، پھر اگر کسی دوسری آیت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہو تو اسے پیش کر کے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے ہیں، یہی اس تفسیر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

اس کے بعد متعلقہ صحیح احادیث، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین رحمہم اللہ ذکر کرتے ہیں اور حدیث کے فن میں اپنی گہری مہارت کی بنا پر روایات کی صحت و ضعف، راویوں کے مراتب اور دلائل کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔

تفسیر کی نمایاں خصوصیات: اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ دیکھی گئی ہیں، قرآن کی تفسیر، قرآنِ مجید کی دیگر آیات سے کرنا، صحیح احادیث اور آثارِ سلف کو بنیادی ماخذ بنانا، روایات کی تحقیق، جرح و تعدیل اور ترجیح کا اہتمام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال سے وسیع استفادہ، امام طبری رحمہ اللہ، ابن ابی حاتم رحمہ اللہ، ابن عطیہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمۂ تفسیر سے علمی استفادہ، اسرائیلی روایات کی نشاندہی، ان پر تنقید اور ضعیف و منکر روایات سے احتراز، آسان، سلیس، علمی اور عام فہم اسلوبِ بیان، بندہ عاجز نے معارف الفرقان میں علامہ ابن کثیر کی قابل رشک و قابل قدر تحقیقات

سے مزین کیا ہے۔

علمی حیثیت: تفسیر ابن کثیر اپنی صحتِ روایت، تحقیقی انداز، اعتدال، سادہ اسلوب اور اصولی منہج کے باعث صدیوں سے اہلِ علم کی اولین ترجیح رہی ہے، اس میں تفسیر بالمأثور کی روح، حدیث کی تحقیق، اقوالِ سلف کی جامعیت اور علمی تنقید یکجا ہو گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر آج بھی مدارس، جامعات اور علمی حلقوں میں نہایت اعتماد کے ساتھ پڑھی، پڑھائی اور بطورِ مرجع استعمال کی جاتی ہے اور اسے اسلامی تفسیری ادب کی مستند ترین تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔

تفسیر الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن

امام ابو زید عبد الرحمن بن محمد بن مخلوف ثعالبی رحمہ اللہ (متوفی ۸۷۶ھ) شمالی افریقہ کے جلیل القدر مفسر، محدث، فقیہ، مالکی عالم، زاہد اور صاحبِ سلوک بزرگ تھے، علم و عمل، زہد و تقویٰ اور اخلاص و للّٰہیت نے آپ کی شخصیت کو غیر معمولی وقار عطا کیا، اکابر علماء نے آپ کو اپنے زمانے کے ممتاز اہلِ علم اور اولیائے صالحین رحمہم اللہ میں شمار کیا ہے، شیخ ابن سلامہ کبریٰ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام ثعالبی رحمہ اللہ نہایت صالح، زاہد، صاحبِ علم، صاحبِ معرفت اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے تھے، دیگر مشائخ و ائمہ نے بھی ان کے علم، دیانت اور تقویٰ کی بھرپور تحسین کی ہے۔

امام ثعالبی رحمہ اللہ نے حصولِ علم کے لیے وسیع اسفار کیے، الجزائر سے نکل کر بجایہ، تونس اور مصر کے علمی مراکز کا سفر کیا، متعدد اکابر محدثین و فقہاء رحمہم اللہ سے استفادہ کیا اور حدیث و تفسیر میں نمایاں مقام حاصل کیا، خود فرماتے ہیں کہ تونس میں اس زمانے میں علمِ حدیث میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا اور اہلِ علم ان کی روایت و درایت کا اعتراف کرتے تھے۔

آپ نے متعدد علمی تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن، الذہب الإبریز فی غرائب القرآن العزیز، تحفۃ الإخوان فی إعراب بعض آیات القرآن اور جامع الأمہات فی أحکام العبادات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، آپ کا وصال تقریباً نوّے برس کی عمر میں ۸۷۶ھ میں ہوا اور الجزائر ہی میں مدفون ہوئے۔

الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن امام ثعالبی رحمۃ اللہ کی سب سے معروف اور مقبول تصنیف ہے، جسے انہوں نے نہایت محنت، تحقیق اور حسنِ ترتیب کے ساتھ مرتب کیا، مؤلف نے خود اپنی تمہید میں واضح کیا ہے کہ اس کتاب کی بنیاد زیادہ تر تفسیر ابن عطیہ رحمۃ اللہ پر ہے، لیکن اس میں انہوں نے تقریباً ایک سو معتبر تفاسیر، کتبِ حدیث اور علمی مصادر سے قیمتی اضافے بھی شامل کیے ہیں، ان کا مقصد ایک ایسا مختصر مگر جامع تفسیر نامہ پیش کرنا تھا جو صحیح، مستند اور مفید علمی مباحث کا حسین مجموعہ ہو۔

امام ثعالبی رحمۃ اللہ نے نقل وروایت میں نہایت احتیاط سے کام لیا، وہ تصریح کرتے ہیں کہ انہوں نے معتبر ائمہ کی اصل عبارات کو حتی المقدور بعینہٖ نقل کیا ہے، اپنے الفاظ میں نقل کرنے سے گریز کیا تاکہ معنی میں تبدیلی یا غلطی کا احتمال نہ رہے، اسی مقصد کے لیے انہوں نے پوری کتاب میں مخصوص علامات بھی مقرر کیں، جن کے ذریعے یہ واضح کیا کہ کون سا حصہ ابن عطیہ رحمۃ اللہ کا ہے، کون سا اضافہ خود ان کا ہے اور کون سی عبارت دیگر مفسرین یا نحویین سے منقول ہے۔

اس تفسیر میں قرآنِ کریم کی آیات کی تشریح کے ساتھ صحیح اور حسن احادیث، آثارِ سلف، فقہی فوائد، لغوی و نحوی مباحث، قرآنی لطائف اور تربیتی نکات کو نہایت متوازن انداز میں جمع کیا گیا ہے، فضائل، اذکار، ترغیب وترہیب اور آخرت سے متعلق روایات میں بھی مؤلف نے معتبر مصادر، خصوصاً امام نووی رحمۃ اللہ، امام قرطبی رحمۃ اللہ، امام بغوی رحمۃ اللہ اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔

الجواہر الحسان اپنی جامعیت، اختصار، حسنِ ترتیب اور مستند علمی مواد کے باعث مغربِ اسلامی کی نہایت مقبول تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، یہ تفسیر تفسیرِ مأثور اور تفسیرِ درایت کے حسین امتزاج کی نمائندہ ہے، جس میں سلفِ صالحین کے اقوال، علمی تحقیق، فقہی بصیرت اور تربیتی رہنمائی کو نہایت دل نشیں اسلوب میں یکجا کر دیا گیا ہے، اسی لیے یہ آج بھی اہلِ علم کے نزدیک ایک معتبر اور قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے۔

تفسیر الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور

امام جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطی رحمہ اللہ (۹۱۱ھ۔۔۸۴۹ھ) عالمِ اسلام کے ان نابغۂ روزگار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے علومِ قرآن، حدیث، فقہ، لغت، تاریخ اور ادب کے میدان میں گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا، آپ کا تعلق مصر سے تھا، پانچ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت اور شوقِ علم سے نوازا، آٹھ برس کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کر لیا اور ابتدائی عمر ہی میں متعدد علمی متون ازبر کر لیں، بعد ازاں اپنے عہد کے اکابر علماء سے اکتسابِ علم کیا، آپ کے مشہور شاگرد امام داؤدی رحمہ اللہ نے آپ کے اکاون اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ غیر معمولی قوت حافظہ اور حیرت انگیز سرعتِ تصنیف کے مالک تھے، ان کے تلمیذ داؤدی بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی دن میں تین مستقل رسائل یا کتابچے تصنیف فرما لیتے تھے، علوم حدیث میں انہیں اپنے زمانے کا امام تسلیم کیا جاتا تھا، رجال، اسناد، عللِ حدیث، متون، غریب الحدیث اور استنباطِ احکام میں ان کی مہارت مسلم تھی، خود فرمایا کرتے تھے کہ انہیں دو لاکھ احادیث حفظ تھیں اور اگر اس سے زیادہ میسر ہوتیں تو انہیں بھی محفوظ کر لیتے۔

چالیس برس کی عمر کے بعد آپ نے تدریس، افتاء اور دنیاوی مشاغل سے کنارہ کش ہو کر اپنی زندگی عبادت، تصنیف اور علمی خدمت کے لیے وقف کر دی، آپ کی تصنیفات کی تعداد پانچ سو سے زائد بیان کی جاتی ہے، جن میں الاتقان فی علوم القرآن، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، الأشباہ والنظائر، تدریب الراوي اور الدر المنثور جیسی شاہکار کتابیں شامل ہیں، آپ کا وصال ۹۱۱ھ میں قاہرہ کے مقام روضۃ المقیاس میں ہوا۔

الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور امام سیوطی رحمہ اللہ کی نہایت اہم اور مقبول تفسیری تصنیف ہے، جو تفسیرِ مأثور کے ذخیرے میں ممتاز مقام رکھتی ہے، یہ دراصل آپ کی بڑی کتاب ترجمان القرآن کا مختصر اور مرتب خلاصہ ہے، ترجمان القرآن میں تمام روایات اپنی مکمل اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں، لیکن چونکہ اس کی ضخامت عام اہلِ علم کے لیے استفادہ میں دشواری کا باعث

تھی، اس لیے امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس کا اختصار کرتے ہوئے اسناد حذف کر دیں اور ہر روایت کے ساتھ اس کے اصل ماخذ کا حوالہ باقی رکھا، اسی مختصر مجموعے کا نام الدر المنثور رکھا گیا۔

اس تفسیر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کی ہر آیت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین سے منقول تفسیری روایات کو یکجا کر دیا گیا ہے، امام سیوطی رحمہ اللہ نے ان روایات کو صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داود، مسند احمد، تفسیر طبری، تفسیر ابن ابی حاتم، تفسیر عبد بن حمید اور دیگر متعدد معتبر مصادر سے نقل کیا ہے۔

اس تفسیر کا اسلوب خالصتاً روایتی ہے، مؤلف نے روایتوں کو جمع کرنے پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھی ہے، وہ عام طور پر اقوال کے درمیان ترجیح، جرح و تعدیل، تصحیح و تضعیف یا فقہی و عقلی بحث میں داخل نہیں ہوتے بلکہ مختلف آثار کو ان کے مصادر کے ساتھ نقل کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، یہی خصوصیت اسے دیگر تفاسیر مأثور سے ممتاز بناتی ہے۔

اگرچہ امام سیوطی رحمہ اللہ خود علمِ حدیث کے امام تھے، تاہم انہوں نے اس کتاب میں روایتوں کے انتخاب میں صحت کی شرط کو لازم نہیں بنایا، بلکہ صحیح، حسن، ضعیف اور بعض اوقات کمزور روایات کو بھی جمع کر دیا ہے، اسی بنا پر اہلِ علم نے اس تفسیر سے استفادہ کرتے وقت روایات کی تحقیق اور تخریج کو ضروری قرار دیا ہے۔

اس کے باوجود الدر المنثور تفسیرِ مأثور کا ایک بے مثال انسائیکلوپیڈیا ہے، قرآنِ کریم کی تفسیر میں منقول آثار کو ایک ہی جگہ جمع کرنے کی جو خدمت امام سیوطی رحمہ اللہ نے انجام دی، وہ اپنی مثال آپ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر آج بھی محدثین، مفسرین اور علومِ قرآن کے محققین کے لیے ایک بنیادی مرجع کی حیثیت رکھتی ہے اور تفسیرِ مأثور کے اہم ترین مصادر میں شمار کی جاتی ہے۔

احکام القرآن للجصاص

امام ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص رحمہ اللہ (۳۰۵-۳۷۰ھ) فقہِ حنفی کے جلیل القدر امام، ممتاز اصولی، مفسر اور فقیہ تھے، آپ بغداد میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد میں فقہِ حنفی کی علمی قیادت

آپ ہی پر ختم ہوئی، آپ نے ابو سہل زجاج، امام ابو الحسن کرخی رحمہ اللہ اور دیگر اکابر فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ سے علم حاصل کیا، پھر بغداد ہی میں تدریس و افتاء کا مرکز بن گئے، دور دور سے طلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

امام جصاص رحمہ اللہ اپنے علم کے ساتھ زہد، تقویٰ اور بے نفسی میں بھی ممتاز تھے، منصبِ قضا کی پیش کش کئی مرتبہ ہوئی، لیکن آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، آپ نے فقہ، اصول اور تفسیر میں متعدد گراں قدر تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں احکام القرآن، شرح مختصر الکرخی، شرح مختصر الطحاوی، شرح الجامع الکبیر، اصول الفقہ اور أدب القضاء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، فقہِ حنفی کے علمی استحکام اور اس کے اصولی دفاع میں آپ کی خدمات نہایت نمایاں ہیں، آپ کا وصال ۳۷۰ھ میں بغداد میں ہوا۔

احکام القرآن فقہی تفسیر کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، خصوصاً فقہِ حنفی کے نزدیک اس کی غیر معمولی اہمیت ہے، اس کتاب میں قرآنِ کریم کی صرف ان آیات کی تفسیر کی گئی ہے جن سے فقہی احکام اور شرعی مسائل مستنبط ہوتے ہیں، اگرچہ ترتیب قرآن کے مطابق ہے، لیکن مباحث کو فقہی ابواب کی صورت میں منظم کیا گیا ہے، جس سے کتاب فقہ اور تفسیر دونوں کا حسین امتزاج بن گئی ہے۔

امام جصاص رحمہ اللہ آیاتِ احکام کی تشریح کرتے ہوئے ان سے مستنبط مسائل، فقہی مذاہب، دلائل، اصولی قواعد اور مختلف ائمہ کے اقوال پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں، بسا اوقات وہ فقہی اختلافات پر اس قدر مفصل بحث کرتے ہیں کہ کتاب ایک تقابلی فقہی انسائیکلوپیڈیا کا منظر پیش کرنے لگتی ہے، یہی اس کتاب کی بڑی علمی خصوصیت بھی ہے۔

اس تفسیر میں مؤلف کا رجحان فقہِ حنفی کی تائید اور اس کے دلائل کی تقویت کی طرف نمایاں ہے، متعدد مقامات پر وہ آیاتِ قرآنیہ سے فقہِ حنفی کے مؤقف کی تائید کرتے ہیں اور مخالف آراء کا علمی جواب دیتے ہیں، اسی بنا پر یہ کتاب فقہِ حنفی کے استدلالی منہج کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ماخذ

تصور کی جاتی ہے۔

البتہ اہلِ علم نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ بعض مقامات پر امام جصاص رحمہ اللہ فقہی مناظرات اور مذہبی اختلافات میں خاصا توسع اختیار کرتے ہیں، جس سے بحث اصل آیت کے مفہوم سے آگے بڑھ جاتی ہے، اسی طرح بعض مسائل میں ان کا فقہی رجحان استدلال کے انداز پر اثر انداز ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے، بعض عقائدی مباحث میں بھی ان پر معتزلی فکر کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے، خصوصاً صفاتِ باری تعالیٰ، رؤیتِ باری تعالیٰ اور سحر جیسے موضوعات میں ان کی بعض آراء اہلِ سنت کے جمہور موقف سے مختلف سمجھی گئی ہیں، ان پہلوؤں کی بنا پر محققین اس کتاب سے استفادہ کرتے وقت علمی احتیاط کی تلقین کرتے ہیں۔

ان تمام مباحث کے باوجود احکام القرآن فقہی تفسیر کی ایک نہایت بلند پایہ، وقیع اور مؤثر تصنیف ہے، آیاتِ احکام سے فقہی استنباط، اصولی استدلال اور مختلف فقہی مذاہب کے دلائل کے تقابلی مطالعے میں اس کا مقام نہایت بلند ہے، اسی لیے یہ کتاب آج بھی فقہ، اصولِ فقہ اور تفسیر کے طلبہ و محققین کے لیے بنیادی مراجع میں شمار کی جاتی ہے۔

تفسیر القرآن الحکیم یعنی تفسیر المنار

سید محمد رشید رضا (۱۸۶۵ء–۱۹۳۵ء) شام کے شہر طرابلس میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، علامہ جمال الدین افغانی رحمہ اللہ اور خصوصاً شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ کی اصلاحی تحریک سے بے حد متاثر ہوئے، قاہرہ جاکر شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور ان کے افکار کے سب سے نمایاں شارح و مبلغ بن گئے، انہوں نے رسالہ المنار جاری کیا، جس کے ذریعے اصلاحِ امت، دینی بیداری اور قرآنی فکر کو عام کیا۔

تفسیر المنار کی تالیف: شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ جامعہ ازہر میں قرآن کے جو دروس دیتے تھے، سید رشید رضا رحمہ اللہ انہیں قلم بند کرتے، پھر استاذ کی نظرِ ثانی کے بعد رسالہ المنار میں شائع کرتے، بعد میں یہی مضامین تفسیر المنار کے نام سے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئے، شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد سید

رشید رضا رحمہ اللہ نے اسی اسلوب پر تفسیر کو آگے بڑھایا، لیکن سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۱ تک پہنچ کر ان کی وفات ہوگئی، اس لیے تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔

منہج اور خصوصیات: تفسیر المنار کا بنیادی مقصد قرآن کی ہدایت، اصلاحِ معاشرہ اور عملی زندگی میں رہنمائی کو نمایاں کرنا ہے، اس میں قرآن کی تفسیر، قرآن، صحیح سنت اور آثارِ سلف کی روشنی میں کی گئی ہے، اسرائیلی روایات، ضعیف احادیث اور غیر ضروری فلسفیانہ و کلامی مباحث سے اجتناب کیا گیا، جدید دور کے سماجی، سیاسی، اخلاقی اور فکری مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی، قرآن کے معانی کو سادہ، مؤثر اور عقلی انداز میں پیش کیا گیا۔

علمی رجحانات: شیخ رشید رضا رحمہ اللہ نے اپنے استاذ کی نسبت زیادہ وسعت کے ساتھ صحیح احادیث، فقہی مباحث اور معاشرتی مسائل پر گفتگو کی، تاہم بعض مقامات پر انہوں نے ایسی آراء اختیار کیں جن سے جمہور اہلِ سنت نے اختلاف کیا، مثلاً: بعض کبیرہ گناہوں کے مرتکب کے انجام کے بارے میں سخت موقف، بعض معجزات کی غیر روایتی تعبیر، سحر، جنات اور بعض غیبی امور کی عقلی توجیہ، بعض فقہی مسائل میں جمہور کے برخلاف اجتہادی رائے۔

علمی حیثیت: ان اختلافی آراء کے باوجود تفسیر المنار جدید اصلاحی تفاسیر میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے قرآن کو محض علمی مباحث کی کتاب نہیں، بلکہ امت کی اصلاح، فکری بیداری اور عملی زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ بنا کر پیش کیا، اسی وجہ سے یہ تفسیر جدید دور کی مؤثر اور بااثر تفسیری تصانیف میں شمار کی جاتی ہے، بندہ عاجز نے متنازعہ واختلافی مقامات سے صرف نظر کرتے ہوئے قابل قبول مقامات سے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں استفادہ کیا ہے۔

تفسیر المراغی

شیخ محمد مصطفیٰ المراغی (۱۸۸۱ء–۱۹۴۵ء) عصرِ حاضر کے ممتاز مصلح، عالمِ دین اور جامعہ ازہر کے شیخ تھے، وہ اصلاحی مکتبِ فکر کے نمایاں نمائندوں میں شمار ہوتے ہیں اور شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ کے افکار سے گہرا اثر قبول کیا، انہوں نے ازہر میں اصلاح، اجتہاد، تجدیدِ فکر اور قرآن کی عملی تعلیم کو فروغ

دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

تفسیری خدمات: شیخ المراغی رحمہ اللہ نے عوام اور طلبہ کے لیے قرآنِ کریم کے تفسیری دروس دیے، جو بعد میں تفسیر المراغی کی بنیاد بنے، ان دروس میں اگرچہ ابتدا میں قرآن کے چند منتخب مقامات کی تشریح کی گئی، لیکن بعد میں انہوں نے مکمل قرآن کی تفسیر تصنیف کی، جو آج تفسیر المراغی کے نام سے معروف اور متداول ہے۔

منہج و خصوصیات: تفسیر المراغی کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں، قرآن کی ہدایات کو آسان، سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرنا، اصلاحِ معاشرہ، اخلاق، دعوت اور تربیت پر خصوصی توجہ دینا، غیر ضروری فلسفیانہ، کلامی اور لغوی مباحث سے اجتناب کرنا، جدید دور کے سماجی اور فکری مسائل کو قرآن کی روشنی میں واضح کرنا، اعتدال، اجتہاد اور عملی رہنمائی کو نمایاں رکھنا۔

علمی اہمیت: تفسیر المراغی جدید دور کی مقبول اصلاحی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، اس میں قرآن کے پیغام کو عام مسلمانوں کی زندگی سے جوڑنے، اسلامی تعلیمات کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق واضح کرنے اور دینی بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، یہی خصوصیات اس تفسیر کو جدید عربی تفاسیر میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں، بندہ عاجز و فقیر نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں تفسیر المراغی سے بھی خوب استفادہ کیا ہے۔

تفسیر فتح القدیر

امام محمد بن علی شوکانی (۱۱۷۳ھ۔۱۲۵۰ھ) یمن کے عظیم محدث، مفسر، فقیہ اور مجتہد تھے، ابتدائی تعلیم صنعاء میں حاصل کی اور فقہِ زیدی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد تقلید کو ترک کر کے اجتہاد کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے حدیث، فقہ، تفسیر اور اصولِ دین میں متعدد اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں فتح القدیر اور نیل الأوطار خاص طور پر مشہور ہیں۔ عقائد میں وہ سلف کے منہج کے پیرو تھے اور صفاتِ الٰہی کے باب میں بلا تاویل سلفی موقف اختیار کرتے تھے۔

فتح القدیر تفسیر کی جامع اور معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ

ہے کہ اس میں تفسیر بالمأثور (روایت) اور تفسیر بالرأی (درایت) دونوں کو یکجا کیا گیا ہے، امام شوکانی رحمہ اللہ نے سابقہ مفسرین، خصوصاً طبری، قرطبی، زمخشری، ابن عطیہ اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ سے استفادہ کرتے ہوئے ایک متوازن اور تحقیقی تفسیر پیش کی۔

منہج و خصوصیات: تفسیر فتح القدیر کی اہم ترین خصوصیات میں سے یہ ہیں، قرآن کی آیات کی لغوی، نحوی اور بلاغی تشریح کی گئی ہے، صحیح احادیث، آثارِ صحابہ و تابعین اور سلف کے اقوال سے استدلال کیا گیا ہے، مختلف فقہی مذاہب کے اقوال اور دلائل ذکر کرکے راجح قول اختیار کیا گیا ہے، قراءات، لغت اور استنباطِ احکام پر بھی مناسب گفتگو کی گئی ہے، مؤلف نے روایت اور درایت کے امتزاج کو اپنی تفسیر کا بنیادی اصول قرار دیا ہے، بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں بہت زیادہ نہیں تو کہیں کہیں اس تفسیر سے بھی مواد شامل کیا ہے، لیکن ضرورت کے درجہ میں۔

تنقیدی جائزہ: اس تفسیر کی علمی قدر بہت بلند ہے، تاہم بعض اہلِ علم نے یہ نشاندہی کی ہے کہ امام شوکانی نے بعض مقامات پر ضعیف یا موضوع روایات نقل کی ہیں، اگرچہ اکثر ان پر اعتماد نہیں کیا، اسی طرح تقلید کے مسئلے میں انہوں نے شدید تنقید کی ہے اور اجتہاد کی بھرپور حمایت کی ہے، جس پر بعض علماء نے اختلاف کیا ہے۔

علمی مقام: ان چند قابلِ نقد پہلوؤں کے باوجود فتح القدیر جامعیت، تحقیق، روایت و درایت کے حسین امتزاج اور فقہی استنباط کی وجہ سے تفسیر کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور آج بھی اہلِ علم کے نزدیک نہایت معتبر اور قابلِ استفادہ مراجع میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی

علامہ شہاب الدین محمود آلوسی رحمہ اللہ (۱۲۱۷ھ۔۔۱۲۷۰ھ) بغداد کے عظیم مفسر، محدث اور فقیہ تھے، غیر معمولی ذہانت، وسیع مطالعہ اور قوی حافظے کی بدولت اپنے عہد کے ممتاز عالم بنے، منصبِ افتاء پر فائز رہے اور تدریس و تصنیف کے ذریعے علمی خدمات انجام دیں۔

ان کی شہرۂ آفاق تصنیف روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی ہے، جس کی تالیف میں

تقریباً پندرہ سال صرف ہوئے، یہ تفسیر سابقہ تفاسیر کا جامع خلاصہ ہے، جس میں تفسیرِ بالماثور، لغت، نحو، بلاغت، فقہی مباحث، قراءات اور علمی تحقیقات کو یکجا کیا گیا ہے، بعض مقامات پر صوفیانہ اشارات بھی ذکر کیے گئے ہیں، تاہم مجموعی طور پر یہ اہلِ علم کے نزدیک ایک مستند اور انسائیکلوپیڈیائی تفسیر شمار ہوتی ہے۔

میرے دادا پیر حضرت حکیم اختر رحمہ اللہ نے خزائن العرفان کے نام تفسیری مواد جمع کیا ہے، جس میں اکثر و بیشتر حوالہ جات روح المعانی کے دیے ہیں، ان کے مواعظ حسنہ میں بھی روح المعانی سے استفادے کی ترغیب دی گئی ہے، بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں روح المعانی سے استفادہ کیا ہے، کوئی شک نہیں کہ انتہائی لاجواب اور خوبصورت تفسیر ہے، جسے دل کی آنکھوں سے دیکھنا، دل کے کانوں سے سننا اور دل و دماغ کی گہرائیوں سے مطالعہ کرنا چاہیے، اللہ ہمیں ان علمی سرمایوں سے استفادے کی کماحقہ توفیق عطا کرے۔ آمین

تفسیر المظہری

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ (۱۱۴۳ھ۔۱۲۲۵ھ) برصغیر کے جلیل القدر محدث، فقیہ اور مفسر تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، جب کہ شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ انہیں ''بیہقی عصر'' کہا کرتے تھے، نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے اور پوری زندگی تدریس، افتاء اور تصنیف میں گزاری۔

ان کی معروف تصنیف تفسیر المظہری ہے، جو روایت و درایت کا حسین امتزاج ہے، اس میں صحیح احادیث، فقہی دلائل، سلف کے اقوال اور عقائدِ اہلِ سنت کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے، خصوصاً آیاتِ احکام کی تشریح میں یہ تفسیر نہایت مضبوط اور قابلِ اعتماد مانی جاتی ہے، اسی لیے برصغیر میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تفسیر مظہری کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، بندہ ناچیز نے اپنی معارف الفرقان تفسیر کے لیے کچھ مواد مظہری سے بھی لیا ہے، جہاں مواد کسی دوسری تفسیر میں دکھائی نہیں دیا وہاں تلاش کرنے سے مجھے وہ مواد مظہری میں مل گیا، پھر اسے میں نے مظہری کے حوالہ سے نقل کر دیا۔

التفسیر الوسیط للقرآن الکریم

شیخ محمد سید طنطاوی (۱۹۲۸ء تا ۲۰۱۰ء) مصر کے معروف مفسر، فقیہ اور شیخ الازہر تھے، انہوں نے جامعہ ازہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، تدریس، افتاء اور انتظامی مناصب پر خدمات انجام دیں، اور ۱۹۹۶ء سے وفات تک شیخ الازہر رہے۔

ان کی اہم ترین تصنیف التفسیر الوسیط للقرآن الکریم ہے، جو پندرہ سے زائد جلدوں پر مشتمل ہے، اس تفسیر میں پہلے الفاظ کی لغوی تشریح، پھر سببِ نزول، اجمالی مفہوم، بلاغی نکات، فقہی مسائل، اخلاقی ہدایات اور عملی رہنمائی نہایت آسان اور رواں انداز میں بیان کی گئی ہے، مصنف نے ضعیف روایات اور غیر مستند اقوال سے حتیٰ الامکان اجتناب کیا اور قرآن کی ہدایات کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ شیخ طنطاوی رحمہ اللہ کی بعض فقہی وسیاسی آراء، خصوصاً بینک کے سود، حجاب اور بعض حکومتی فیصلوں سے متعلق فتاویٰ پر علمی حلقوں میں تنقید بھی کی گئی، تاہم ان کی التفسیر الوسیط اپنے سادہ، معتدل اور تحقیقی اسلوب کے باعث معاصر تفاسیر میں نمایاں مقام رکھتی ہے، بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان کے لیے شیخ طنطاوی رحمہ اللہ کی کتاب سے کماحقہ استفادہ کیا ہے، بندہ ناچیز شیخ طنطاوی رحمہ اللہ کی بعض دوسری علمی تصانیف کے باعث ان کے ساتھ عقیدت رکھتا ہے، اسی عقیدت کے پیش نظر میں نے ان کے علمی فیضان سے لطف اٹھایا ہے۔

اللباب فی علوم الکتاب

امام ابو حفص سراج الدین عمر بن علی بن عادل الحنبلی الدمشقی، المعروف ابن عادل رحمہ اللہ، آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر مفسر، محدث اور فقیہ تھے، ان کی ولادت اور وفات کی قطعی تاریخ محفوظ نہیں، تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ۶۷۵ھ کے بعد پیدا ہوئے اور غالباً ۷۷۵ھ سے پہلے وفات پاگئے، انہوں نے دمشق کے علمی ماحول میں پرورش پائی اور محمد بن علی بن

ساعد رحمہ اللہ، وزیرہ بنت عمر بن المنجّی رحمہ اللہ اور ابن الشحنہ رحمہ اللہ جیسے نامور اساتذہ سے علم حاصل کیا، فقہ میں وہ حنبلی اور عقائد میں اہلِ سنت والجماعت کے ترجمان تھے، ان کی نسبت "النعمانی" غالب گمان کے مطابق صحابیٔ رسول حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی طرف ہے، اگرچہ ان کی سوانحی معلومات محدود ہیں، لیکن ان کی علمی عظمت ان کی شہرۂ آفاق تفسیر اللباب فی علوم الکتاب سے پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

اللباب فی علوم الکتاب قرآنِ کریم کی جامع، مفصل اور انسائیکلوپیڈیائی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، جس کے مصنف امام ابن عادل حنبلی رحمہ اللہ ہیں، اس تفسیر میں تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے کے ساتھ قراءات، لغت، نحو، صرف، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ، علمِ کلام، اسبابِ نزول، ناسخ و منسوخ اور احادیث و آثار جیسے متعدد علوم کو یکجا کیا گیا ہے۔

مصنف نے سابقہ مفسرین، خصوصاً الدر المصون اور دیگر معتبر تفاسیر سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اقوال کا تقابلی جائزہ لیا، دلائل کی روشنی میں راجح موقف اختیار کیا اور قرآنی آیات کی علمی و تحقیقی تشریح پیش کی، اپنے جامع اسلوب، علمی استدلال اور وسعتِ معلومات کے باعث اللباب فی علوم الکتاب اہلِ علم کے نزدیک تفسیرِ قرآن کا ایک نہایت اہم اور مستند ماخذ تصور کی جاتی ہے، بندہ ناچیز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں اللباب کی علمی سوغات بھی اپنے پڑھنے والوں کی نذر کی ہیں، چونکہ یہ بہت ہی علمی اور تفصیلی مواد پر مشتمل تفسیر ہے اس لیے اس کے مضامین کو زیادہ تر درخور اعتناء نہیں سمجھا، البتہ جو مواد ان کا لیا گیا وہ بہت خوب ہے۔

انوار التنزیل واسرار التاویل المعروف تفسیر البیضاوی

امام ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بن محمد البیضاوی (متوفی ۶۹۱ھ ۱۲۹۲ء) ساتویں صدی ہجری کے نامور مفسر، اصولی، فقیہ اور قاضی تھے، آپ ایران کے شہر بیضاء (قریب شیراز) میں پیدا ہوئے اور بعد میں شیراز کے منصبِ قضا پر فائز رہے، آپ زہد، تقویٰ، عبادت گزاری اور علمی وجاہت میں ممتاز تھے، جس کی بنا پر علماء نے آپ اور آپ کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

فقہ و اصول میں آپ کی مشہور تصنیف منہاج الوصول اور تفسیر میں أنوار التنزیل وأسرار التأویل علمی دنیامیں غیر معمولی شہرت رکھتی ہیں، آپ نے زمخشری اور فخر الدین رازی کی تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے نہایت محققانہ انداز میں اپنی تفسیر مرتب کی، جس میں اعتزالی افکار کی اصلاح بھی کی، آپ کا انتقال تبریز میں ۶۹۱ھ میں ہوا۔

أنوار التنزیل وأسرار التأویل، جو عام طور پر تفسیر بیضاوی کے نام سے معروف ہے، قرآنِ کریم کی مختصر مگر نہایت جامع اور علمی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، یہ تفسیر بنیادی طور پر الکشاف اور مفاتیح الغیب کا عمدہ خلاصہ ہے، تاہم مصنف نے ان دونوں سے صرف نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متعدد مقامات پر علمی تنقید، اصلاح اور اپنے تحقیقی اضافے بھی کیے ہیں، اس میں لغت، نحو، بلاغت، قراءات، فقہی مسائل اور عقائدِ اہلِ سنت کو نہایت اختصار اور گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اسی جامعیت اور علمی معیار کی وجہ سے صدیوں تک مدارسِ اسلامیہ میں یہ تفسیر درسِ نظامی کا اہم حصہ رہی اور اس پر متعدد حواشی و شروح لکھی گئیں۔

بندہ ناچیز نے عہد طالب علمی میں تفسیر بیضاوی کا نام سنا تھا، یہ تفسیر دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل ہے، یہ نہائی درجات میں باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے، طلباء کرام کو اس کا مطالعہ کروایا جاتا ہے، دینی مدارس کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات میں باقاعدہ اس کا پرچہ لیا جاتا ہے، بندہ نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں بیضاوی سے بھی استفادہ کیا ہے، اس کی ایک عربی شرح بھی ناچیز نے طالب علمی کے زمانہ میں ترکی سے منگوائی تھی، جو اگرچہ دیکھنے کا موقع ہنوز میسر نہیں آیا لیکن ماشاء اللہ بہت باکمال شرح ہے، ہمارے استاذ شیخ موسیٰ روحانی بازی رحمہ اللہ کے نیک عزائم میں بیضاوی کی ۵۲ جلدوں پر شرح لکھنے کا عزم تھا مگر زندگی نے وفا نہیں کی، ان کی حیات میں بیضاوی کا مقدمہ اثمار التکمیل کے نام سے شائع ہوا تھا، جو اپنی مثال آپ ہے، اس کے بعد ابھی تک کوئی اور جلد منصہ شہود پر نہیں آئی۔

تفسیر جلالین

تفسیر جلالین دو عظیم علماء کی مشترکہ علمی کاوش ہے، اس کا آغاز امام جلال الدین محمد بن احمد المحلی الشافعی (۷۹۱–۸۶۴ھ) نے کیا، جو مصر کے جلیل القدر مفسر، اصولی اور فقیہ تھے، آپ اپنی ذہانت، حق گوئی اور زہد وورع کے لیے مشہور تھے، منصبِ قضاء کی پیشکش کے باوجود اسے قبول نہیں کیا، آپ نے تفسیر کا آغاز سورۂ کہف سے کیا، لیکن تکمیل سے قبل وفات پاگئے، بعد ازاں آپ کے شاگرد امام جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر السیوطی (۸۴۹–۹۱۱ھ) نے سورۂ فاتحہ سے سورۂ اسراء تک کی تفسیر لکھ کر اس شاہکار کو مکمل کیا، جس کی وجہ سے یہ تفسیر تفسیر جلالین کے نام سے معروف ہوئی۔

تفسیر الجلالین اپنے اختصاراور اپنی سلاست اور جامعیت کے باعث عالمِ اسلام کی مقبول ترین تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، اس میں قرآنِ کریم کے الفاظ وتراکیب کی نہایت آسان اور مختصر وضاحت کی گئی ہے، جبکہ غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کیا گیا ہے، مصنفین نے تفسیر بالمأثور، لغوی تحقیق، نحوی نکات اور معتبر اقوال کو نہایت سادہ انداز میں پیش کیا ہے، جس سے یہ تفسیر طلبہ، اساتذہ اور عام اہلِ علم سب کے لیے یکساں مفید بن گئی ہے، اسی وجہ سے صدیوں سے مدارسِ اسلامیہ میں یہ تفسیر بنیادی نصاب کا حصہ چلی آرہی ہے اور اس پر متعدد شروح وحواشی تحریر کیے گئے ہیں۔

بندہ عاجز نے اپنے زمانہ طالب علمی سے اس تفسیر کا نام سن رکھا ہے، یہ تفسیر بھی نہائی درجات کے دینی طلباء کو سبقاسبقًا پڑھائی جاتی ہے، بندہ ناچیز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں جلالین سے بھی خوب استفادہ کیا ہے، یہ تفسیر دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

تفسیر روح البیان

امام ابو الفداء اسماعیل حقی بن مصطفیٰ الاستانبولی الحنفی الخلوتی (متوفی ۱۱۲۷ھ ۱۷۵۱ء) سلطنتِ عثمانیہ کے مشہور مفسر، صوفی، واعظ اور ادیب تھے، آپ کی ولادت آیدوس میں ہوئی، پھر قسطنطنیہ (استنبول) میں قیام کیا اور بعد ازاں بروصہ میں سکونت اختیار کی، آپ سلسلۂ خلوتیہ کے ممتاز شیخ تھے

اور تصوف و سلوک میں بلند مقام رکھتے تھے، آپ نے عربی اور ترکی زبانوں میں متعدد علمی و تصوفی کتابیں تصنیف کیں، جن میں روح البیان فی تفسیر القرآن، الرسالۃ الخلیلیۃ اور الفروقات خاص طور پر معروف ہیں، آپ کا انتقال ۱۱۲۷ھ میں بروصہ میں ہوا۔

روح البیان فی تفسیر القرآن تصوفی رنگ کی جامع اور مشہور تفسیر ہے، جس میں قرآنِ کریم کی ظاہری تشریح کے ساتھ اس کے باطنی، روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے، مصنف نے تفسیر بالمأثور، لغوی و فقہی مباحث، صوفیاء کے اقوال، اخلاقی نصائح اور عرفانی اشارات کو حسین انداز میں یکجا کیا ہے۔

اس تفسیر میں قرآنی آیات سے تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن، محبتِ الٰہی اور سلوک کے مضامین پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، تاہم اس میں بعض ضعیف روایات اور صوفیانہ اشارات بھی موجود ہیں، اس لیے اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے وقت تحقیقی احتیاط کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس کے باوجود روح البیان تصوفی تفاسیر میں ایک نمایاں اور نہایت مقبول مقام رکھتی ہے، معارف الفرقان کے ناظرین جگہ جگہ روح البیان کے روح پرور مضامین بھی ملاحظہ کر سکیں گے۔

تفسیر القشیری (لطائف الإشارات)

امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری النیشاپوری رحمہ اللہ (۳۷۶۔۴۶۵ھ) پانچویں صدی ہجری کے عظیم مفسر، محدث، صوفی اور شافعی فقیہ تھے، آپ خراسان کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے اور زہد، تقویٰ، علم اور تصوف میں غیر معمولی مقام رکھتے تھے، آپ کی تمام تر علمی زندگی نیشاپور میں گزری، جہاں آپ نے تدریس و تصنیف کے ذریعے علمی خدمات انجام دیں، سلجوقی سلطان الپ ارسلان بھی آپ کا بے حد احترام کرتا تھا، آپ کی مشہور تصانیف میں الرسالۃ القشیریۃ، التیسیر فی التفسیر اور لطائف الإشارات شامل ہیں، آپ کا انتقال ۴۶۵ھ میں نیشاپور میں ہوا۔

لطائف الإشارات امام قشیری رحمہ اللہ کی مشہور صوفیانہ تفسیر ہے، جس میں قرآنِ کریم کے ظاہری معانی کے ساتھ اس کے روحانی، اخلاقی اور اشاری مضامین کو نہایت لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے،

مصنف نے تفسیر بالمأثور کو بنیاد بناتے ہوئے اہلِ تصوف کے اقوال، تزکیۂ نفس، سلوک اور معرفتِ الٰہی کے نکات کو بھی شامل کیا ہے، اس تفسیر میں شریعت اور طریقت کے درمیان توازن برقرار رکھا گیا ہے، اسی لیے اسے معتدل صوفیانہ تفاسیر میں نمایاں مقام حاصل ہے اور اہلِ علم و تصوف میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان کے ان مقامات کے لیے جن میں تصوف، تقویٰ، طہارت، للّٰہیت اور خداخوفی کے مضامین کا اندراج ضروری تھا تفسیر القشیری کی طرف ہی رجوع کیا ہے، اس کی جھلک جگہ جگہ دیکھنے والوں کی دکھائی دے گی۔

اِرشاد العقل السلیم اِلی مزایا الکتاب الکریم

امام محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی، المعروف ابو السعود (۸۹۸–۹۸۲ھ)، سلطنتِ عثمانیہ کے نامور مفسر، مفتی اور فقیہ تھے، آپ کی ولادت قسطنطنیہ (استنبول) کے نواح میں ایک علمی خاندان میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد اور دیگر ممتاز علماء سے حاصل کی، پھر تدریس، قضاء اور افتاء کے مناصب پر فائز ہوئے، تقریباً تیس برس تک منصبِ شیخ الاسلام پر خدمات انجام دیں اور اپنے علم، فصاحت اور فقاہت کی بدولت پورے عالمِ اسلام میں شہرت حاصل کی، آپ کا انتقال ۹۸۲ھ میں ہوا اور آپ کو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کے قریب استنبول میں دفن کیا گیا۔

اِرشاد العقل السلیم اِلی مزایا الکتاب الکریم، جسے عموماً تفسیر ابی السعود کہا جاتا ہے، بلاغت، فصاحت اور ادبی نکات کے اعتبار سے نہایت ممتاز تفسیر ہے، اس میں مصنف نے قرآنی آیات کے نحوی، لغوی، بلاغی اور تفسیری پہلوؤں کو نہایت دقیق علمی انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ تفسیر خصوصاً تفسیر بیضاوی اور الکشاف سے متاثر ہے، لیکن مصنف نے اپنی مستقل تحقیقات اور عمدہ اسلوب کے ذریعے اسے منفرد مقام عطا کیا ہے، اہلِ علم کے نزدیک یہ عربی ادب اور بلاغت کے طالب علموں کے لیے نہایت اہم علمی ماخذ شمار ہوتی ہے، بندہ عاجز و مسکین نے اپنی تفسیر معارف الفرقان کے سنہری اوراق کو ارشاد السلیم الی مزایا الکتاب الکریم کی نورانی عبارات و مضامین سے مزین

کیا ہے، جس کی جھلک ناظرین کو جگہ جگہ دکھائی دے گی۔

لباب التأویل فی معانی التنزیل تفسیر خازن

امام ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم الشیحی، المعروف الخازن (۶۷۸–۷۴۱ھ)، آٹھویں صدی ہجری کے معروف محدث، مفسر اور مؤرخ تھے، آپ کی ولادت بغداد میں ہوئی، اصل وطن حلب تھا، جبکہ علمی زندگی کا بڑا حصہ دمشق میں گزرا، دمشق کی ایک عظیم لائبریری کے خازن (نگران) ہونے کی وجہ سے "الخازن" کے لقب سے مشہور ہوئے، اس علمی ماحول نے انہیں تحقیق و تصنیف کے وسیع مواقع فراہم کیے، آپ کی نمایاں تصانیف میں لباب التأویل فی معانی التنزیل اور مقبول المنقول شامل ہیں، آپ کا انتقال ۷۴۱ھ میں حلب میں ہوا۔

لباب التأویل فی معانی التنزیل ایک متوسط حجم کی معروف تفسیر ہے، جسے امام خازن نے بنیادی طور پر تفسیر البغوی کا خلاصہ بنا کر مرتب کیا، تاہم اس میں تاریخی واقعات، انبیاء علیہم السلام کے قصص اور متعدد علمی فوائد کا اضافہ بھی کیا، اس تفسیر کی زبان نہایت آسان اور اسلوب عام فہم ہے، جس کی وجہ سے اسے عوام اور طلبہ میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی، تاہم اس میں بعض اسرائیلی روایات اور غیر مستند تاریخی حکایات بھی شامل ہوگئی ہیں، اس لیے اہلِ تحقیق ان سے استفادہ کرتے وقت احتیاط کی تلقین کرتے ہیں، اس کے باوجود یہ تفسیر اپنی جامعیت، سادگی اور علمی افادیت کے باعث اسلامی تفسیری لٹریچر میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان

شیخ عبد الرحمن بن ناصر السعدی (۱۳۰۷–۱۳۷۶ھ) سعودی عرب کے ممتاز مفسر، فقیہ، محدث اور مربی تھے، آپ کی ولادت قصیم میں ہوئی، کم عمری میں والد کے انتقال کے باوجود آپ نے نہایت محنت سے علومِ دینیہ حاصل کیے، قرآن کریم حفظ کیا اور اپنے زمانے کے ممتاز علماء سے استفادہ کیا، بعد ازاں تدریس، افتاء اور تصنیف میں نمایاں مقام حاصل کیا اور بے شمار علماء آپ کے شاگرد بنے، آپ

کی تصانیف میں تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان، تیسیر اللطیف المنان اور عقیدہ و فقہ کی متعدد کتابیں شامل ہیں، آپ کی تحریروں کا نمایاں وصف سادگی، تحقیق اور غیر مستند روایات سے اجتناب ہے، جس کی وجہ سے وہ عصرِ حاضر کے معتبر علماء میں شمار ہوتے ہیں۔

تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان عصرِ حاضر کی نہایت مقبول اور عام فہم تفاسیر میں سے ایک ہے، اس میں مصنف نے قرآنِ کریم کی آیات کی تشریح قرآن، سنت اور سلفِ صالحین کے فہم کی روشنی میں نہایت آسان، سادہ اور مؤثر انداز میں کی ہے، تفسیر میں عقیدہ، فقہ، اخلاق، تربیت اور دعوتی نکات کو اعتدال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جبکہ غیر مستند اسرائیلی روایات، فلسفیانہ موشگافیوں اور غیر ضروری اختلافات سے اجتناب کیا گیا ہے، اپنی سلاست، اختصار اور علمی اعتماد کے باعث یہ تفسیر جدید دور میں طلبہ، علماء اور عام قارئین کے لیے یکساں مفید سمجھی جاتی ہے۔

تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر

امام ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد ابن الجوزی رحمہ اللہ (۵۰۸–۵۹۷ھ) چھٹی صدی ہجری کے عظیم محدث، مفسر، مورخ، فقیہ، واعظ اور ادیب تھے، آپ بغداد میں پیدا ہوئے اور اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں، قوتِ حافظہ اور خطابت کی وجہ سے "شیخ الاسلام" اور "عالمِ عراق" کے لقب سے مشہور ہوئے، آپ کے وعظ کی مجالس میں خلفاء، وزراء، علماء اور ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے، آپ نے دو سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جن میں زاد المسیر فی التفسیر، المنتظم، الموضوعات، جامع المسانید اور المغني فی علوم القرآن خاص طور پر معروف ہیں، آپ کا انتقال ۵۹۷ھ میں بغداد میں ہوا۔

زاد المسیر في علم التفسیر ایک جامع مگر متوسط حجم کی تفسیر ہے، جس میں امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے سلفِ صالحین سے منقول اقوال کو نہایت منظم انداز میں جمع کیا ہے، مصنف نے مختلف تفسیری آراء، لغوی مباحث، اسبابِ نزول، قراءات اور فقہی نکات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا اور جہاں متعدد اقوال موجود ہوں وہاں ان کا تقابلی جائزہ پیش کر کے راجح قول کی نشاندہی کی ہے، یہ تفسیر اپنے تحقیقی اسلوب، حسنِ ترتیب اور اختصار کے باعث اہلِ علم میں ہمیشہ مقبول رہی ہے اور اسے تفسیر بالمأثور اور

درایتی مباحث کے حسین امتزاج کی عمدہ مثال سمجھا جاتا ہے، بندہ کی تفسیر معارف الفرقان میں اہم ترین مقامات پر زادالمسیر کے حوالہ جات دکھائی دیں گے۔

تفسیر حدائق الروح والریحان فی روای علوم القرآن

شیخ محمد اَمین بن عبد اللہ الہرری (پیدائش ۱۳۴۸ھ) عصرِ حاضر کے ممتاز مفسر، محدث، شافعی فقیہ اور سلفی عالم ہیں، آپ کی ولادت حبشہ (ایتھوپیا) کے علاقے ہرر میں ہوئی اور ابتدائی عمر ہی سے قرآن، فقہ، حدیث، تفسیر، نحو، صرف، بلاغت اور دیگر علوم میں غیر معمولی محنت کی، متعدد جلیل القدر اساتذہ سے طویل عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تدریس کا آغاز کیا، جہاں سیکڑوں طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا۔ ۱۳۹۸ھ میں سعودی عرب ہجرت کی اور مکہ مکرمہ میں دار الحدیث الخیریہ اور مسجد الحرام میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ نے تفسیر، حدیث، نحو، صرف اور دیگر علوم میں متعدد وقیع تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں سب سے عظیم حدائق الروح والریحان في روابي علوم القرآن ہے۔

حدائق الروح والریحان فی روای علوم القرآن بتیس (۳۲) جلدوں پر مشتمل عصرِ حاضر کی ایک مفصل اور جامع تفسیر ہے، اس میں مصنف نے قرآنِ کریم کی آیات کی تشریح تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے کے معتدل اصولوں کے مطابق کی ہے، جبکہ لغت، نحو، صرف، بلاغت، قراءات، اسبابِ نزول، فقہی مسائل، حدیث، عقائد اور سلفِ صالحین کے اقوال کو نہایت تحقیق کے ساتھ جمع کیا ہے۔

اس تفسیر کا اسلوب علمی، استدلالی اور تحقیقی ہے اور مصنف نے قدیم وجدید تفسیری ذخیرے سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے متعدد علمی فوائد اور دقیق مباحث کو یکجا کیا ہے، اپنی جامعیت، وسعتِ معلومات اور تحقیقی انداز کے باعث یہ تفسیر عصرِ حاضر کے اہم ترین تفسیری مراجع میں شمار کی جاتی ہے، بندہ کی تفسیر معارف الفرقان کے اہم ترین مقامات پر اس تفسیر کا حوالہ اہل نظر کو دکھائی دے گا۔

تفسیر التحریر والتنویر

علامہ محمد الطاہر بن عاشور (۱۲۹۶–۱۳۹۳ھ:۱۸۷۹–۱۹۷۳ء) عصرِ حاضر کے عظیم مفسر، اصولی، فقیہ، مصلح اور ادیب تھے، آپ تیونس میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں جامع زیتونہ کے شیخ اور تیونس کے مالکی مفتیانِ کرام کے سربراہ مقرر ہوئے، آپ عربی زبان، مقاصدِ شریعت، فقہ، اصول، بلاغت اور تفسیر میں بلند مقام رکھتے تھے اور دمشق و قاہرہ کی عربی اکیڈمیوں کے رکن بھی رہے، آپ کی مشہور تصانیف میں التحریر والتنویر، مقاصد الشریعہ الإسلامیہ، أصول النظام الاجتماعی فی الإسلام اور موجز البلاغہ شامل ہیں، آپ کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز اسلامی مفکرین اور مفسرین میں ہوتا ہے۔

التحریر والتنویر عصرِ حاضر کی عظیم تحقیقی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، جس میں علامہ ابن عاشور نے قرآنِ کریم کی تفسیر کو مقاصدِ شریعت، بلاغت، زبان، معاشرت اور تمدنی پہلوؤں کے ساتھ نہایت گہرائی سے پیش کیا ہے، اس تفسیر میں لغوی، نحوی، بلاغی اور فقہی مباحث کے ساتھ قرآنی ہدایات کے اصلاحی اور تمدنی اثرات پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے، مصنف نے تقلید سے ہٹ کر تحقیق، اجتہاد اور مضبوط علمی استدلال کو اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ تفسیر جدید دور کے اہلِ علم اور محققین کے لیے ایک نہایت اہم علمی ماخذ سمجھی جاتی ہے، بندہ عاجز نے معارف الفرقان میں اس تفسیر کی طرف التفات نہیں کیا لیکن کسی کسی مقام پر استفادہ ضرور کیا ہے۔

تفسیر کبیر یعنی مفاتیح الغیب

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی رحمہ اللہ (۵۴۴–۶۰۶ھ:۱۱۵۰–۱۲۱۰ء) اسلامی تاریخ کے عظیم مفسر، متکلم، اصولی، فقیہ اور فلسفی تھے، آپ کی ولادت شہر رے میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سمیت اپنے دور کے نامور علماء سے حاصل کی، آپ نے تفسیر، علمِ کلام، اصولِ فقہ، فلسفہ، منطق، طب، فلکیات اور دیگر علوم میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، جس کے باعث دور دور سے طلبہ آپ

کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے تھے، آپ کی سب سے مشہور تصنیف مفاتیح الغیب ہے، جبکہ اصول، کلام اور فلسفہ میں بھی متعدد اہم کتابیں یادگار چھوڑیں، آپ کا انتقال ۶۰۶ھ میں ہوا اور بعض روایات کے مطابق آپ کی وفات زہر دیے جانے کے سبب ہوئی۔

مفاتیح الغیب، جو عموماً تفسیر کبیر کے نام سے معروف ہے، اسلامی دنیا کی سب سے مفصل اور علمی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، اس میں مصنف نے تفسیرِ قرآن کے ساتھ علمِ کلام، فلسفہ، منطق، اصولِ فقہ، بلاغت، فلکیات، طبیعیات اور دیگر عقلی علوم پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔

اس تفسیر کا نمایاں وصف علمی استدلال اور عقلی تجزیہ ہے، اگرچہ بعض مقامات پر فلسفیانہ اور کلامی مباحث اصل تفسیر سے زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود تفسیر کبیر اپنی وسعتِ معلومات، تحقیقی اسلوب اور دقیق علمی مباحث کی وجہ سے صدیوں سے اہلِ علم کے نزدیک ایک بنیادی تفسیری ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس تفسیر کے بارے میں بعض کور عقل یہ کہتے ہیں کہ اس میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں ہے، یہ بات بالکل ظلم کے مترادف ہے، بندہ نے کئی سال پہلے قرآن کریم کی آخری دس سورتوں کی تفسیر کی تھی، اس میں علامہ رازی کی اس تفسیر سے استفادہ کیا تھا، انتہائی خوبصورت مضامین پر مشتمل ہے، ایک ایک لفظ موتیوں کی مالا جیسا ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے الفاظ لکھے نہیں پروئے ہیں، ان کی تفسیر کی سطر سطر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، بندہ اس تفسیر کا بہت ہی شیدائی ہے، میں نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں جگہ جگہ تفسیر کبیر سے استفادہ کیا ہے۔

تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التأویل

امام حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ: ۱۳۱۰ء) آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی فقیہ، مفسر اور اصولی تھے، آپ کی نسبت نسف (ماوراء النہر) کی طرف ہے، اگرچہ آپ کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں، لیکن آپ نے اپنے دور کے نامور علماء، خصوصاً شمس الدین الکردری رحمہ اللہ اور احمد العتابی رحمہ اللہ سے علوم حاصل کیے، آپ زہد و تقویٰ، فقاہت اور تحقیق کے

اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے تھے، آپ کی اہم تصانیف میں مدارک التنزیل وحقائق التأویل، کنز الدقائق اور اصول و عقائد کی متعدد کتابیں شامل ہیں، آپ کا انتقال ۷۱۰ھ میں ایذج (قریب اصفہان) میں ہوا۔

مدارک التنزیل وحقائق التأویل ایک مختصر مگر جامع اور نہایت مقبول تفسیر ہے، جسے امام نسفی نے بنیادی طور پر تفسیر الکشاف اور تفسیر بیضاوی کی تلخیص و تہذیب کی صورت میں مرتب کیا، مصنف نے اعتزالی افکار سے اجتناب کرتے ہوئے اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کے مطابق قرآنِ کریم کی تشریح کی ہے، اس تفسیر میں لغوی، نحوی، بلاغی، فقہی اور تفسیری مباحث کو اختصار، سلاست اور تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اسی جامعیت، اعتدال اور سہل اسلوب کے باعث مدارک التنزیل برصغیر اور عالمِ اسلام کے مدارس میں صدیوں سے نصابی تفسیر کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، بندہ عاجز کی تفسیر معارف الفرقان میں امام نسفی کی مدارک التنزیل سے استفادہ کیا گیا ہے، جس کی جھلکیاں کہیں کہیں دکھائی دیں گی۔

زہرۃ التفاسیر

امام شیخ محمد ابو زہرہ (۱۳۱۵–۱۳۹۴ھ: ۱۸۹۸–۱۹۷۴ء) مصر کے نامور فقیہ، مفسر، اصولی، مفکر اور ماہرِ قانون تھے، آپ کی ولادت محلہ الکبریٰ (مصر) میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد جامع احمدی طنطا، مدرسۃ القضاء الشرعی اور دار العلوم سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، بعد ازاں جامعہ ازہر، کلیۂ حقوق اور دیگر علمی اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دیے، یہاں تک کہ کلیۂ حقوق کے شعبۂ شریعت کے سربراہ اور بعد میں مجمع البحوث الإسلامیۃ کے رکن منتخب ہوئے، آپ نے فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، سیرت، مذاہب اور قانونِ اسلامی پر تیس سے زائد وقیع کتابیں تصنیف کیں، جن میں زہرۃ التفاسیر، خاتم النبیین، تاریخ المذاہب الإسلامیہ، علم أصول الفقہ اور ائمۂ اربعہ کی سوانح پر لکھی گئی کتابیں خاص شہرت رکھتی ہیں، آپ اپنی علمی دیانت، حق گوئی، جرأتِ اظہار اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ کی مضبوط دعوت کے سبب بیسویں صدی کے ممتاز اسلامی مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔

زھرۃ التفاسیر شیخ محمد ابوزہرہ رحمہ اللہ کی قرآنِ کریم پر ایک علمی، فقہی اور اصلاحی تفسیر ہے، جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اس تفسیر میں مصنف نے قرآنِ کریم کی آیات کی تشریح قرآن وسنت، لغت، اسبابِ نزول اور معتبر تفسیری اقوال کی روشنی میں نہایت متوازن انداز سے کی ہے، اس کا نمایاں وصف یہ ہے کہ مصنف نے قرآنی تعلیمات کو عصرِ حاضر کے فکری، سماجی اور قانونی مسائل سے جوڑ کر پیش کیا ہے، فقہی آیات کی وضاحت میں مذاہبِ اربعہ کے اقوال کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے اور دلائل کی بنیاد پر راجح رائے اختیار کی گئی ہے، اسلوب نہایت سادہ، استدلالی اور اصلاحی ہے، جبکہ غیر مستند اسرائیلی روایات، غیر ضروری فلسفیانہ مباحث اور پیچیدہ علمی موشگافیوں سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے، معارف الفرقان میں جگہ جگہ زہرۃ التفاسیر سے استفادہ دکھائی دے گا، جس سے اہل علم وعرفان کو کئی گنا مسرت وشادمانی نصیب ہوگی۔

مصنف کے بعض اختلافی علمی رجحانات: شیخ محمد ابوزہرہ اگرچہ اہلِ سنت کے جلیل القدر عالم اور محقق تھے، تاہم بعض علمی مسائل میں ان کی آراء قدیم مفسرین اور فقہاء سے مختلف رہی ہیں، انہوں نے تقلیدِ جامد کے بجائے دلیل اور اجتہاد کو ترجیح دی، فقہی اختلافات میں راجح قول اختیار کرنے کی کوشش کی اور بعض روایتی آراء پر تنقیدی نظر ڈالی۔ سود (ربا) کے مسئلے میں انہوں نے نہایت دوٹوک مؤقف اختیار کرتے ہوئے اس کی ہر صورت کی شدید مخالفت کی، اسی طرح سیاسیاتِ اسلام، شوریٰ، نظامِ حکومت اور مصلحتِ شرعیہ کے مباحث میں انہوں نے اجتہادی انداز اپنایا اور یہ واضح کیا کہ شرعی مصلحت ہمیشہ نصوصِ شرعیہ کے تابع ہے، ان سے آزاد نہیں، بعض معاصر اہلِ علم نے ان کے چند اجتہادی آراء سے اختلاف کیا، لیکن مجموعی طور پر ان کی تفسیر اور علمی خدمات اعتدال، تحقیق اور مضبوط استدلال کی بنا پر اہلِ علم میں نہایت قدر ومنزلت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔

شیخ محمد ابوزہرہ رحمہ اللہ کی تفسیر کا امتیاز صرف اس کے علمی اسلوب میں نہیں، بلکہ ان کے تنقیدی اور اجتہادی منہج میں بھی نمایاں ہے، انہوں نے سابقہ مفسرین کی آراء کو محض نقل کرنے کے بجائے ان کا تحقیقی جائزہ لیا اور جہاں ضرورت محسوس کی وہاں دلائل کی روشنی میں ان پر حاشیہ آرائی اور تنقید

بھی کی، ان کے نزدیک قرآنِ کریم کی تفسیر کا اصل معیار خود قرآن، سنتِ صحیحہ، عربی زبان اور مقاصدِ شریعت ہیں، اس لیے انہوں نے اسرائیلی روایات، ضعیف و غیر مستند حکایات، بے بنیاد قصوں اور ایسی فلسفیانہ یا کلامی موشگافیوں سے اجتناب کیا جو قرآن کے اصل پیغام سے توجہ ہٹا دیتی ہیں۔

فقہی اختلافات میں بھی وہ کسی ایک مذہب کی جامد تقلید کے بجائے دلائل کی بنیاد پر راجح رائے اختیار کرتے ہیں اور جہاں قدیم مفسرین کی آراء نصوص یا مقاصدِ شریعت سے ہم آہنگ نہ معلوم ہوں وہاں احترام کے ساتھ ان پر نقد کرتے ہیں، اسی وجہ سے زہرۃ التفاسیر ایک تقلیدی تفسیر کے بجائے تحقیقی، اجتہادی اور عصری مسائل سے ہم آہنگ تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں مصنف نے قدیم تفسیری ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے جدید فکری چیلنجز کا بھی علمی اور متوازن جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

تفسیر فتح البیان فی مقاصد القرآن

علامہ نواب صدیق حسن خان القنوجی (۱۲۴۸–۱۳۰۷ھ: ۱۸۳۲–۱۸۹۰ء) برصغیر کے نامور محدث، مفسر، فقیہ، مؤرخ اور تحریکِ تجدیدِ اسلام کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی ولادت قنوج (ہندوستان) میں ہوئی، جبکہ اعلیٰ تعلیم دہلی میں حاصل کی، بعد ازاں بھوپال تشریف لے گئے، جہاں علمی و انتظامی خدمات انجام دیں اور ریاستِ بھوپال کی ملکہ سے شادی کے بعد "نواب عالی جاہ امیر الملک بہادر" کے لقب سے معروف ہوئے، آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں ساٹھ سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جن میں فتح البیان فی مقاصد القرآن، أبجد العلوم، نیل المرام من تفسیر آیات الأحکام، الروضۃ الندیۃ اور التاج المکلل خاص طور پر مشہور ہیں، آپ تحقیق، اتباعِ سنت اور تقلیدِ جامد سے اجتناب کے داعی تھے، جس کی جھلک ان کی علمی تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہے۔

فتح البیان فی مقاصد القرآن دس جلدوں پر مشتمل ایک جامع تفسیر ہے، جس میں علامہ صدیق حسن خان نے تفسیرِ قرآن کو قرآن، حدیثِ صحیح، آثارِ صحابہ و تابعین اور سلفِ صالحین کے اقوال کی

روشنی میں مرتب کیا ہے، مصنف نے لغوی، فقہی اور حدیثی مباحث کو اعتدال کے ساتھ بیان کیا ہے اور غیر مستند اسرائیلی روایات، ضعیف حکایات اور بے بنیاد اقوال سے حتیٰ الامکان اجتناب کیا ہے، یہ تفسیر اپنے تحقیقی اسلوب، سلفی منہج، دلائل پر اعتماد اور آسان اندازِ بیان کی وجہ سے برصغیر کی ممتاز تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور اہلِ علم کے لیے ایک اہم علمی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، بندہ کی تفسیر معارف الفرقان میں کہیں کہیں فتح البیان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

أضواء البیان في إیضاح القرآن بالقرآن

علامہ محمد الامین بن محمد المختار الشنقیطی (۱۳۲۵–۱۳۹۳ھ: ۱۹۰۷–۱۹۷۳ء) موریتانیہ کے نامور مفسر، فقیہ، اصولی اور محدث تھے، آپ کی ولادت شنقیط (موریتانیہ) میں ہوئی، جہاں ابتدائی و اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۶۷ھ میں حج کے لیے حجاز تشریف لائے اور پھر مدینہ منورہ، ریاض اور بالآخر اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ علمِ تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ اور عقیدہ میں بلند مقام رکھتے تھے، آپ کی مشہور تصانیف میں أضواء البیان في إیضاح القرآن بالقرآن، دفع إیہام الاضطراب عن آی الکتاب، منع جواز المجاز، منہج ودراسات لآیات الأسماء والصفات اور آداب البحث والمناظرۃ شامل ہیں، آپ کا انتقال ۱۳۹۳ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوا۔

أضواء البیان في إیضاح القرآن بالقرآن عصرِ حاضر کی نہایت ممتاز تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، جس کا بنیادی منہج قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنا ہے، علامہ شنقیطی رحمہ اللہ نے ایک آیت کی وضاحت دوسری آیات سے کرتے ہوئے قرآنی مضامین میں باہمی ربط کو نمایاں کیا ہے، اس کے ساتھ فقہی آیات، اصولی مباحث، لغوی نکات اور عقائدِ اہلِ سنت کو مضبوط دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مصنف نے ضعیف روایات، اسرائیلی قصوں اور غیر ضروری فلسفیانہ مباحث سے اجتناب کیا ہے، تفسیر سورۂ المجادلہ تک خود مصنف نے مکمل کی، جبکہ باقی حصے کو ان کے شاگرد شیخ عطیہ محمد سالم رحمہ اللہ نے اسی منہج پر مکمل کیا، یہ تفسیر اہلِ علم کے نزدیک تفسیرِ قرآن بالقرآن کی بہترین مثالوں میں

شمار ہوتی ہے، بندہ عاجز نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں کہیں کہیں اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن سے استفادہ کیا ہے۔

فی ظلال القرآن

سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن بیسویں صدی کی سب سے مؤثر اور مقبول تفاسیر میں شمار ہوتی ہے، یہ محض الفاظ کی تفسیر نہیں بلکہ قرآنِ کریم کے پیغام کو ایک زندہ تحریک، دعوت اور عملی نظامِ حیات کے طور پر پیش کرتی ہے، سید قطب نے اس تفسیر کا آغاز اپنے ادبی ذوق اور قرآنی تدبر کی بنیاد پر کیا، لیکن بعد میں جب انہیں قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اس کی بڑی مقدار جیل ہی میں مکمل کی، یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر میں روحانی تاثیر، دعوتی حرارت اور ظلم کے مقابلے میں استقامت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

اہم خصوصیات: یہ تفسیر قرآن کے حرکی (Dynamic) اور دعوتی پہلو کو نمایاں کرتی ہے، یعنی قرآن کو صرف مطالعہ کی کتاب نہیں بلکہ زندگی بدلنے والی کتاب کے طور پر پیش کرتی ہے، اس میں ادبی حسن، بلاغت اور قرآنی اسلوب کی خوبصورتی پر خاص توجہ دی گئی ہے، جس کی وجہ سے عربی ادب کے طلبہ بھی اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں، قرآن کی سورتوں اور آیات کے باہمی ربط (وحدتِ موضوع) کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، جدید جاہلیت، مادیت، استعمار اور غیر اسلامی نظاموں پر تنقیدی گفتگو اس تفسیر کا نمایاں وصف ہے، اس میں فقہی اختلافات کی تفصیلات نسبتاً کم اور تربیتی، ایمانی، فکری اور معاشرتی مباحث زیادہ ہیں۔

علمی حیثیت: یہ تفسیر دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر پڑھی گئی ہے اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں، بہت سے اہلِ علم اسے جدید دور کی بہترین دعوتی اور فکری تفاسیر میں شمار کرتے ہیں، جبکہ بعض علماء نے اس کے بعض اعتقادی، تفسیری اور سیاسی آراء پر علمی تنقید بھی کی ہے، خصوصاً اللہ تعالیٰ کی بعض صفات، بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں بعض تعبیرات اور مسئلۂ حاکمیت وغیرہ کے

مباحث میں، اس لیے اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد کی رائے یہ ہے کہ فی ظلال القرآن سے بھرپور علمی اور فکری استفادہ کیا جائے، لیکن جہاں اس کے بعض اجتہادی یا قابلِ نقد آراء ہوں، وہاں انہیں جمہور مفسرین اور اہلِ سنت کے مسلم اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے۔

مجموعی طور پر فی ظلال القرآن ایک ایسی تفسیر ہے جس نے جدید دور میں لاکھوں مسلمانوں کو قرآنِ کریم سے جوڑنے، اس کے پیغام کو عملی زندگی میں نافذ کرنے اور اسلامی فکر کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، اسی وجہ سے یہ عصرِ حاضر کی مؤثر اور مقبول تفاسیر میں ممتاز مقام رکھتی ہے، معارف الفرقان میں انقلاب انگیز آیات کے ذیل میں فی ظلال القرآن سے کہیں کہیں استفادہ کیا گیا ہے۔

محاسن التأویل (تفسیر قاسمی)

علامہ محمد جمال الدین القاسمی رحمہ اللہ (۱۲۸۳–۱۳۳۲ھ: ۱۸۶۶–۱۹۱۴ء) شام کے عظیم مفسر، محدث، مصلح، ادیب اور سلفی منہج کے ممتاز عالم تھے، آپ کی ولادت اور وفات دمشق میں ہوئی، آپ نے قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور عربی ادب میں گہری مہارت حاصل کی اور اصلاحِ دین، اتباعِ سنت اور ترکِ تقلید کی دعوت دی، بعض معاصرین نے ان کے اصلاحی افکار کی مخالفت بھی کی، تاہم آپ نے تصنیف و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کی تصانیف کی تعداد ستر سے زائد ہے، جن میں محاسن التأویل، قواعد التحدیث، موعظۃ المؤمنین، إصلاح المساجد من البدع والعوائد اور دلائل التوحید خاص طور پر معروف ہیں۔

محاسن التأویل، جو تفسیر قاسمی کے نام سے بھی مشہور ہے، سترہ جلدوں پر مشتمل ایک جامع، تحقیقی اور اعتدال پسند تفسیر ہے، علامہ قاسمی رحمہ اللہ نے اس میں سلفِ صالحین کی تفاسیر، خصوصاً طبری، ابن کثیر، بغوی، بیضاوی، رازی، آلوسی رحمہم اللہ اور دیگر معتبر مفسرین سے استفادہ کرتے ہوئے نہایت محققانہ انداز اختیار کیا ہے۔

اس تفسیر میں قرآن کی تفسیر قرآن، حدیثِ صحیح، آثارِ صحابہ، لغت، نحو، بلاغت اور فقہی دلائل

کی روشنی میں کی گئی ہے، جبکہ اسرائیلی روایات، ضعیف حکایات اور غیر ضروری اختلافات سے حتیٰ الامکان اجتناب کیا گیا ہے، اپنی تحقیقی شان، حسنِ ترتیب، سادہ اسلوب اور سلفی منہج کی وجہ سے محاسن التأویل جدید دور کی اہم اور قابلِ اعتماد تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے، بندہ عاجز نے معارف الفرقان میں کہیں کہیں محاسن التاویل سے بھی استفادہ کیا ہے۔

صفوۃ التفاسیر

شیخ محمد علی الصابونی رحمہ اللہ (۱۹۳۰–۲۰۲۱ء) شام کے ممتاز مفسر، محدث، فقیہ اور معاصر اسلامی مصنف تھے، آپ کی ولادت حلب (شام) میں ایک علمی و دینی خاندان میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد اور حلب کے نامور علماء سے حاصل کی، پھر جامعہ الازہر، مصر سے شریعہ اور قضاءِ شرعی میں اعلیٰ تعلیم مکمل کی، وطن واپسی کے بعد شام میں تدریس کے فرائض انجام دیے، پھر تقریباً تیس برس تک ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں تدریس اور تحقیق سے وابستہ رہے، بعد ازاں رابطۂ عالمِ اسلامی کے تحت قرآن و سنت کے اعجازِ علمی کے شعبے میں خدمات انجام دیں، آپ نے تفسیر، فقہ، حدیث اور سیرت کے موضوعات پر متعدد وقیع کتابیں تصنیف کیں، جن میں صفوۃ التفاسیر، روائع البیان في تفسیر آیات الأحکام، مختصر تفسیر ابن کثیر اور التفسیر الواضح المیسر کو عالمِ اسلام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں دبئی انٹرنیشنل قرآن ایوارڈ نے انہیں "شخصیتِ اسلامیہ" کے اعزاز سے بھی نوازا۔

صفوۃ التفاسیر شیخ محمد علی الصابونی رحمہ اللہ کی سب سے معروف اور مقبول تصنیف ہے، جس میں انہوں نے طبری، قرطبی، ابن کثیر، بغوی، آلوسی، نسفی، ابوالسعود، رازی اور دیگر معتبر تفاسیر کا خلاصہ نہایت منظم، سلیس اور جامع انداز میں پیش کیا ہے۔

اس تفسیر میں ہر سورت کا مختصر تعارف، آیات کے درمیان ربط، آسان ترجمہ، لغوی و بلاغی نکات، شانِ نزول، فقہی مسائل اور منتخب تفسیری اقوال کو یکجا کیا گیا ہے، جس سے یہ طلبہ، اساتذہ اور عام قارئین سب کے لیے مفید بن گئی ہے۔

اگرچہ بعض معاصر علماء نے اس میں بعض ضعیف روایات یا چند تاویلات پر علمی نقد کیا ہے، تاہم مجموعی طور پر صفوۃ التفاسیر اپنی جامعیت، سادہ اسلوب، حسنِ ترتیب اور متعدد معتبر تفاسیر کے خلاصے کی حیثیت سے عصرِ حاضر کی مقبول اور مفید تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے، اب اس کا اردو زبان میں ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے، جس سے اردو داں طبقہ کے لیے اس سے فیض حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے، بندہ نے اپنی تفسیر معارف الفرقان میں صفوۃ التفاسیر سے بہت استفادہ کیا ہے، صفوۃ التفاسیر کے حوالہ کے ساتھ بہت سے مضامین، بہت سی آیات کی تفسیر معارف الفرقان میں نقل کی گئی ہے۔

العجاب فی بیان الاسباب

یہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے، جس میں انہوں نے قرآن کریم کی آیات کے شان نزول پر روایات جمع کی ہیں، ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول بھی ذکر کیے گئے ہیں، مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات بھی ذکر کی گئی ہیں، اس کتاب سے بھی معارف الفرقان میں حوالہ جات کے ساتھ شان نزول ذکر کیے گئے ہیں۔

العجاب فی بیان الاسباب کے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب العجاب فی بیان الأسباب علمِ اسبابِ نزول کے موضوع پر نہایت اہم، جامع اور منفرد تصنیف ہے، مقدمۂ کتاب میں اس کی امتیازی خصوصیات بیان کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ یہ اسبابِ نزول کے روایتی اور منقولہ ذخیرے کو سب سے زیادہ وسعت کے ساتھ جمع کرنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

اس میں صرف روایات کے نقل پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ متعدد اسانید، مختلف طرق، رواۃ کے احوال، اتصال و ارسال، نکارت اور شذوذ جیسے حدیثی مباحث پر بھی ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے۔

مؤلف نے آغاز ہی میں مفسرین اور مناہجِ تفسیر پر ایک جامع فصل شامل کی ہے، جو علمِ تفسیر کے طلبہ اور محققین کے لیے نہایت قیمتی رہنمائی فراہم کرتی ہے، اس کتاب کی ایک بڑی علمی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسی متعدد تفاسیر اور کتبِ حدیث کے اقتباسات محفوظ ہیں جو آج یا تو مفقود ہیں یا ابھی تک شائع نہیں ہوئیں، اس لیے یہ کتاب قدیم تفسیری سرمایہ کے تحفظ کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔

مقدمہ اس حقیقت پر بھی زور دیتا ہے کہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ کے مخطوط اور مطبوعہ علمی ذخیرے کی از سرِ نو تحقیق، اشاعت اور فہرست سازی وقت کی اہم ضرورت ہے، مزید برآں اس میں علمِ اسبابِ نزول کی غیر معمولی اہمیت واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہی علم آیات کے نزول کے زمانی، مکانی اور تاریخی پس منظر کو آشکار کرتا ہے، قرآنِ کریم کے صحیح فہم میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، غلط تاویلات سے محفوظ رکھتا ہے اور اسی کی بدولت خوارج جیسے گمراہ گروہوں کی فکری لغزشوں کی حقیقت واضح ہوتی ہے، اسی لیے محدثین اور مفسرین نے اس علم کو قرآن فہمی کی ناگزیر بنیاد قرار دیا ہے۔

اسباب النزول

ابو الحسن علی الواحدی نیشاپوری رحمۃ اللہ کی تصنیف ''أسباب النزول'' علمِ اسبابِ نزول کی اولین، مشہور اور مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، جسے اس فن میں بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، مفسرین اور علماء نے اس کی علمی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اسبابِ نزول کے موضوع پر سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تصنیفات میں شامل کیا ہے۔

اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف نے آیاتِ قرآنیہ کے نزول کے اسباب کو روایات اور اسانید کے ساتھ جمع کیا، جس کے ذریعے ہر آیت کے تاریخی، زمانی اور واقعاتی پس منظر کو واضح کیا گیا، تاکہ قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم متعین ہو سکے۔

اگرچہ بعد کے محققین نے اس کی روایات کی تخریج، صحت و ضعف اور اسانید کی مزید تحقیق کی ضرورت کی نشاندہی کی، تاہم اس سے کتاب کی بنیادی علمی قدر میں کوئی کمی نہیں آتی، بلکہ یہ حقیقت مزید نمایاں ہوتی ہے کہ ''أسباب النزول'' اس فن کی وہ بنیادی اور مؤثر تصنیف ہے جس پر بعد کے تمام اہلِ علم نے اعتماد کیا اور جس نے اسبابِ نزول کی علمی روایت کی بنیاد مستحکم کی، معارف الفرقان میں شانِ نزول بیان کرنے کے لیے اسباب النزول سے کماحقہ استفادہ کیا گیا ہے، جو اہل نظر کو جگہ جگہ نظر آئے گا۔

لباب النقول فی بیان اسباب النزول

لباب النقول فی بیان اسباب النزول علامہ جلال الدین سیوطی کی تصنیف لطیف ہے، جو فن اسباب النزول پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، بندہ نے معارف الفرقان میں جہاں اسباب النزول کی دیگر کتب سے استفادہ کیا ہے وہاں لباب النزول بھی میرے پیش نظر رہی ہے، اس سے بھی معارف الفرقان میں استفادہ کیا گیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''لباب النقول في بيان أسباب النزول'' کے مقدمے میں بیان کرتے ہیں کہ یہ تصنیف انہوں نے کتبِ حدیث، اصولِ تفسیر اور معتبر تفسیری روایات سے انتخاب و تلخیص کرکے مرتب کی ہے، تاکہ اسبابِ نزول کا مستند اور جامع ذخیرہ ایک جگہ فراہم ہو سکے، مقدمے میں وہ علمِ اسبابِ نزول کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کا اسے محض تاریخی معلومات کا حصہ سمجھنا درست نہیں، کیونکہ آیات کے نزول کے اسباب سے ان کے صحیح معانی متعین ہوتے ہیں، اشکالات دور ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم کے احکام و مقاصد کو سمجھنے میں بنیادی رہنمائی ملتی ہے، اسی لیے علی الواحدی نیشاپوری رحمہ اللہ، ابن دقیق العید رحمہ اللہ اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اقوال نقل کرتے ہوئے وہ ثابت کرتے ہیں کہ اسبابِ نزول سے واقفیت قرآنِ مجید کی صحیح تفسیر کی ناگزیر بنیاد ہے اور اس علم میں وہی روایات معتبر ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یا ان سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہوں۔

مزید برآں وہ یہ اصول بھی واضح کرتے ہیں کہ ہر وہ روایت جس میں نَزَلَت فِي كَذَا کے الفاظ ہوں، ضروری نہیں کہ وہ حقیقی سبب نزول ہی بیان کر رہی ہو بلکہ بسا اوقات اس سے آیت کے مصداق یا اس کے حکم کا بیان مقصود ہوتا ہے۔

اس کے بعد جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب کی امتیازی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس فن میں علی الواحدی نیشاپوری رحمہ اللہ کی أسباب النزول سب سے مشہور کتاب ہے، تاہم لباب النقول کئی اعتبار سے اس پر فوقیت رکھتی ہے، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اسے

نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس میں واحدی کی کتاب پر متعدد نئی روایات کا اضافہ کیا گیا ہے، ہر روایت کے اصل مراجع اور مصادر کی صراحت کی گئی ہے، احادیث کی صحت و ضعف اور قبول ورد کی نشاندہی کی گئی ہے، متعدد روایات میں تطبیق و جمع کی کوشش کی گئی ہے اور ایسی روایات کو حذف کر دیا گیا ہے جو حقیقتاً اسبابِ نزول سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔

اس طرح لباب النقول فی بیان أسباب النزول محض روایات کا مجموعہ نہیں بلکہ اسبابِ نزول کے موضوع پر ایک محققانہ، منقح اور مستند تصنیف ہے، جس نے اس فن کو علمی تحقیق اور حدیثی تنقیح کے اعلیٰ معیار سے ہم آہنگ کر دیا۔

اردو تفاسیر اور معارف الفرقان

معارف الفرقان میں اردو کی قریباً تمامی تفاسیر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، کیونکہ اردو زبان سے استفادہ آسان ہے، البتہ ان میں ان تفاسیر پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے جن میں عربی تفاسیر سے استفادہ کیا گیا اور عربی تفاسیر کے حوالہ جات پیش کیے گئے، اس طرح اطمینان قلبی حاصل ہوتا ہے، پھر حوالہ جات کی بناء پر اصل ماخذ تک پہنچنا سہل ہو جاتا ہے، ان تفاسیر سے قرآنی طلباء کرام اچھی طرح واقف ہیں، اہل ذوق کی لائبریریوں میں تفاسیر موجود ہیں۔

بیان القرآن: یہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر ہے، تاج کمپنی نے اسے بڑے سائز کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، یہ اپنی نوعیت کی انتہائی مختصر اور جامع تفسیر ہے، جسے مفتی شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن کے شروع میں خلاصہ تفسیر کے عنوان سے شامل کیا ہے، ہم نے معارف الفرقان میں اس تفسیر سے زیادہ استفادہ نہیں کیا لیکن جہاں ضرورت محسوس کی وہاں بیان القرآن سے استفادہ کیا ہے، یہ اپنی نوعیت کی لاجواب تفسیر ہے، اس کا اسلوب نگارش اور انداز تفہیم نرالا ہے، جہاں بڑی بڑی تفاسیر خاموشی سے گزر جاتی ہیں وہاں مولانا تھانوی رحمہ اللہ کا قلم رکتا نہیں ہے بلکہ لکھتا ہے اور مضمون کو کسی مالا کی طرح پرو دیا جاتا ہے، انتہائی عمدہ تفسیر ہے۔

معارف القرآن للمفتی: یہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی تصنیف، تالیف یا دروس قرآن

کا مجموعہ ہے، عصر حاضر کی مقبول ترین تفاسیر میں اس کا شمار ہوتا ہے، آسان ہے، خطباء اور علماء کی لائبریریوں کی زینت ہے، معارف الفرقان میں اس تفسیر سے استفادہ دکھائی دے گا، فقیہانہ مباحث خصوصاً فقہ حنفی کے مسائل اسی تفسیر سے مستفاد ہیں، بعض مضامین بہت طویل ہیں جو معارف القرآن سے ہی مستفاد ہیں، البتہ معارف القرآن میں دور دور تک آیات کی وہ تفسیر نہیں کی گئی جو صرف معارف الفرقان کا خاصہ ہے، مفتی شفیع رحمہ اللہ جہاں جہاں سے بہت خاموشی کے ساتھ گزر گئے ہیں وہاں معارف الفرقان میں بڑے تفصیلی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔

معارف القرآن للکاندھلوی: تفسیر معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی ہے، جو اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے، جس کے علمی مباحث بندہ کو ورطہ حیرت میں گم کر دیتے ہیں، مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ نے معارف القرآن لکھتے وقت علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کو سامنے رکھا، معارف الفرقان میں مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ کے اس علمی شاہکار سے استفادہ کیا گیا ہے، بعض مباحث میں مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ بھی خاموشی سے گزر گئے لیکن معارف الفرقان میں ان مقامات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، کئی کئی مقامات پر الفاظ کی وضاحت مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ کی معارف القرآن میں نہیں ہے جو معارف الفرقان میں موجود ہے، بہر حال معارف القرآن مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ کی زندگی کا نچوڑ اور اہل علم و عرفان کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہے۔

تفسیر عثمانی: علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تفسیر عثمانی بھی اپنی نوعیت کی منفرد اور ممتاز تفسیر ہے، جس سے اہل علم و عرفان استفادہ کرتے ہیں، بندہ نے معارف الفرقان میں تفسیر عثمانی کے حوالہ جات بھی پیش کیے ہیں، جہاں بعض دوسرے مفسرین خاموشی سے گزر جاتے ہیں وہاں تفسیر عثمانی کے فوائد پر مشتمل حواشی بولتے ہیں اور پڑھنے والے طالب علم کو بتاتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم کیا ہے۔

انوار البیان: حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ نے انوار البیان کے عنوان سے تفسیر لکھی ہے، معارف الفرقان میں اس تفسیر سے کماحقہ استفادہ کیا گیا ہے، جگہ جگہ اس کے حوالہ جات موجود ہیں، لیکن مفتی عاشق الٰہی بھی بعض بعض مقامات سے خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئے ہیں، جن مقامات

سے یہ لوگ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئے وہاں معارف الفرقان میں خوب تفصیلی مباحث بیان کیے گئے ہیں، جو معارف الفرقان کا خاصہ ہے، یہ کسی اردو تفسیر کیا عربی تفسیر میں بھی نہیں ہیں، اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ راقم الحروف نے باقی مفسرین سے ہٹ کر تفسیر بالرائے کی ہے بلکہ اس کے لیے دوسرے علمی دروازوں پر دستک دی گئی ہے، دوسرے علمی سمندروں میں غوطہ زنی کرتے ہوئے علمی موتی تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے، انوارالبیان اپنی نوعیت کی جداگانہ تفسیر ہے۔

تبیان القرآن: تفسیر تبیان القرآن علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ کی تفسیر ہے، سعیدی اہل سنت میں بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے جید عالم دین ہیں، ان کی تفسیر میں بہت علمی ذخیرہ پیش کیا گیا ہے، ان کے پیش نظر علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر رہی ہے، جگہ جگہ پوری پوری عبارات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو تفسیر کبیر سے لیا گیا ہے، مصنف نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارات پیش کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ ان کے علمی جواہرات ہیں، کہیں کہیں انہوں نے علمی مباحث کو امام رازی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان مقامات سے خاموشی سے نہ گزر سکے جہاں سے گزر جانا چاہیے تھا یا حقائق کا دامن نہیں چھوڑنا تھا، مگر وہ دور کی کوڑیاں لالا کر اپنے مسلک کے خود ساختہ عقائد تفسیر میں بیان کرتے گئے، معارف الفرقان میں ان مقامات متنازعہ یا حقائق سے بعید مضامین کے علاوہ استفادہ کیا گیا ہے۔

ذخیرۃ الجنان: امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے دروس قرآن کا مجموعہ ذخیرۃ الجنان جو اپنی نوعیت کا ایک خوبصورت علمی تحفہ ہے اس سے جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے، خصوصاً وہ مقامات جہاں بعض متنازعہ مسائل کو نہایت عمدگی، شائستگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، دلائل و براہین کے ساتھ مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ معارف الفرقان میں نقل کیے گئے ہیں، ان مقامات کو ذخیرۃ الجنان سے نقل کر کے معارف الفرقان میں رکھنے سے معارف الفرقان کی علمی اور استنادی حیثیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ضیاء القرآن: ضیاء القرآن پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ کی تفسیر ہے، یہ اپنی نوعیت کی عمدہ اور بہترین

تفسیر ہے، پیر کرم شاہ بھی اہلسنت کے بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مگر انہوں نے اپنی تفسیر میں حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اسے مسلکی چھاپ سے بچایا جائے، وہ متنازعہ اور نزاعی مسائل میں بہت عمدگی سے آگے بڑھتے گئے، جہاں کہیں ان مسائل کا ذکر کرنا تھا وہاں بہت ہی عمدگی سے بیان کرتے گئے، معارف الفرقان میں ضیاء القرآن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، حوالہ جات کے ساتھ عبارات نقل کی گئی ہیں۔

معالم العرفان فی دروس القرآن: حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ کے دروس قرآن کا عظیم الشان مجموعہ ہے، اس میں آیات کے ترجمہ و تفسیر کے ساتھی بہت ہی عمدہ انداز میں علمی مباحث بیان کیے گئے ہیں، معارف الفرقان میں راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے، جہاں جہاں سے عبارات نقل کی ہیں ان کے حوالہ جات بھی نقل کر دیے ہیں۔

توضیح القرآن: یہ شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب کی مختصر تفسیر ہے، جو آسان ترجمہ کے ساتھ اہل علم کے ہاں موجود ہے، مفتی صاحب نے آیات کے ذیل میں جہاں جہاں ضروری سمجھا وہاں وہاں مختصر مگر پر اثر حواشی تحریر کیے ہیں، بہت عمدہ اور لاجواب تفسیر ہے، معارف الفرقان میں جگہ جگہ توضیح القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں حسب ضرورت ترجمہ بھی اسی مقام سے لیا گیا ہے۔

روح القرآن: ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی رحمہ اللہ کی تفسیر روح القرآن اردو زبان کی بہترین تفاسیر میں سے ایک ہے، جس میں آیات کے ذیل میں علمی بصیرت کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، معارف الفرقان میں جگہ جگہ روح القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

سراج البیان: یہ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی تفسیر ہے، جو اگرچہ مختصر ہے مگر انتہائی ادیبانہ عالمانہ فاضلانہ تفسیر ہے، جس میں طول وطویل مباحث کی بجائے ضرورت کے درجہ کی تفسیر کی گئی ہے، معارف الفرقان میں اس تفسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

معارف الفرقان: اس نام سے ایک تفسیر مولانا عبدالقیوم قاسمی صاحب نے تحریر کی ہے، جو پاکستان اور بھارت سے شائع ہو چکی ہے، راقم الحروف کو اس تفسیر معارف الفرقان کی اشاعت کا اس وقت علم

ہوا جب میں اپنے ایک شاگرد کے پاس موجود تھا، معارف الفرقان کا نام سن کر انہوں نے کہا کہ استاذ جی اس نام کی تفسیر تو پہلے چھپ چکی ہے، میں نے ان سے طلب کی، انہوں نے پیش کی، میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا تو مسرت ہوئی، یہ وہ موقع تھا جب میں اپنی معارف الفرقان کی آٹھ سے زیادہ جلدیں لکھ چکا تھا، مجھے بھارتی ناشر نے فرمایا کہ آپ اس تفسیر کا کوئی اور نام رکھ لیں، لیکن میں نے عذر کیا کہ اب یہ کئی علماء کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے، اس کی ایک بار کسی نہ کسی درجہ میں طباعت ہوگئی ہے، بہرحال معارف الفرقان قاسمی سے بھی کہیں کہیں استفادہ کیا گیا ہے، مگر زیادہ نہیں تھوڑا سا۔

مقاصد القرآن: استاذ الحدیث مولانا خادم حسین شجاعبادی برصغیر کے ممتاز عالمِ دین، محدث، مفسر اور مصنف، آپ کی ولادت شجاع آباد، ضلع ملتان میں ہوئی، حفظِ قرآن کے بعد درسِ نظامی کی تکمیل پاکستان کے جید علماء سے کی اور نصف صدی سے زائد عرصہ لاہور میں تدریس، دعوت اور تصنیف کی عظیم خدمات انجام دیں، آپ کے ہزاروں شاگرد ملک و بیرونِ ملک دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، آپ کی اہم تصانیف میں عقد الجواہرات من خلاصۃ السور والآیات، سیرت الحبیب ﷺ، تذکیر القرآن اور مقاصد القرآن شامل ہیں، جن میں قرآن و سنت کی تعلیمات کو نہایت آسان، عام فہم اور تحقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مقاصد القرآن ایک جلد پر مشتمل نہایت مفید، مختصر اور جامع تفسیر ہے، جس میں قرآنِ کریم کی ہر سورت کے بنیادی مضامین، مرکزی پیغام اور مقاصد کو نہایت سادہ، عام فہم اور مؤثر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، اس تفسیر کا مقصد قاری کو ہر سورت کا خلاصہ، ربط اور عملی ہدایات مختصر انداز میں فراہم کرنا ہے، تاکہ قرآنِ کریم کے اصل پیغام کو آسانی سے سمجھا جاسکے، اپنے اختصار، حسنِ ترتیب، علمی پختگی اور آسان زبان کی وجہ سے یہ کتاب علماء، طلبہ، خطباء، دروسِ قرآن دینے والوں اور عام قارئین سب کے لیے یکساں مفید ہے اور قرآنِ کریم کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے ایک عمدہ رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، معارف الفرقان میں مقاصد القرآن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

خصوصیاتِ معارف الفرقان

معارف الفرقان عصرِ حاضر کی ایک جامع، تحقیقی اور منفرد تفسیرِ قرآن ہے، جس کی بنیاد امتِ مسلمہ کے صدیوں پر محیط علمی سرمایہ پر استوار ہے، اس تفسیر میں قدیم و جدید عربی تفاسیر، اردو زبان کی اہم اور مستند تفاسیر، کتبِ حدیث، آثارِ صحابہ و تابعین، ائمۂ تفسیر کی تحقیقات اور اکابرِ امت کی علمی نگارشات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ محض سابقہ تفاسیر کا مجموعہ یا خلاصہ نہیں، بلکہ ان تمام علوم و معارف کو تحقیق، تنقیح اور نئے اسلوب کے ساتھ پیش کرنے والی ایک مستقل اور منفرد تالیف ہے۔

معارف الفرقان کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کی تمام آیات درست اعراب کے ساتھ درج کی گئی ہیں، پھر ہر آیت کا لفظی اور بامحاورہ اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری الفاظ کے مفہوم اور آیات کے مجموعی پیغام دونوں سے یکساں طور پر آشنا ہو سکے۔ اس کے بعد ہر آیت یا آیات کے مجموعے کی تفسیر نہایت سلیس، شگفتہ، ادیبانہ اور انشاء پردازانہ اسلوب میں بیان کی گئی ہے، جس سے علمی گہرائی کے باوجود عبارت میں روانی، حسنِ بیان اور دل نشینی برقرار رہتی ہے۔

اس تفسیر کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ ہر مقام پر اسبابِ نزول، شانِ ورود، تاریخی پس منظر اور آیات کے زمانی و مکانی ماحول کو سامنے رکھ کر تفسیر کی گئی ہے، تاکہ قاری آیات کے حقیقی مفہوم تک پہنچ سکے۔ اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور امت کے جلیل القدر مفسرین و محدثین کے آثار و اقوال کو نہایت اہتمام کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جس سے تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔

معارف الفرقان میں عربی زبان کی اہم ترین تفاسیر اور اردو زبان کی تقریباً تمام معروف تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم کسی ایک مفسر یا ایک تفسیر پر انحصار نہیں کیا گیا، بلکہ ہر مسئلہ میں متعدد مفسرین کی آراء کا تقابلی مطالعہ کر کے راجح اور مضبوط موقف کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ تفسیر سابقہ تفسیری ذخیرے کا جامع نچوڑ بن گئی ہے، جس میں ہر تفسیر کی نمایاں خوبی اپنی مناسب جگہ محفوظ ہے۔

اس تفسیر کا ایک نمایاں امتیاز یہ بھی ہے کہ اختلافی اور نزاعی مسائل میں اعتدال، انصاف اور علمی دیانت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کسی فرقے، جماعت یا مسلک پر تنقید و جرح کو مقصد نہیں بنایا گیا، بلکہ دلائلِ شرعیہ، اصولِ تفسیر اور اقوالِ سلف کی روشنی میں ایسا معتدل اور محققانہ انداز اختیار کیا گیا ہے جو اہلِ علم کے لیے بھی باعثِ اطمینان ہے اور عام قارئین کے لیے بھی موجبِ رہنمائی۔

معارف الفرقان صرف آیات کی تشریح تک محدود نہیں بلکہ اس میں قرآنی اشکالات، بظاہر متعارض آیات و احادیث، علمی اعتراضات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے فکری سوالات کے مدلل اور تحقیقی جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ متعدد ایسے علمی نکات، لطائف، حکمتیں اور معارف بیان کیے گئے ہیں جنہیں سابقہ تفاسیر میں یا تو اختصار کے باعث ذکر نہیں کیا گیا یا درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے یہ تفسیر نئی علمی جہات متعارف کراتی ہے اور قرآن فہمی کے کئی نئے دریچے وا کرتی ہے۔

فقہی، اعتقادی، اخلاقی، تربیتی، دعوتی، معاشرتی، تاریخی اور تمدنی مباحث کو بھی ضرورت کے مطابق نہایت متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر مقام پر قرآنِ کریم کے عملی پیغام کو نمایاں کیا گیا ہے، تاکہ قاری صرف معلومات حاصل نہ کرے بلکہ اپنی زندگی میں قرآن کے احکام و ہدایات کو نافذ کرنے کی ترغیب بھی حاصل کرے۔

الغرض معارف الفرقان اپنی جامعیت، استنادی حیثیت، تحقیقی اسلوب، ادبی حسن، دلائل و براہین کی فراوانی، قرآنی اشکالات کے مدلل جوابات، اختلافی مسائل میں اعتدال، عربی و اردو تفسیری ذخیرے کے حسین امتزاج اور منفرد اندازِ نگارش کی بنا پر ایک ایسی تفسیر ہے جو سابقہ تفاسیر کے علمی و فکری محاسن کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ نہ صرف مفسرینِ سلف کی عظیم علمی روایت کی امین ہے بلکہ عصرِ حاضر کے علمی، فکری اور دعوتی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے، اسی لیے اسے بجا طور پر جامعِ محاسنِ تفاسیر اور قرآنی علوم کا ایک منفرد علمی انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اللہ قبول کرے۔

خادم اسلام محمود الرشید حدوٹی

۶ جولائی ۲۰۲۶ء بروز پیر، سوا بارہ بجے شب، بیت الطارق بہارہ کہو اسلام آباد

الدرر النافعہ فی تفسیر سورۃ الفاتحہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَی الظَّالِمِیْنَ، وَأَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ، وَإِلٰہُ الْمُرْسَلِیْنَ، وَقَیُّوْمُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرَضِیْنَ، وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہُ الْمَبْعُوْثُ بِالْکِتَابِ الْمُبِیْنِ، اَلْفَارِقُ بَیْنَ الْھُدٰی وَالضَّلَالِ، وَالْغَیِّ وَالرَّشَادِ، وَالشَّکِّ وَالْیَقِیْنِ، أَنْزَلَہٗ لِنَقْرَأَہٗ تَدَبُّرًا، وَنَتَأَمَّلَہٗ تَبَصُّرًا، وَنَسْعَدَ بِہٖ تَذَکُّرًا، وَنَحْمِلَہٗ عَلٰی أَحْسَنِ وُجُوْھِہٖ وَمَعَانِیْہِ، وَنُصَدِّقَ بِہٖ وَنَجْتَھِدَ عَلٰی إِقَامَۃِ أَوَامِرِہٖ وَنَوَاھِیْہِ، وَنَجْتَنِیَ ثِمَارَ عُلُوْمِہِ النَّافِعَۃِ الْمُوْصِلَۃِ إِلَی اللّٰہِ سُبْحَانَہٗ مِنْ أَشْجَارِہٖ، وَرَیَاحِیْنَ الْحِکَمِ مِنْ بَیْنِ رِیَاضِہٖ وَأَزْھَارِہٖ، فَھُوَ کِتَابُہُ الدَّالُّ عَلَیْہِ لِمَنْ أَرَادَ مَعْرِفَتَہٗ، وَطَرِیْقُہُ الْمُوَصِّلَۃُ لِسَالِکِھَا إِلَیْہِ.

قرآن حکیم کی فضیلت

قرآنی فضیلت کا باب وسیع ہے، اس میں حضرات علماء کرام نے بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، ہم یہاں آغاز میں مشتے از خروارے کچھ عرض کریں گے، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن والوں کے لئے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کی طلب رکھی۔ قرآن حکیم کی تمام فضیلتوں میں یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی مخلوق نہیں ہے۔ یہ ایسا معجز کلام ہے کہ اس جیسا کوئی دوسرا کلام نہیں ہے اور یہ ایسی صفت ہے جس جیسی کوئی اور صفت نہیں ہے۔ یہ اس کے ذاتی نور میں سے ہے، اس کی تلاوت قُرّاءِ کرام کی

آوازیں اور نغمہ سرائیاں ہیں، جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے، بعض عبادات میں وجوبی اور بعض میں استحبابی طور پر، اس پر انہیں ثواب دیا جاتا ہے اور اس کے چھوڑنے پر انہیں گناہ ملتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس عظیم امانت کو انسانی سینوں میں رکھنے کے لئے انہیں توفیق اور ہمت عطاء فرمائی ہے، تاکہ یہ اس میں غور و فکر کر سکیں اور اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔

رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱) الحشر)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے جھک کر پھٹ جاتا اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔ کہاں پہاڑوں کی قوت اور کہاں انسانی قوت؟ کوئی جوڑ نہیں ہے، مگر یہ رب العالمین کی کریمی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ اس عظیم امانت کو اٹھائے رکھیں، یہ اسی کی مہربانی اور عطاء ہے۔

اگر پہاڑوں میں اس طرح عقل رکھی جاتی جس طرح انسانوں کو ودیعت کی گئی، پھر ان پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کی چوٹی پر قرآن کریم جیسی عظیم الشان کتاب کو رکھا جاتا تو وہ پہاڑ اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت سے پھٹ جاتا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اہل فکر و نظر کے لیے یہ مثالیں اسی لیے بیان کی جاتی ہیں تاکہ وہ خوب غور و فکر کریں، سوچیں اور سمجھیں کہ یہ عظیم صفات جس ہستی کی بیان کی جارہی ہیں اس ہستی کی عظمت شان کا کیا عالم ہو گا، موصوف بھی عظیم اور اس کی صفت بھی عظیم ہے۔

اِرشادات نبوی ﷺ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يَقُولُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ وَذِكْرِيْ عَنْ مَسْأَلَتِيْ أَعْطَيْتُهُ مَا أُعْطِي

السَّائِلِينَ، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، جسے قرآن اور میری یاد مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھے میں اسے وہ دوں گا جو سوال کرنے والوں کو دوں گا۔ الفتح الکبیر میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت میں افضل کا لفظ آیا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ دوں گا۔ (ترمذی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وَفَضْلُ كَلَامِ اللهِ عَلَى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللهِ عَلَى خَلْقِهِ (الدارمی للسمرقندی)

اللہ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر ایسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد گرامی نقل فرمایا ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

السَّبْعُ الطُّوَلُ مِثْلُ التَّوْرَاةِ، وَالْمِئُونَ مِثْلُ الْإِنْجِيلِ، وَالْمَثَانِي مِثْلُ الزَّبُورِ، وَسَائِرُ الْقُرْآنِ بَعْدُ فَضْلٌ (مقدمہ تفسیر قرطبی) سات لمبی سورتیں تورات کی طرح ہیں، مئین انجیل کی طرح ہیں، اور مثانی زبور کی طرح ہے اور باقی سارا قرآن اس سے زیادہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان تین اقسام کی سورتوں میں جو کچھ ہے وہ ان تین بڑی آسمانی کتابوں کی طرح ہے، جب کہ ان تین اقسام کی سورتوں کے علاوہ جو سورتیں ہیں وہ ان تین آسمانی کتابوں سے زائد مضامین پر مشتمل ہیں۔

حضرت حارث اعور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد کے پاس سے گذرا تو دیکھا کہ لوگ دنیاوی (باتوں) میں مشغول ہیں۔ چنانچہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! کیا آپ دیکھ نہیں رہے لوگ باتوں میں مشغول ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا ایسا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ

سَتَكُونُ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ. قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا؟ قَالَ: كِتَابُ اللهِ

تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِيهِ نَبَأُ مَنْ قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدَىٰ فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللهُ هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ وَنُورُهُ الْمُبِينُ وَالذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ وَهُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا تَتَشَعَّبُ مَعَهُ الْآرَاءُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَلَىٰ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ وَهُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ إِذْ سَمِعَتْهُ أَنْ قَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا مَنْ عَلِمَ عِلْمَهُ سَبَقَ وَمَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ خُذْهَا إِلَيْكَ يَا أَعْوَرُ (ترمذی)

عنقریب فتنوں کا ظہور ہو گا جیسے سیاہ اندھیری رات کے ٹکڑے۔ میں نے عرض کیا ان سے بچنے کا کیا راستہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب قرآن کریم میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے بعد ہو گا اس کا بھی ذکر ہے نیز اس میں تمہارے درمیان ہونے والے معاملات کا حکم ہے اور یہ سیدھا سچا فیصلہ ہے۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ جس نے اسے حقیر جان کر چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ پھر جو شخص اس کے علاوہ کسی اور چیز میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہ اللہ کی ایک مضبوط رسی ہے اور یہی نور مبین اور ذکر حکیم ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے خواہشات نفسانی ٹیڑھا نہیں کر سکتیں اور نہ ہی اس سے زبانیں خلط ملط ہوتی ہیں۔ علماء اس سے سیر نہیں ہو سکتے۔ یہ بار بار دہرانے اور پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ اسے سن کر جن کہہ اٹھے کہ ہم نے عجیب قرآن سنا جو ہدایت کی راہ دکھاتا ہے ہم اس پر ایمان لائے۔ جس نے اس کے مطابق بات کی اس نے سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے اجر پایا۔ جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے عدل کیا۔ اور جس نے اس کی طرف لوگوں کو بلایا اسے صراط مستقیم پر چلا دیا گیا۔ اے اعور! اس حدیث کو یاد کر لو۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۴۹)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَأْدُبَةُ اللهِ، فَتَعَلَّمُوا مِنْ مَأْدُبَتِهِ مَا اسْتَطَعْتُمْ، إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللهِ، وَهُوَ النُّورُ الْمُبِيْنُ، وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، عِصْمَةُ مَنْ تَمَسَّكَ بِهِ، وَنَجَاةُ مَنِ اتَّبَعَهُ، لَا يَعْوَجُّ فَيُقَوَّمَ، وَلَا يَزِيْغُ فَيُسْتَعَابَ، وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ، وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ، فَاتْلُوْهُ، فَإِنَّ اللهَ يَأْجُرُكُمْ عَلَى تِلَاوَتِهِ بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرَ حَسَنَاتٍ، أَمَا إِنِّي لَا أَقُوْلُ: الٓمٓ حَرْفٌ، بَلْ أَلِفٌ حَرْفٌ، وَلَامٌ حَرْفٌ، وَمِيْمٌ حَرْفٌ،

بے شک یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے ادب سکھانے کا دستر خوان ہے، پس تم اس کی ادب گاہ سے جتنا ہو سکے سیکھو، یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی رسی ہے، یہ نور مبین ہے، نفع بخش شفاء ہے، جو اس کے ساتھ چمٹ گیا اسے بچانے والی ہے، جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے نجات ہے، جو کج رو ہو گا یہ اسے سیدھا کر دے گی، اس کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے، کثرت تلاوت سے یہ پرانا نہیں ہوتا، پس تم اس کی تلاوت کرو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تلاوت پر اجر دے گا، ہر حرف کے بدلے میں دس نیکیاں ہیں، میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ الف لام ایک حرف ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ. (البُخَارِی)

تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِی يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الْأُتْرُجَّةِ رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِی لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَا رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِی يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِی لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ لَا رِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا مُرٌّ

مومن کے قرآن مجید پڑھنے کی مثال ترنج کی طرح ہے کہ اس کی خوشبو پاکیزہ اور ذائقہ خوشگوار ہے

اور قرآن مجید نہ پڑھنے والے مومن کی مثال اس کھجور کی طرح ہے کہ جس میں خوشبو نہیں لیکن اس کا ذائقہ میٹھا ہے اور منافق کے قرآن پڑھنے کی مثال ریحان کی طرح ہے کہ اس کی خوشبو تو اچھی ہے اور اس کا ذائقہ کڑوا ہے اور منافق کے قرآن نہ پڑھنے کی مثال حنظلہ کی طرح ہے کہ جس میں خوشبو نہیں اور اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔

حضرت وہب ذماری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ آتَاهُ اللهُ الْقُرْآنَ فَقَامَ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ وَمَاتَ عَلَى طَاعَةٍ، بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ السَّفَرَةِ وَالْأَحْكَامِ، قَالَ سَعِيدٌ: اَلسَّفَرَةُ الْمَلَائِكَةُ، وَالْأَحْكَامُ الْأَنْبِيَاءُ. (سنن الدارمی)

جس شخص کو اللہ قرآن عطا کرے اور وہ دن میں رات میں اس کی تلاوت کرتا رہے اور اس میں موجود احکام پر عمل کرتا رہے اور اس اطاعت کی حالت میں مر جائے قیامت کے دن اللہ اسے سفرہ اور احکام کے ہمراہ مبعوث کرے گا۔ سعید بیان کرتے ہیں سفرہ سے مراد فرشتے اور احکام سے مراد انبیاء ہیں۔

حضرت وہب ذماری رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں

وَمَنْ كَانَ حَرِيصًا وَهُوَ يَتَفَلَّتُ مِنْهُ، وَهُوَ لَا يَدَعُهُ، أُوتِيَ أَجْرَهُ مَرَّتَيْنِ. وَمَنْ كَانَ عَلَيْهِ حَرِيصًا وَهُوَ يَتَفَلَّتُ مِنْهُ وَمَاتَ عَلَى الطَّاعَةِ، فَهُوَ مِنْ أَشْرَافِهِمْ، وَفُضِّلُوا عَلَى النَّاسِ، كَمَا فُضِّلَتِ النُّسُورُ عَلَى سَائِرِ الطُّيُورِ، وَكَمَا فُضِّلَتْ مَرْجَةٌ خَضْرَاءُ عَلَى مَا حَوْلَهَا مِنَ الْبِقَاعِ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، قِيلَ: أَيْنَ الَّذِينَ كَانُوا يَتْلُونَ كِتَابِيَ لَمْ يُلْهِهِمْ اتِّبَاعُ الْأَنْعَامِ؟ فَيُعْطَى الْخُلْدَ وَالنَّعِيمَ فَإِنْ كَانَ أَبَوَاهُ مَاتَا عَلَى الطَّاعَةِ، جُعِلَ عَلَى رُءُوسِهِمَا تَاجُ الْمُلْكِ، فَيَقُولَانِ: رَبَّنَا مَا بَلَغَتْ هَذَا أَعْمَالُنَا؟ فَيَقُولُ: بَلَى إِنَّ ابْنَكُمَا كَانَ يَتْلُو كِتَابِيَ (سنن الدارمی)

جو شخص اسے پڑھنے کا شوق رکھتا ہو اور اس کی طرف متوجہ رہے اور اسے نہ چھوڑے اسے دوگنا اجر

ملے گا اور جو شخص اسے پڑھنے کا شوق رکھتا ہو اور وہ اس کی طرف متوجہ رہے اور اللہ کی اطاعت میں فوت ہو وہ ان کے معزز لوگوں میں سے ہو گا اسے لوگوں پر فضیلت عطا کی جائے گی اس طرح جیسے نسور کو تمام پرندوں پر فضیلت حاصل ہے اور جیسے سر سبز و شاداب حصے کو اس کے آس پاس کی زمین پر فضیلت حاصل ہوتی ہے جب قیامت کا دن ہو گا تو یہ کہا جائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جو میری کتاب کی تلاوت کرتے تھے؟ جانوروں کے پیچھے جانے نے انہیں غافل نہیں کیا پھر ان لوگوں کو دائمی زندگی اور جنت نصیب ہو گی۔ اگر اس شخص کے والدین حالت اسلام میں مرے تھے تو ان کے سروں پر تاج شاہی پہنایا جائے گا وہ یہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اعمال تو اس لائق نہیں ہیں تو اللہ فرمائے گا ہاں لیکن تمہارا بیٹا میری کتاب کی تلاوت کرتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ (مسلم) قرآن کا ماہر نیکوکار فرشتوں کے ساتھ ہو گا اور وہ شخص جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے اور وہ اس پر شاق ہوتا ہے تو اس کے لئے دہرا اجر ہے۔ ایک تلاوت کرنے کا اور دوسرا مشقت اٹھانے کا، ماہر کا مرتبہ ان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِّنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ وَّالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا لَا أَقُوْلُ الٓمٓ حَرْفٌ وَلٰكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَّمِيْمٌ حَرْفٌ (ترمذی) جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا اس کے لئے اس کے بدلے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس کے برابر ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ الف لام ایک حرف ہے بلکہ الف الگ حرف ہے اور لام الگ حرف ہے اور میم الگ حرف ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم صفہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ نے پوچھا:

أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَغْدُوَ كُلَّ يَوْمٍ إِلَىٰ بُطْحَانَ أَوْ إِلَى الْعَقِيقِ فَيَأْتِيَ مِنْهُ بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ فِي غَيْرِ إِثْمٍ وَّلَا قَطْعِ رَحِمٍ فَقُلْنَا: يَارَسُولَ اللهِ كُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِكَ، قَالَ: أَفَلَا يَغْدُوْ أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيَعْلَمُ أَوْ يَقْرَأُ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ نَاقَتَيْنِ وَثَلَاثٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ ثَلَاثٍ وَّأَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَرْبَعٍ وَّمِنْ أَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْإِبِلِ

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ روزانہ صبح بطحان کی طرف یا عقیق کی طرف جائے اور وہ وہاں سے بغیر کسی گناہ اور بغیر کسی قطع رحمی کے دو بڑے بڑے کوہان والی اونٹنیاں لے آئے؟ ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم سب اس کو پسند کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی صبح مسجد کی طرف نہیں جاتا کہ وہ کتاب اللہ کی دو آیتیں خود سیکھے یا سکھائے یہ اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے بہتر ہے اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے بہتر ہے اس طرح آیتوں کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے۔ (مسلم)

آپ ﷺ نے ان لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق انہیں سمجھانے کی کوشش فرمائی تھی، کہ ان کے ہاں اس زمانے میں انہی جانوروں کی اہمیت سمجھی جاتی تھی، عرب میں اونٹ کو بڑا مقام حاصل تھا، جیسے آج دنیا میں ڈالر، ریال، دینار، درھم کی، اسی طرح گاڑیوں میں پاراڈو، پاجیرو، مرسڈیز، لینڈ کروزر نامی گاڑیوں کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے، جن لوگوں کے پاس ڈالروں کا ذخیرہ ہے، جن کے پاس استعمال کے لیے بڑی بڑی گاڑیاں ہیں ان کو دنیا میں آج بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں بڑے درجے کا بندہ خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ایک مختصر سی مثال دے کر سمجھا دیا تھا کہ قرآن کریم کی آیات ان سب چیزوں سے بڑھ کر اہمیت کی حامل ہیں۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِّنْ بُيُوتِ اللهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا

نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ. (مسلم، باب فضل الاجتماع علی تلاوت القرآن)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے اور اس کا آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں، تو ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے، انہیں فرشتے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان لوگوں میں کرتے ہیں جو اس کے پاس ہوتے ہیں اور جس شخص کا عمل سُست ہوتا ہے اس کا نسب اس سے تیز نہیں ہو سکتا۔

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں،

الْجَاهِرُ بِالْقُرْآنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْآنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ (ابو داؤد) بلند آواز سے قرآن پڑھنے والا اعلان کر کے صدقہ کرنے والے کی طرح ہے، آہستہ قرآن پڑھنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن آہستہ پڑھنا زور سے پڑھنے سے افضل ہے کیوں کہ علماء کے نزدیک چھپا کر صدقہ دینا اعلان کر کے صدقہ دینے سے افضل ہے، نیز اہل علم کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ریاکاری و خود پسندی سے محفوظ رہے، کیوں کہ اعلانیہ اعمال کی بنسبت خفیہ اعمال میں ریا کا خوف نہیں ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَجِيءُ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُولُ يَا رَبِّ حُلِّهِ فَيُلْبَسُ تَاجَ الْكَرَامَةِ ثُمَّ يَقُولُ يَا رَبِّ زِدْهُ فَيُلْبَسُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ ثُمَّ يَقُولُ يَا رَبِّ ارْضَ عَنْهُ فَيَرْضَى عَنْهُ فَيُقَالُ لَهُ اقْرَأْ وَارْقَ وَيُزَادُ بِكُلِّ آيَةٍ حَسَنَةٌ. قرآن حکیم قیامت کے دن آئے گا، پھر سفارش کرے گا، اے میرے رب! اسے جوڑا پہنا دے، پھر وہ اسے بزرگی کا تاج پہنائے گا، پھر وہ سفارش کرے گا، اے

میرے رب! اسے اور زیادہ کر دے، پھر وہ اسے بزرگی کا جوڑا پہنائے گا، پھر وہ سفارش کرے گا، اے میرے رب! تو اس سے راضی ہو جا، اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا، پھر اسے کہا جائے گا، قرآن پڑھ اور جنت کے درجات پر چڑھ اور ہر آیت کے بدلے ایک نیکی زیادہ کی جائے گی۔ {یہاں بعض روایات میں صاحبِ قرآن کا ذکر ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ حافظِ قرآن آئے گا اور وہ سفارش کرے گا}

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اِقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا (ابو داود) صاحبِ قرآن کو قیامت کے دن کہا جائے گا، قرآن پڑھ اور جنت کے درجے پہ چڑھ اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسے تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا، پس تیرا مقام آخری آیت کے پڑھنے کے پاس ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ إِذَا دَخَلَ الْجَنَّةَ اقْرَأْ وَاصْعَدْ فَيَقْرَأُ وَيَصْعَدُ بِكُلِّ آيَةٍ دَرَجَةً حَتَّى يَقْرَأَ آخِرَ شَيْءٍ مَّعَهُ (ابن ماجہ)

جب صاحب قرآن جنت میں داخل ہو گا تو اسے کہا جائے گا، قرآن پڑھ اور چڑھ، اور وہ ہر آیت کے بدلے ایک درجے پہ چڑھے گا، یہاں تک کہ وہ آخر تک پڑھ لے گا۔

حضرت ابو امامہ حِمصیؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وَيُقَالُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِقْرَأْ وَارْقَ فَيَقْرَأُ آيَةً وَّيَصْعَدُ دَرَجَةً حَتّٰى يُنْجِزَ مَا مَعَهُ مِنَ الْقُرْآنِ ثُمَّ يُقَالُ لَهُ اِقْبِضْ فَيَقْبِضُ ثُمَّ يُقَالُ لَهُ أَتَدْرِي مَا فِي يَدَيْكَ فَإِذَا فِي يَدِهِ الْيُمْنَى الْخُلْدُ وَفِي الْيُسْرَى النَّعِيْمُ. (قرطبی، ترتیب الامالی الخمیسیه للشجری)

حافظِ قرآن کو قیامت کے دن کہا جائے گا، پڑھ پھر وہ پڑھے گا، اور وہ ایک درجہ چڑھے گا، یہاں تک کہ جو کچھ قرآن میں سے اس کے پاس ہو گا وہ اسے مکمل کرے گا، پھر اسے کہا جائے گا کہ پکڑ، پس وہ

پکڑے گا، پھر اسے کہا جائے گا، کیا تو جانتا ہے کہ تیرے ہاتھوں میں کیا ہے؟ پس اچانک اس کے داہنے ہاتھ میں جنت میں ہمیشہ رہنے کا پروانہ اور بائیں ہاتھ میں جنت کی نعمتیں ہوں گی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَحَفِظَهُ، أَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ، وَشَفَّعَهُ فِي عَشَرَةٍ مِّنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، كُلُّهُمْ قَدِ اسْتَوْجَبَ النَّارَ (سنن ابن ماجہ باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ) جس شخص نے قرآن پڑھا، اور اسے زبانی یاد کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور وہ اپنے گھر والوں میں سے دس ان لوگوں کی سفارش کرے گا جن پر دوزخ کی آگ واجب ہو چکی ہو گی۔

حضرت امّ درداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی، میں نے انہیں کہا: جنت میں جو لوگ داخل ہوں گے ان میں جس نے قرآن پڑھا اس کی اس شخص پر جس نے قرآن نہیں پڑھا پر کیا فضیلت ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

إِنَّ عَدَدَ آيِ الْقُرْآنِ عَلَى عَدَدِ دَرَجِ الْجَنَّةِ، فَلَيْسَ أَحَدٌ دَخَلَ الْجَنَّةَ أَفْضَلَ مِمَّنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ قرآن کی جتنی آیات اتنے درجات، جنت میں داخل ہونے والوں میں قرآن پڑھنے والے بہترین لوگ ہوں گے۔ (ابو محمد مکی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَاتَّبَعَ مَا فِيهِ هَدَاهُ اللهُ مِنَ الضَّلَالَةِ، وَوَقَاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُوْءَ الْحِسَابِ، وَذٰلِكَ بِأَنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ يَقُولُ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ اس میں ہے اس کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت عطاء فرمائیں گے اور اسے قیامت کے دن بُرے عذاب سے بچائیں گے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، پس جس شخص نے ہماری ہدایتوں کی پیروی کی نہ وہ گمراہ ہو گا اور نہ ہی وہ بدبخت ہو گا۔ (۱۲۳ سورۃ طٰہٰ، عبد الرزاق ج ۳)

حضرت لیث رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن سننے والے کی طرف اللہ کی رحمت دوڑ کر آتی ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا

وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۰۴ سورۃ الأعراف)

جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ کے ساتھ سنو! اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بہت ہی پیاری دعا ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی عظمت کو یہ فرما کر مزید چار چاند لگائے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کو ربیع القلب یعنی دل کی بہار فرمایا ہے۔

أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ، وَنُوْرَ صَدْرِيْ، وَجَلَاءَ حُزْنِيْ، وَذَهَابَ هَمِّيْ، (مسند ابن ابی شیبہ ج ا ص ۱۲۳)

(اے میرے اللہ) میں تجھ سے تیرے ہر اس پاک نام کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے، یا اس کو کسی کتاب میں نازل کیا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے، یا اسے اپنے ہی پاس رکھا ہے، یا تیرے علم میں ہے، میں ہر اس نام کے واسطے سے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن پاک کو میرے دل کی بہار بنادے (یعنی جس طرح موسم بہار کے سبزہ، پھول اور پھلوں کو دیکھ کر لوگوں کے دل مسرور ہوتے ہیں، اسی طرح قرآن کو میرے دل کی بہار بنادے کہ یہ اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جائے، قرآن کو میرے دل کا نور بنادے اس کے ذریعے میرے غم اور اندیشوں کو دور فرمادے۔

قرآن کے نام قرآن میں

قرآن حکیم کے بہت اسماء خود قرآنی آیات میں ذکر ہوئے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب اپنے ناموں کے لحاظ سے بھی کس قدر تمام کتابوں سے بلند اور فائق ہے۔

اَلْقُرْآن: ارشاد ربانی ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ {البقرۃ {۱۸۵}

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔

لفظِ قُرآن اس عظیم کتاب کا مشہوراور معروف نام ہے اور یہ اسی کے لئے خاص ہے، کسی اور کتاب کا یہ نام نہیں ہو سکتا، جس طرح رب العالمین کا عظیم نام اللہ اسی کا نام ہے کسی انسان اور کسی بشر کا نہیں ہو سکتا اسی طرح قرآن کا یہ نام کسی اور کتاب کا نام بھی نہیں ہو سکتا، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ایسا نام ہے جو کسی سے مشتق نہیں ہے، آسانی کے لئے لفظ قُرآن پڑھا جاتا ہے {الرسالہ}

بعض حضرات نے اسے مشتق مانا ہے، کہ لفظ قُرآن قَرَأَ فعل ماضی کی مصدر ہے اور یہ مصدر {قُرآن} اللہ تعالیٰ کی اس محبوب کتاب کا اسم علم ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس پر اُتارا ہے، جس کا معنی ہے پڑھی جانے والی کتاب، جو صحیفوں اور سینوں کے سفینے میں محفوظ ہے، جو بلاشبہ نقل متواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ مصدر کو اسم علم بنانا کلام عرب میں غیر مانوس نہیں ہے، جیسے رَعد، وَعد، سَعد، تغرید، سداد۔ لغتِ عرب میں لفظ قَرَأَ دو معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک بمعنی تلاوت اور ان حروف کے نقشوں کو پڑھنا جو دکھائی دیتے ہیں اور کبھی اس کا اطلاق صرف زبانی پڑھنے پر بھی ہوتا ہے۔

دوسرا قَرَأَ کا معنی ہے جمع کرنا اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا، پہلے معنی کے لحاظ سے قرآن کا معنی یہ ہو گا کہ ایسی کتاب جو دن اور رات کی ساعات میں مساجد اور علمی اداروں میں پڑھی جانے والی ہے۔ اسی لئے حضرت جبریل علیہ السلام نے ہمارے پیارے نبی ﷺ سے جو پہلی ملاقات غار حِراء میں کی تھی اس میں بھی لفظ اِقرَأ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کر دیا تھا، یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل کی وساطت سے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا۔

پتا چلا کہ انسان جن چیزوں کا مکلف ہے ان میں سب سے بہترین چیز تلاوت ہے، پڑھنا ہے اور انسان کے بہترین اوصاف میں سے یہ ایک عمدہ وصف ہے، تو بہت ہی مناسب یہ ہے کہ انسان کی تعریف بھی اسی لفظ کے ساتھ کی جائے، اہل منطق نے جو انسان کی تعریف کی ہے حَیَوَانٌ

نَاطِقٌ (بولنے والا جانور) اس کی بجائے انسان کی تعریف یوں کی جائے اَلْاِنْسَانُ حَیْوَانٌ قَارِئٌ (انسان پڑھنے والا ہے) کبھی وہ کہتے ہیں کہ الانسان ضاحک، کبھی وہ کہتے ہیں کہ اَلْاِنْسَانُ نَاطِقٌ، تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ان کی بجائے انسان کے اشرف اوصاف کا ذکر کیا جائے، جس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ گویا یہ انسان کا وصف ذاتی ہے۔

اور قرأت کے ساتھ وحی کی ابتدا بھی ہوئی ہے، اور یہ وہ پہلا لفظ ہے جسے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے پیارے اور مبارک کانوں نے فرشتے کی زبان سے سنا تھا، اس لفظ سے آپ ﷺ کی نبوت کی ابتدا ہوئی، اس سے آپ ﷺ کی رسالت کا اظہار ہوا تھا، اس لفظ میں اسلام، پیغمبر اسلام کی بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم کتاب کا قاری ہے، جیسے ارشاد ربانی ہے

{فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ} جب ہم اس قرآن کو پڑھیں تو آپ ﷺ اس کی اتباع کیا کریں۔

جبریل جو تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کر رہے ہیں، پھر اپنے نبی ﷺ کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ آپ ﷺ اس کی پیروی کریں۔

دوسرے مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ قرآن ذکر کیا ہے، ارشاد ہے

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ {النحل ۹۸}

سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ لے۔

ایک اور مقام پر لفظ قرآن آیا، ارشاد ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ {المزمّل ۲۰}

پس پڑھو جتنا قرآن میں سے آسان ہو۔

قرآن کا لفظ قرأت یعنی پڑھنے کے معنی میں بہت سے مقامات پر آیا ہے اور قرآن کا لفظ قرأ بمعنی جمع کرنا بھی آیا ہے، اس معنی کے لحاظ سے قرآن مجموع ہے متفرق نہیں ہے، محفوظ ہے بکھری ہوئی کتاب نہیں ہے، ضائع ہونے سے بچائی ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، ارشاد ہے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ {الحجر } بے شک اس قرآن کو اُتارنے والے ہم ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ بھی ہے کہ قرآن کو قرآن اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ وعدے وعید، حِکَم وامثال، قصص واَحکام، اورآیات وسورتوں کی جامع کتاب ہے۔

اَلفُرقَان: قرآن کا دوسرا نام فرقان ہے، جیسا کہ ارشاد ہے،

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا {الفرقان ۱ }

بابرکت ہے وہ ذات جس نے فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ جہان والوں کو ڈرائے۔

فرقان یہ مصدر ہے، فَرَقَ، فَرَّقَ سے، فُعلان کے وزن پر ہے، فرق اور فَرّقَ اس کے مشتقات ہیں، یہ دو کاموں کے درمیان فرق کرنے پر دلالت کرتا ہے، یا دو چیزوں کے درمیان فرق کرنے پر یہ دونوں لفظ دلالت کرتے ہیں، یعنی ان دونوں میں جدائی کے لئے آتے ہیں، عربی زبان میں کہا جاتا ہے

فَرَّقَ القَاضِيْ بَيْنَ الخُصُوْمِ: قاضی نے دونوں فریقوں میں فیصلہ کیا۔

فرقان کا معنی ہے ہر وہ چیز جس کے ساتھ حق اور باطل کے درمیان فرق کیا جائے، اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن کو قرآن میں یوم الفرقان کہا ہے۔ فرقان دلیل اور برھان کو بھی کہا جاتا ہے، اس نام سے قرآن میں ایک سورت بھی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں موسیٰ کے معجزات کا ذکر ہے وہاں بھی لفظ فرقان استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ {البقرہ ۵۳ }

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کیے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِلْمُتَّقِينَ {الانبیاء ۴۸ }

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت و گمراہی میں) فرق کر دینے والی اور (سر تاپا) روشنی اور نصیحت (کی کتاب) عطا کی (یعنی) پرہیز گاروں کے لئے۔

یہاں فرقان سے مراد دلائل اور معجزات ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطاء فرمائے تھے جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنے والے تھے۔ لغوی معنی کے لحاظ سے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری جانے والی تمام ہی کتابیں فرقان ہیں، مگر اصطلاحی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ صرف قرآن کے نام کے طور پر ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اس آیت کے مفہوم کے بھی خلاف نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کے لئے بصیرت پیدا کر دیتے ہیں۔ ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ {الانفال ۲۹}

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

البُرھَان: قرآن کا تیسرا نام بُرھان ہے، یہ بَرھَنَ ماضی کی مصدر ہے، بُرھان کا لغوی معنی ہے حجت، دلالت، بیان، عربی میں کہا جاتا ہے، بَرْھَنَ عَلَيْهِ اس کا معنی ہے وہ دلیل لایا، بَرْھَنَه کا معنی ہے اس نے دلیل کے ساتھ بیان کیا۔ حجت کو بُرھان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں وضاحت اور واشگافی ہوتی ہے۔ اہل اصول کے نزدیک برھان اسے کہتے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرے، صحیح اور فاسد کے درمیان امتیاز کرے، اس بیان کے ذریعے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اہل منطق کے نزدیک بُرھان اس قیاس کو کہا جاتا ہے جو قطعی مقدمات سے مرکب ہو، قطعی نتیجہ کے لئے۔ قرآن میں یہ نام یوں آیا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (النساء ۱۷۴)

لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیل (روشن) آچکی ہے، اور ہم نے (کفر اور

ضلالت کا اندھیرا دور کرنے کو) تمہاری طرف چمکتا ہوا نور بھیج دیا ہے۔

مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں نور مبین سے مراد قرآن ہے، البتہ برھان کے بارے میں حضرت ابن عباس اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ آیت میں برھان سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں (ابن عساکر) بعض برھان سے قرآن مراد لیتے ہیں، تفسیر تیسیر القرآن میں ہے، قرآن برہان کیوں ہے؟ برہان ایسی واضح دلیل کو کہتے ہیں کہ فریقین کے درمیان فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن اس لحاظ سے برہان ہے کہ اس نے اپنے مخالف تمام کفار کو چیلنج کیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ کسی انسان کا کلام ہے تو تم سب مل کر اور ایک دوسرے کی مدد کر کے قرآن جیسی ایک سورت ہی بنالاؤ۔

لیکن عرب بھر کے تمام فصحاء، بلغاء اور شعراء ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہ گئے۔ اسی ایک چیلنج سے تین چیزوں کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ثبوت بھی ایسا ہے جو فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، وجود باری تعالیٰ کا ثبوت، قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کا ثبوت اور آپ کی نبوت کا ثبوت۔ اسی لحاظ سے قرآن کو برہان کہا گیا ہے اور نور مبین اس لحاظ سے ہے کہ ہدایت انسانی یعنی دنیوی طریق زندگی اور اخروی نجات کے لیے زندگی کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والا ہے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

بعض کہتے ہیں کہ برھان سے مراد وہ دین حق ہے جو حضرت نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں۔

لیکن قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں برھان سے قرآن ہی مراد ہے۔ محمود آلوسی رحمہ اللہ کی روح المعانی کی عبارت بھی اسی کی تائید کرتی دکھائی دیتی ہے۔

الحکیم: چوتھا نام الحکیم ہے، جیسے ارشاد ہے **یٰس (۱) وَالْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ** {یس) یٰسین، قرآن حکمت والے کی قسم۔

حکیم فعیل کے وزن پر صفت ہے، فعول کے معنی میں ہے، یعنی محکم اور مضبوط، جیسے قتیل کا معنی ہے مقتول، شہید کا معنی ہے مشہود، الحکیم اللہ تعالیٰ کا بھی صفاتی نام ہے، اس کی ماضی حَکَم

اور حَكُمَ دونوں آتی ہے، اس کی مصدر حُكْماً اور حِكْمَةً آتی ہے۔ حَكَمَ کا معنی ہے اس نے فیصلہ کیا، جیسا کہ ارشاد ہے

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ {البقرہ ۱۱۳}

پھر اللہ قیامت کے دن ان باتوں کا جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں خود فیصلہ کرے گا۔

قرآن حکیم کو اس نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے، ارشاد ہے

ذٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ {آل عمران ۵۸}

ہم آیات میں سے آپ پر تلاوت کرتے ہیں اور ذکر حکیم میں سے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے

الٓرٰ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ {یونس ۱} یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

المجید: پانچواں نام المجید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ {ق ۱} اللہ تعالیٰ ق اور قرآن مجید کی قسم کھاتے ہیں۔

مجید یہ قرآن کا وصف ہے۔ مجید اسم مفعول کا صیغہ ہے، فعیل کے وزن پر فاعل کے معنی میں، یعنی مجید ماجد کے معنی میں ہے، علامہ ابن ہشام نے اسے فعیل کے وزن پر ماننے سے انکار کیا ہے، کہ اس وزن پر یہ فاعل کے معنی میں نہیں ہے، لیکن انہیں ماننا چاہیے تھا اس لئے کہ جب شہید بمعنی شاہد آسکتا ہے تو یہ بھی آسکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مجید مبالغہ کے لئے وصف ہے اس کا معنی ہے وافر بزرگی۔ مجید بزرگی والے کو کہا جاتا ہے۔

اَلْكِتَاب: چھٹا نام الکتاب ہے، قرآن میں یہ نام دو سو تیس بار آیا ہے، الکتاب کا اطلاق سابقہ کتب سماویہ، قرآن حکیم اور دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

الٓمٓ ۰ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ {البقرہ ۱، ۲}

الم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس میں متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

اسی طرح ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ ۲) وہ ذات جس نے بھیجا امیوں میں ایک عظیم الشان رسول انہی میں سے، جو ان پر کتاب کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کے دلوں کی صفائی کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

الکتاب یہ اسم مصدر ہے کتب یکتب سے، اس کا لغوی معنی ہوتا ہے جمع کرنا، اس کے علاوہ یہ غرض، حکم، تقدیر، قضاء، اثبات، مکتوب، ثبوت، موت، رسالت، پر بھی بولا جاتا ہے۔

اَلذِّکر: ساتواں نام ہے ذِکر، ارشاد ہے ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ { آل عمران ۵۸ } یہ آیتیں ہم تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں اور نصیحت حکمت والی۔ اسی طرح ارشاد ہے

وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ {الحجر ۶} اور انہوں نے کہا: اے وہ شخص! جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے بیشک تو مجنون ہے۔

الذِکر یہ اسم مصدر ہے ذَکر یَذکُرُ کا، اس کی جمع اذکار آتی ہے، لفظ ذکر اپنے مفعول کی طرف عن، لام اور علی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ ارشاد ہے

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا {البقرہ ۲۰۰}

جب تم مناسک ادا کر چکو تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یعنی اُذکُرُوا اللہ [عَلٰی] هَیئَةِ ذِکرِکُم لِآبَائِکُم أَو أَشَدَّ ذِکراً

اور جب یہ علی کے بغیر متعدی ہو تو ذکر قلبی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ { آل عمران ۱۳۵ } اور وہ لوگ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھیں یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور سوائے اللہ کے اور کون گناہ بخشنے والا ہے اور اپنے کیے پر وہ اڑتے نہیں اور وہ جانتے ہیں۔

اَلْمُبِیْن: آٹھواں نام المبین ہے۔ ارشاد ہے

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ {۱۵} يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ {المائدہ۱۵و۱۶ }

بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے۔ {۱۵} اللہ سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اسے جو اس کی رضا کا تابع ہو اور انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے {۱۶}

یہاں قرآن کو نور کہا گیا ہے اور مبیناً اس کا وصف ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ {الشعراء ۲ } یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔

اسی طرح ارشاد ہے حٰمٓ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ { الزخرف ۱ و ۲ } قسم ہے واضح کتاب کی۔

مبین یہ بانَ سے ہے۔ اس کا معنی ہے واضح، روشن۔

اَلْعَظِیْم: نواں نام العظیم ہے۔ العظیم یہ مصدر ہے عَظَّم، عَظم سے، عظیم فعیل کے وزن پر ہے بمعنی معظوم اور معظّم، حقیقتاً کوئی چیز بڑی ہو تو اسے عظیم کہا جاتا ہے۔ عظیم اس ہستی کو کہا جاتا ہے جس کی کنہ اور حقیقت کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔

قرآن حکیم کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہے { وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرآنَ الْعَظِيمَ } البتہ تحقیق ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جانے والی آیات اور قرآن عظیم عطاء کیا ہے۔

اس سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے، اس لئے کہ اس کی سات آیات ہیں اور یہ بار بار دہرائی بھی جاتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سات امور ہیں، جو قرآن میں ذکر ہوئے، امر، نہی، بشارت، ضرب الامثال، نعمتوں کی تعداد، امتوں کی خبریں، بعض کہتے ہیں اس سے مراد سات لمبی

سورتیں ہیں، بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف، انفال۔

اَلنُّور: دسواں نام نور ہے۔ ارشاد ہے وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا {النساء ۱۷۴} اور ہم نے آپ کی طرف واضح نور اتارا۔ نور۔ نارَ یَنِیر اور اَنارَ یُنِیر سے مصدر ہے۔ نور کا لغوی معنی ہے روشنی، جو اشیاء کو واضح کر دے اور آنکھوں کو ان کی حقیقت دکھائے۔

اَلمُهَیمِن: گیارہواں نام اَلمُهَیمِن ہے۔ ارشاد ہے

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا {المائدۃ/۴۸} ہم نے تجھ پر سچی کتاب اتاری ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کے مضامین پر نگہبانی کرنے والی ہے، سو تو ان میں اس کے موافق حکم کر جو اللہ نے اتارا ہے اور جو حق تیرے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے۔

قرآن میں صرف یہی آیت ہے جس میں لفظ اَلمُهَیمِنُ کے ساتھ اس عظیم کتاب کو موصوف کیا گیا ہے۔ یہ هَیمَنَ فعل ماضی کا اسم ہے، اس فعل سے یہ صیغے اس کے وزن پر آتے ہیں، سَیطَرَ، وبَیطَرَ، وخَیمَرَ۔ زجاج نے بَیقَرَ زیادہ کہا ہے۔ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان پانچ وزنوں کے علاوہ چھٹا نہیں ہے۔ اس کا لغوی معنی ہے گواہ، اسی طرح اس کا ایک معنی ہے نگہبان، کسی چیز کا نگران، کسی چیز کا محافظ۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک ہے، ارشاد ہے

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ {۲۲} هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ {۲۳} هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ {۲۴}{الحشر ۲۲ تا ۲۴ }

وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، سب چھپی اور کھلی باتوں کا جاننے والا ہے وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ بادشاہ پاک ذات، سلامتی دینے والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست خرابی کا درست کرنے والا بڑی عظمت والا ہے، اللہ پاک ہے، اس سے جو اس کے شریک ٹھہراتے ہیں، وہ اللہ خالق ہے، باری ہے، مصور ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

اَلْحَقُّ: بارہواں نام الحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نام کو کئی بار دہرایا ہے، ارشاد ہے

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (البقرہ ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں ہم تو اسی کو مانتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا ہے اور وہ اسے نہیں مانتے جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے کہہ دو پھر تم کیوں اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے؟

الحق یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے بھی ہے، یہ حَقَّ یَحِقُّ حقًّا سے ہے باب ضرب یضرب، حق کا لغوی معنی ہے موافقت اور مطابقت۔ قرآن کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں ثبات اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی سچی کتاب ہے۔

النباء: تیرہواں نام ہے النباء۔ یہ نبأ کی مصدر ہے، جس کا معنی ہے خبر دینا۔

ابو البقاء حنفی کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر نباء خبر ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے فَعَمِیَتْ عَلَیْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ یَوْمَىٕذٍ فَهُمْ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ{ القصص ٦٦ } پھر اس دن انہیں کوئی بات نہیں سوجھے گی پھر وہ آپس میں بھی نہیں پوچھ سکیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ{یوسف ۱۵ } تو ضرور انہیں ایک دن آگاہ کرے گا ان کے اس کام سے اور وہ تجھے نہ پہچانیں گے۔

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ خبر تب تک نباء نہیں کہلاتی جب تک اس میں تین شرطیں نہ پائی جائیں نباء فائدہ مند خبر کو کہا جاتا ہے نباء وہی خبر ہے جس سے علم حاصل ہو یا ظن غالب نباء کا حق یہ ہے کہ وہ جھوٹ سے خالی ہو۔ اسی سے لفظ نبوت بھی ہے جس کا معنی ہے اللہ اور اس کی مخلوق میں سے ذوی العقول کے درمیان سفارت۔ اسی سے لفظ نبی بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخلوق کو خبر دیتا ہے۔ النبی کا لفظ مصغر نہیں ہوتا، کیونکہ معظم اسماء کی تصغیر ممنوع ہے۔ نباء کا لفظ قرآن میں آیا ہے، ارشاد ہے

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (٦٥) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (٦٦) قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيْمٌ (٦٧) أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ{ص}

فرما دیجیے بے شک میں ڈرانے والا ہوں، اکیلے قہار اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے، فرما دیجیے وہ بڑی خبر ہے تم اس سے منہ موڑتے ہو۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے سورہ ص میں نباء سے مراد قرآن ہی لیا ہے۔

البلاغ: چودھواں نام البلاغ ہے۔ البلاغ مصدر بمعنی تبلیغ کے ہے، ارشاد ہے

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ{ النور ۵۴ } نہیں ہے رسول پر مگر پہنچانا واضح۔ تبلیغ رسالت کا قرآن میں جگہ جگہ ذکر ہے، البلاغ اسے کہتے ہیں جس کے ذریعے غایت تک پہنچا جائے۔ قرآن کریم میں دو مقامات پر قرآن کو بلاغ کہا گیا ہے، ارشاد ہے

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ (٤٩) سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (٥٠) لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (٥١)

هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (۵۲){إبراهيم)

آپ اس دن گنہ گاروں کو دیکھیں گے کہ زنجیروں میں ملے جلے ایک جگہ جکڑے ہوئے ہوں گے ان کے لباس گندھک کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں پر چڑھی ہوئی ہو گی، یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ دے، بے شک اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگے گی، یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے اطلاع نامہ ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ ہوشیار کر دیے جائیں اور بخوبی معلوم کر لیں کہ اللہ ایک ہی معبود ہے اور تاکہ عقلمند لوگ سوچ سمجھ لیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۳۵){الأحقاف}

پس اے پیغمبر! آپ ایسا صبر کریں جیسے بلند ہمت رسولوں نے کیا اور ان کے لیے (عذاب طلب کرنے میں) جلدی نہ کریں، یہ جس دن اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کا وعدہ دیے جاتے ہیں تو (یہ معلوم ہونے لگے گا کہ) دن کی ایک گھڑی ہی (دنیا میں) ٹھہرے تھے، یہ ہے پیغام پہنچا دینا پس بدکاروں کے سوا کوئی ہلاک نہ کیا جائے گا۔

یعنی یہ قرآن نصیحت کے لئے کافی ہے، ان لوگوں کے جو آپ ﷺ کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کی باتوں پر آپ ﷺ صبر کریں، ان پر اس قرآن کے ذریعے اتمام حجت کر دی گئی ہے، بلاغ (پہنچا دینا) نبی کا کام ہے مگر جب اس کی نسبت قرآن کی طرف کی گئی تو گویا فضیلت میں زیادتی ہے۔

اَلْمَكْنُوْنُ: پندرہواں نام المکنون ہے کَنَّ اور کَنَنَ سے اسم مفعول ہے اس کا مضارع یکنُّ آتا ہے، ایک مقام پہ قرآن میں تُكِنُّ آتا ہے، أَكَنَّ يُكِنُّ سے، جس کا معنی ہے چھپانا۔ كِن کا معنی ہے ہر چیز کا بچاؤ اور اس کا پردہ، اَكَنَّ کا معنی ہے پوشیدہ رکھنا۔ كِنَان پردے کو کہا جاتا ہے۔ ایک آیت میں قرآن کو مَكْنُون کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے، ارشاد ہے

{فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ} (الواقعة: ۷۹) یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے) جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے، جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

اَلْكَرِيْمُ: لفظ کریم تو قرآن کے ساتھ عموماً بولا اور کہا جاتا ہے، باقی صفات کے علاوہ اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، مگر اس کا ذکر قرآن میں صرف ایک جگہ پر آیا ہے، جیسے ارشاد ہے۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعة: ۷۷) یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ ایک بہت بڑی قسم کھا رہے ہیں کہ یہ قرآن کریم ہے۔ كَرِيمٌ فَعِيلٌ کے وزن پر صفت ہے، كَرُمَ يَكْرُمُ سے۔

اَلشِّفَاءُ: ستر ہواں نام الشفاء ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا

اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمانداروں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں اور ظالموں کو اس سے اور زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔{الاِسراء ۸۲ }

اسی طرح سورت یونس کی آیت ۵۷ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس) اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا تمہارے پاس آئی ہے اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ {فصلت ۴۴)

اور اگر ہم اسے عجمی زبان کا قرآن بنا دیتے تو کہتے کہ اس کی آیتیں صاف صاف بیان کیوں نہیں کی گئیں کیا کتاب عجمی ہے اور یہ رسول عربی ہے؟ کہہ دو یہ ایمان داروں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور

جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کان بہرے ہیں اور وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے وہ لوگ (گویا کہ) دور جگہ سے پکارے جارہے ہیں۔ اَلشِّفَاءُ یہ شَفِیَ یَشْفٰی کی مصدر ہے، شِفَاءٌ کا اصل معنی ہوتا ہے دواء۔

قرآن میں حقیقۃً بیماریوں کی شفاء ہے، اس بارے میں دو قول نقل کئے گئے ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اِنَّ الْقُرْآنَ یَشْفِیْ مِنَ الْأَمْرَاضِ الْبَدَنِیَّةِ، کَمَا یَشْفِیْ مِنَ الْأَمْرَاضِ الْقَلْبِیَّةِ کہ قرآن بدنی بیماریوں سے شفاء دیتا ہے، جیسے دلی امراض سے شفاء دیتا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس حدیث پاک سے استدلال کیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس شخص کے دل کو تکلیف ہو اسے چاہیئے کہ وہ قرآن پڑھے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن دلوں کی بیماریوں کے لئے شفاء ہے۔ ارشاد ہے

{إِقْرَإِ الْقُرْآنَ .. یَقُوْلُ اللّٰهُ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ} ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے گلے میں درد کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: { عَلَیْكَ بِقِرَأَةِ الْقُرْآنِ } تو قرآن پڑھا کر۔ علامہ محمود آلوسی نے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے اس استدلال کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔

خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قرآن جسمانی امراض کی شفاء نہیں ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے شفاءٌ لما فی الصدور فرمایا ہے، کہ یہ روحانی بیماریوں کے لئے شفاء ہے، نہ کہ جسمانی بیماریوں کے لئے۔ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے سیوطی کے استدلال کو رد کرنے کے بعد یہ بات تسلیم کی ہے کہ یہ عظیم کتاب پڑھنے سے برکت حاصل ہوتی ہے، اس کے سبب سے اللہ تعالیٰ بیماریاں اور دردیں ختم کر دیتے ہیں، ہم تو صرف اس آیت شفاء سے استدلال کرنے کی نفی کر رہے ہیں، آلوسی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ قلب کی بیماری قالب کے لیے نقصان دہ ہے، یعنی دل کی بیماری جسم کے لیے نقصان دہ ہے، دل میں حسد اور کینہ پیدا ہوتا ہے جو جسم انسانی کے لیے نقصان دہ ہے جس طرح وہ روح انسانی کے لیے نقصان دہ ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن ان بیماریوں کے لیے شفاء ہے جو ہلاکت کی طرف لیجاتی ہیں، جیسے جہالت،

شک، شرک اور نفاق اور قرآن حکیم انہی کی طرف توراہنمائی کرتا ہے، کہ کیا چیز مناسب ہے اور کون سی چیز مناسب نہیں ہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے کہ شہد میں تمام لوگوں کے لئے شفاء ہے، تو یہ قالب کی شفاء کے لئے ہے، اسے سب مانتے ہیں کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے، قرآن اسے اہل ایمان کے لئے شفاء قرار دیتا ہے اور سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اور سورۃ یونس میں لوگوں کو یہ جو خطاب کیا گیا

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ {یونس} اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا تمہارے پاس آئی ہے اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ (سورۃ یونس ۵۷) یہاں خطاب کا آغاز اَلنَّاسُ لوگو! کے لفظ سے ہے، اور انتہاء بِالْمُؤْمِنِيْنَ کے لفظ پر ہو رہی ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے نفس بشری کے کمال کے کئی مراتب ہیں، جس نے قرآن کو تھام لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے ایسے کام سے اپنے ظاہر کو صاف پاک رکھنا ہے جو نامناسب ہے، اس کی طرف "موعظہ" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے، دوسرا باطن کو پاک رکھنا ہے عقائد فاسدہ سے اس کی طرف "شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْر" سے اشارہ کیا گیا ہے، تیسرا نفس کو سچے عقائد کے ساتھ اور عمدہ اخلاق کے ساتھ مزین کرنا، اس کی طرف "بالْهُدٰى" کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، چوتھا رحمت الٰہیہ کے انوارات کی تجلی ان لوگوں کے لئے خاص ہے جو کامل درجے کے ہیں، جو ظاہری اور باطنی کمال حاصل کرتے ہیں، تو قرآن اس میں ترھیب (ڈرانا) اور ترغیب (شوق دلانا) کا وعظ ہے، تو معلوم ہوا کہ سب کے لئے یہ شفاء ہے۔ ان سب کا راہبر ہے اور ان سب کو ان کمالات تک پہنچاتا ہے۔

البُشریٰ: اٹھارہواں نام بُشریٰ ہے، ارشاد ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِيْنَ {البقرۃ ۹۷}

کہہ دو جو کوئی جبرائیل کا دشمن ہو سو اسی نے اتارا ہے وہ قرآن اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر، ان کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے ہیں اور ایمان والوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ بُشریٰ کا معنی ایسی بات کی خبر دینا جو انسان کو خوش کر دے۔ بشارۃ ایسی خبر کو کہا جاتا ہے جو چہرے کے رنگ کو بدل دے، چاہے خوش کن خبر ہو یا پریشان کن۔ بشارت کا زیادہ تر استعمال اچھی خبر پر ہی ہوتا ہے۔

سورۃ البقرہ کے علاوہ بھی قرآن کو بشریٰ کہا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل ۸۹) اور ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا کافی بیان ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے۔ اسی طرح فرمایا:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ، تو کہہ دے اسے تیرے رب کی طرف سے پاک فرشتے نے سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ ایمان والوں کے دل جمادے اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ {النحل ۱۰۲}

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ {النمل } ایمان داروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایمان والوں کے لئے خوشخبری بنایا ہے۔

المُنذِر: انیسواں نام المنذر ہے، ارشاد ہے قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُل لَّا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ {الأنعام ۱۹ }

تو پوچھ سب سے بڑا گواہ کون ہے کہہ دو اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن اتارا گیا ہے تاکہ تمہیں اس کے ذریعہ سے ڈراؤں اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور بھی کوئی معبود ہیں کہہ دو میں تو گواہی نہیں دیتا کہہ دو وہی ایک معبود ہے اور میں

تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

یہاں اِنذار نبی ﷺ کی طرف منسوب ہے، منذِر اصل میں نبی اکرم ﷺ کی ذات ہے، اِنذار کی نسبت ہم آپ ﷺ کی ذات کی طرف الحاق المسبب بسببہ کے طور پر کرسکتے ہیں، تو انذار کا سبب آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے اور مسبب وہ قرآن کا آنا ہے، قرآن میں یہ لفظ کئی جگہوں پہ استعمال ہوا ہے، مثلاً لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ تاکہ آپ ﷺ ام القریٰ (مکہ) والوں کو ڈرائیں۔ اسی طرح لِتُنذِرَ بِهِ تاکہ آپ ﷺ اس کے ذریعے ڈرائیں۔ انذار، نذیر اس مادے سے جتنے بھی الفاظ آئے ہیں ان سے مراد آپ ﷺ کی ذات ہے اور کسی طور پر ان کی نسبت قرآن کی طرف بھی ہوتی ہے۔

التبیان ،البیان: بیسواں نام بیان ہے، ارشاد ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل ۸۹) اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کو کھل کر بیان کرنے والی ہے، ہدایت، رحمت اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔

بیان خلاف قاعدہ تَفعال کے وزن پر مصدر ہے، تِفعال کے وزن پر بھی آتا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ تَفعال کے وزن پر آئے، جیسے تَذکَارُ، تَکرَارُ، تَحنَانُ۔ اور تِبیَانُ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ اسم ہے مصدر نہیں ہے تِکلَامٌ، تِلقَاءٌ، تِلعَابٌ، تِمرَادٌ، تِلقَافٌ تِجفَافٌ تِهوَاءٌ، تِنبَالٌ، تِعشَارٌ، تِترَاكٌ، تِمثَالٌ، تِفَاقٌ، تِعصَارٌ، تِنبَالٌ، تِعشَارٌ اور اسی طرح تِمسَاحٌ۔

فَالبَیَانُ: جَعلُ الشَّیءِ مُبَیِّناً مَّعَ الحُجَّةِ بیان کا معنی ہے کسی چیز کو دلیل کے ساتھ واضح کرنا تِبیان کا معنی ہے دلیل کے ساتھ کسی چیز کو ثابت کرنا۔ ارشاد ہے تِبیَاناً لِّکُلِّ شَیءٍ {النحل / ۸۹} ہر چیز کے لیے واضح بیان ہے۔

الجامع: اکیسواں نام الجامع ہے۔ یہ نام قرآن میں نہیں ہے اور نہ ہی قرآن اس نام کے ساتھ موصوف ہے، بلکہ اھل علم نے مختلف آیات کو سامنے رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔

جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ{ الأنعام ۳۸ } اور کوئی چلنے والا زمین میں نہیں اور نہ کوئی پرندہ کہ اپنے دو بازوؤں سے اڑتا ہے مگر یہ تمہاری ہی طرح کی جماعتیں ہیں ہم نے ان کی تقدیر کے لکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی پھر سب اپنے رب کے سامنے جمع کیے جائیں گے۔

کسی چیز میں عدم تفریط اس کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے، قرآن کہتا ہے کہ ہم نے کسی چیز میں کمی نہیں چھوڑی، نہ کمی کی، نہ کوئی چیز چھوڑی، نہ کوئی چیز ضائع کی، نہ ہم کسی چیز سے غافل ہوئے۔ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

المُبارَك: بائیسواں نام المبارک ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا، اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے برکت والی ہے ان کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے تھیں اور تاکہ تو مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائے۔ (سورۃ الانعام آیت ۹۲)

مبارک یہ مصدر میمی ہے، بارک یبارک سے۔ بڑھنا اور زیادہ ہونا، چاہے حسّی ہو یا معنوی۔ مُبارک وہ ہے جس میں خیر ہو۔ قرآن کو اس لئے یہ نام دیا گیا کہ اس میں کتب سماویہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ چیزیں موجود ہیں، یہ ان کے لئے ناسخ ہے، اس میں بہت زیادہ فوائد ہیں، نفع اور خیر اور دونوں جہان کے فوائد اس میں موجود ہیں۔ اولین اور آخرین کے علوم اس میں موجود ہیں، اس میں دینی اور دنیوی فوائد ہیں۔ اس میں موجود علوم پر بحث کرنے والا دنیا کی عزت اور آخرت کی سعادت سمیٹتا ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی خدمت کے ثمرات دنیا میں مشاہدہ کئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کی اخروی سعادتوں سے محروم نہ کرے اللہ تعالیٰ سے یہ مانگتے رہنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ{ الأنعام ۱۵۵ } یہ برکت

والی کتاب ہم نے اتاری ہے سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ {الأنبياء ۵۰ اور یہ ایک مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے پھر کیا تم اس کے بھی منکر ہو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ {ص ۲۹} یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی، بڑی برکت والی تا کہ وہ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تا کہ عقلمند نصیحت حاصل کریں۔

المُیَسَّر: تئیسواں نام المُیَسَّر ہے، ارشاد ہے فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا {مریم ۹۷} سو ہم نے قرآن کریم کو تیری زبان میں اس لیے آسان کیا ہے کہ تو اس سے پرہیز گاروں کو خوشخبری سنادے اور جھگڑنے والوں کو ڈرادے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ {الدخان ۵۸} اس قرآن کو ہم نے آپ کی زبان میں آسان کر دیا تا کہ وہ سمجھیں۔ یہ دونوں آیات اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ قرآن کریم آسان کتاب ہے، قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ذکر، تلاوت، حفظ کے لئے آسان بنایا ہے۔

الھُدیٰ: چوبیسواں نام ھدیٰ ہے، ارشاد فرمایا ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ {البقرۃ ۲} اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے، متقی لوگوں کے لئے ھدایت ہے۔

عربی زبان میں ھُدیٰ مصدر کے وزن پر بہت کم مصادر آئے ہیں، جیسے التُقیٰ، والسُریٰ، والبُکیٰ یہاں ھُدیٰ بمعنی ھَادِی کے ہے۔ ھُدیٰ کا معنی ہے دلالت کرنا، راہنمائی کرنا۔ قرآن میں ایک کم اسی مرتبہ آیا ہے، اس کا اطلاق قرآن حکیم پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا اطلاق تورات، انجیل اور جو کچھ ہمارے نبی ﷺ لائے اس پر ہوتا ہے۔ قرآن ہدایت ہے، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ضَمِنَ اللهُ تَعَالٰى لِمَنْ تَبِعَ الْقُرْآنَ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا، وَلَا يَشْقٰى فِي الْآخِرَةِ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کی اتباع کرنے والے کا ضامن ہے کہ وہ دنیا میں نہ گمراہ ہو گا اور نہ ہی آخرت میں بدبخت ہو گا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۱۳۶)

اَلرَّحمَۃُ: پچیسواں نام الرحمت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل ۸۹)

دوسری جگہ ارشاد ہے

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا {الاسراء ۸۲}

یہاں رحمت بطور نام کے کہا جاسکتا ہے، مگر خود لفظ رحمت قرآن میں کئی معانی کے لئے استعمال ہوا ہے جیسے * رحمت بمعنی اسلام: {وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ} {البقرۃ ۱۰۵} اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرلیتا ہے جسے چاہے۔

*رحمت بمعنی ایمان: {وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ} {ھود ۲۸} اور اس نے مجھ پر اپنے ہاں سے رحمت بھیجی ہو۔

*رحمت بمعنی جنت: {فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ} {آل عمران ۱۰۷}

اور وہ لوگ جن کے منہ سفید ہوں گے} تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

*رحمت بمعنی بارش: وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ (الأعراف ۵۷

اور وہی ہے جو مینہ سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے

*رحمت بمعنی نعمت: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَأَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ (النور ۱۰)

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے {تو کیا کچھ نہ ہوتا}

*رحمت بمعنی نبوت: {وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱) أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ} {الزخرف ۳۱، ۳۲}

اور کہا کیوں یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی سردار پر نازل نہیں کیا گیا، کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں۔

*رحمت بمعنی قرآن: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي

الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۵۷) قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ

اے لوگو تمہارے رب سے نصیحت اور دلوں کے روگ کی شفا تمہارے پاس آئی ہے اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ کہہ دو (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ (یونس ۵۸)

*رحمت بمعنی رزق: أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ {ص ۹}

کیا ان کے پاس تیرے خدائے غالب فیاض کی رحمت کے خزانے ہیں۔

*رحمت بمعنی مدد: قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوْءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً (الأحزاب) کہہ دو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکے اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرنا چاہے یا تم پر مہربانی کرنا چاہے

*رحمت بمعنی محبت: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔ (الفتح}

*رحمت بمعنی وسعت: {ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ} {البقرة ۱۷۸}

یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔

*رحمت بمعنی مغفرت اور بخشش: كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الأنعام ۱۲) اس نے اپنے اوپر رحم لازم کر لیا ہے۔

*رحمت بمعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ:

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ

کہا آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہی رحم کرے اور دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی پھر ڈوبنے والوں میں ہو گیا۔ (سورۃ ھود ۴۳)

المُصَدِّق: چھبیسواں نام مصدِّق ہے، یہ وصف قرآن میں بہت سے مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، مصدِّق کا معنی اپنے سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور جو کچھ ان میں تھا اس کی

تاکید کرنے والا اور یہ ان کتب سماویہ کے پیروکاروں کے لئے حجت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ربانی ہے

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا } {المائدۃ ۴۸)

ہم نے آپ ﷺ پر سچی کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کے مضامین پر نگہبانی کرنے والی ہے سو آپ ﷺ ان میں اس کے موافق حکم کریں جو اللہ نے اتارا ہے اور جو حق آپ ﷺ کے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے۔ مصدِّق اسم فاعل کا صیغہ ہے، باب تفعیل سے، تصدیق کا معنی ہے کسی کی سچائی کا اقرار کرنا صدّیق اسی سے ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ تصدیق کرنے والا۔ یہ حضرت سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا لقب ہے، قرآن میں بھی اس وصف کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

{ .. وَالَّذِي جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ } {الزمر ۳۳ }جَاءَ بِالصِّدقِ سے مراد حضرت نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہے اور صدَّق بہ سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ لفظ صدیق کبھی واحد اور کبھی جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے، کبھی مذکر اور کبھی مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسے هِيَ صَدِيْقٌ، هُنَّ صَدِيْقٌ وَهُمْ صَدِيْقٌ وَهُوَ صَدِيْقٌ۔ قرآن میں ہے

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوْتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيْقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ

جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (٦١ النور }

اندھے پر اور لنگڑے پر اور بیمار پر اور خود تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے باپ کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان گھروں سے جنکی کنجیاں تمہارے اختیار میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے تم پر کوئی گناہ نہیں کہ مل کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ پھر جب گھروں میں داخل ہونا چاہو تو اپنے لوگوں سے سلام کیا کرو جو اللہ کی طرف سے مبارک اور عمدہ دعا ہے اسی طرح اللہ تمہارے لیے احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

المُنَزِّل : یہ ستائیسواں نام ہے، مُنَزِّل اسم مفعول ہے ،مبالغے کا صیغہ ہے،اس کا معنی ہے کثیر النزول،باب ضَرَبَ ،یضرب سے اس کا اسم مفعول **منزَل** آتا ہے،مبالغے سے مَنَزِّل ۔ نزول اوپر سے نیچے کی طرف اترنے کو کہا جاتا ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کے لئے ذکر فرمایا

{وَأَنزَلَ التَّورَاةَ والإنجِيلَ} {آل عمران ٣}

اس میں اشارہ دیا گیا ہے کہ تورات اور انجیل کا اترنا یکبارگی تھا، ایک ہی بار یہ دونوں کتابیں اتاری گئی ہیں، مگر قرآن دوبار اتارا گیا ہے، ایک بار لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے بیت العزت پر، اور پھر وہاں سے تئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا آپ ﷺ کے سینۂ اطہر پر آیا۔

نَزَلَ الْقُرْآنُ كُلُّهُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ مِنَ السَّمَآءِ الْعُلْيَا إِلَى السَّمَاءِ السُّفْلَى {تفسیر کبیر ٢١ /٤١٧)

قرآن کے لئے باب تفعیل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، ارشاد ہے

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَّالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ} {الأنعام / ١١٤ } کیا میں اللہ کے سوا اور کسی

کو منصف بناؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح کتاب اتاری ہے اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ ٹھیک تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے پس تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

پھر دوسرے مقام پہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا (۱۰۵) وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا {الإسراء ۱۰۵، ۱۰۶} اور ہم نے اس قرآن کو سچائی سے نازل کیا اور وہ سچائی سے ہی نازل ہوا اور ہم نے تجھے صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے {۱۰۵} اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تو مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اسے آہستہ آہستہ اتارا ہے۔

المُفرَّق : یہ اٹھائیسواں نام ہے، وَقُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَاَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيْلاً اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تو مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اسے آہستہ آہستہ اتارا ہے۔ (سورۃ الاسراء آیت ۱۰۶)

قرآن کو بتدریج نازل کرنے کے فوائد

مشرکین مکہ کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو یکبارگی نازل ہو جاتا۔ ہو نہ ہو یہ نبی ساتھ ساتھ اسے تصنیف کرتا جاتا ہے اور جیسے حالات ہوں اس کے مطابق لوگوں کو سناتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس قرآن کو موقع بہ موقع اور بتدریج ہم ہی نے اتارا ہے اور اس طرح وقفہ وقفہ پر اتارنے میں کئی مصلحتیں اور فوائد ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگوں کو اس کے حفظ کرنے میں آسانی رہے، نیز ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آیت کس موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، نیز یہ کہ لوگوں کو اس کے اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے اجتناب کرنے میں آسانی رہے اور اگر یکدم ہی ان پر سب اوامر و نواہی نازل کر دیتے تو سب انکار کر دیتے اور کوئی ان کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کی ہمت نہ پاتا۔ نیز یہ کہ اس طرح مختلف اوقات پر آیات نازل کرنے سے مومنوں کا ایمان زیادہ ہوتا رہتا ہے اور پختہ تر بنتا جاتا ہے ان میں مصائب کو برداشت کرنے کی قوت

اور استقلال پیدا ہوتا ہے اور یہ سب فوائد اسی صورت میں حاصل ہوسکتے تھے کہ قرآن وقفہ وقفہ سے نازل ہوتا اور اوامر ونواہی میں تدریج کو ملحوظ رکھا جاتا۔{تفسیر تیسیر القرآن}

المحفوظ: یہ انتیسواں نام ہے، **حفِظَ یَحفَظُ** سے اسم مفعول ہے، محفوظ اسے کہا جاتا ہے جس میں ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہو۔

{بَلۡ هُوَ قُرۡآنٌ مَّجِيۡدٌ فِيۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ } {البروج/۲۱، ۲۲ } بلکہ وہ قرآن ہے بڑی شان والا۔ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں محفوظ کو قرآن کی صفت مانا ہے۔ علامہ ماوردی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کو محفوظ کہا جاتا ہے۔ قاری نافع نے اسے {مَّحۡفُوۡظٍ} پڑھا ہے، بعض نے اسے مضموم پڑھا ہے، اس صورت میں یہ قرآن کی صفت ہوگی اور کسرہ پڑھنے کی صورت میں یہ لوح کی صفت ہوگی ۔اپنے اس نام کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ قرآن کتاب کی سطروں میں محفوظ ہے، قرآن اہل ایمان کے دلوں میں محفوظ ہے، اسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا، اسے کاتبین وحی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبدا لرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کتابت کے ساتھ محفوظ رکھا۔ کاتبین وحی کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے۔ اسی طرح انفرادی طور پر دنیا بھر میں کروڑوں مسلمان حافظ قرآن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر قیامت تک اس کی حفاظت کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور قرآن کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ کوئی کتاب اس طرح زبانی یاد نہیں کی گئی جس طرح قرآن حکیم یاد کیا گیا ہے۔

تذکرہ: قرآن کا ایک نام تذکرہ ہے، ارشاد ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ {المزمل}

یہ قرآن یاددہانی کی کتاب ہے۔

بَصَائِر: بصائر بصیرت کی جمع ہے، بصائر اور بصارت میں فرق یہ ہے کہ بصائر دل کی روشنی کو کہا جاتا ہے جب کہ بصارت آنکھوں کی روشنی کو کہا جاتا ہے۔ ارشاد ہے،

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ {الاعراف} یہ تمہارے رب کی طرف سے بصائر ہیں۔

روح: قرآن کا ایک معنی روح بھی ہے، ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ)

اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ ﷺ کی طرف اپنی روح نازل کی۔

قیّم: قرآن کا ایک نام قیّم بھی ہے، ارشاد ہے قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (الکھف)

اللہ تعالیٰ نے ایسی کتاب نازل کی ہے جو قیم ہے، تاکہ ڈرائے اس سخت عذاب سے جو اللہ کی طرف سے آنے والا ہے۔ قیم کا معنی ہے نگرانی اور حفاظت کرنے والا۔

مثانی: قرآن کا ایک نام مثانی ہے، ارشاد ہے كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (الزمر) جس کی آیتیں ملتی جلتی ہیں اور دہرائی جاتی ہیں۔

قرآن کریم کی مختلف آیات بینات سے قرآن حکیم کے نام یہاں ذکر کیے گئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کس قدر زبردست اور عظمت والی کتاب ہے، کیوں اسماء کی کثرت مُسَمّٰی کی عظمت شان پر دلالت کرتی ہے۔ فَاِنَّ كَثْرَةَ الْاَسْمَاءِ دَالَّةٌ عَلٰى شَرَفِ الْمُسَمّٰى جب کسی چیز کے بہت زیادہ نام ہوتے ہیں تو وہ مسمّٰی کی عظمت شان پر دلالت کرتے ہیں۔

سورۃ الفاتحہ کے نام

جس طرح قرآن کریم کے اندر قرآن کریم کے بہت سے اسماء مذکور ہیں اسی طرح قرآن کی عظیم الشان سورت سورۃ الفاتحہ کے بھی قرآن کریم اوراحادیث مبارکہ میں بے شمار نام موجود ہیں، جنہیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

فاتحۃ الکتاب: سورۃ الفاتحہ کا ایک نام فاتحۃ الکتاب ہے، فاتحۃ الکتاب کا معنی ہے جس سے کتاب کی ابتدا کی جائے، اس سورت کو فاتحۃ الکتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کتابوں اور تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے اور نماز میں قرأت کا آغاز بھی اسی سے کیا جاتا ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کا یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر کلام کا آغاز اس سے ہوتا ہے بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس کا نام فاتحہ اس لیے ہے کہ سب سے پہلی سورت آسمان سے یہی نازل کی گئی ہے۔

پھر آپ ﷺ کے ارشاد میں فاتحۃ الکتاب کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے اس سورت کو سورۃ الفاتحہ کہا جاتا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ (بخاری و مسلم)

اس کی نماز نہیں جس نے سورت فاتحہ نہیں پڑھی۔

اُمّ الکتاب: ایک نام اس سورت کا ام الکتاب ہے، سورۃ فاتحہ کا نام اُم الکتاب کیوں ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے، اسے اُمّ الکتاب اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ لکھنے میں باقی سورتوں سے پہلے لکھی جاتی ہے، گویا یہ سورتوں کی امام ہے، نبی اکرم ﷺ نے بھی اسے ام الکتاب فرمایا ہے، حضرت عائشہ کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے ہیں مَنْ صَلَّی صَلَاۃً لَّمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِأُمِّ الْکِتَابِ فَھِیَ خِدَاجٌ (مُسند احمد و سُنن ابنِ ماجہ)

جس نے نماز پڑھی اور اس میں ام الکتاب (سورۃ الفاتحہ) نہیں پڑھی تو وہ ناقص ہے۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے

{الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ} أُمُّ القرآن، وأُمُّ الْكِتَاب، وَالسَّبْعُ المثانيْ (سنن أبي داود)

الحمد للہ رب العالمین، اُم القرآن، اُمّ الکتاب اور سبع المثانی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس سورۃ کا نام اُمّ الکتاب رکھا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سورت کو ام الکتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام علوم سے مقصود یا تو عزت ربوبیت کی معرفت حاصل کرنا ہے، یا عبودیت کی ذلت کی معرفت حاصل کرنا ہے، تو اللہ تعالیٰ کا فرمان الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا الہ اور معبود ہے جو دنیا اور آخرت کے تمام حالات پر غالب ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ الخ بندگی کی ذلت پر دلالت کرتا ہے، یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بندے کے ظاہری اعمال باطنی مکاشفات میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی مدد، اعانت اور ہدایت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اُمّ القرآن: اس سورت کا ایک نام ام القرآن ہے، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ عربی میں اُم کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں، یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں، چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو اُم الرأس کہتے ہیں، کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے، مکہ کو اُم القریٰ کہتے ہیں کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی، پس اس سورت کو اُم القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے، یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے، (ام الکتاب ص ۳)

علامہ فخر الدین الرازی رحمہ اللہ اُم القرآن کے ذیل میں لکھتے ہیں، کہ سورۃ الفاتحہ کو ام القرآن کہنے کی کئی وجوہات ہیں، اُمُّ الشَّئی کسی چیز کا اصل ہوتی ہے، اور تمام قرآن کریم سے مقصود چار چیزوں کو ثابت کرنا ہے، الٰہیات، معاد، نبوات، قضاء اور قدر۔ اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں الٰہیات پر دلالت ہے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں معاد پر دلالت ہے، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں جبر وقدر پر دلالت ہے اور اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضاء اور اس کی تقدیر سے ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں بھی اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر دلالت ہے اور نبوات پر دلالت ہے، جب قرآن کریم کا بڑا مقصد یہ چار مطالب ہیں اور سورت الفاتحہ انہی مطالب پر مشتمل ہے، اس لیے اس کا نام اُم القرآن رکھا گیا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۴)

ام القرآن نام رکھنے کا دوسرا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام آسمانی کتب کا حاصل تین امور کی طرف رجوع کرنا ہے، ایک یہ ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی صفت وثناء زبان سے کی جائے یا خدمت اور اطاعت میں مشغول ہوا جائے، یا مکاشفات اور مشاہدات طلب کیے جائیں، تو اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی صفت وثناء ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں خدمت اور بندگی میں مشغول ہونا ہے ہاں اس میں ابتدا میں إِيَّاكَ نَعْبُدُ کے اندر بندگی میں کوشش اور سعی کرنے کی طرف اشارہ ہے، پھر وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فرمایا، جس میں بندے کی عاجزی، ذلت اور مسکنت کے اعتراف اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ طلب مکاشفات ومشاہدات اور ہدایت کی اقسام کی طرف اشارہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱)

پھر اس سورت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام القرآن قرار دیا ہے، جیسا کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أُمُّ الْقُرْآنِ عِوَضٌ عَنْ غَيْرِهَا، وَلَيْسَ غَيْرُهَا عِوَضًا عَنْهَا (دار قطنی، ج ۲ حاکم)
ام القرآن اپنے غیر کا متبادل ہے لیکن اس کا غیر اس کا متبادل نہیں ہو سکتا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْتَرِءْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ (مسلم، باب وجوب القرأۃ فی کل رکعۃ)
جس نے ام القرآن (سورۃ الفاتحہ) نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔

السبع المثانی: قرآنِ حکیم کی آیت مبارکہ { وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ } [الحجر: ۸۷] سے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الفاتحہ مراد لی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے بھی سبع مثانی سے سورۃ الفاتحہ مراد لی ہے۔

مثانی کہنے کی وجوہات: اس کے دو حصے ہیں، ایک حصے میں بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ثناء و تعریف ہے اور دوسرے حصے میں بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کا ذکر ہے۔

مثانی کا معنی دہرائی جانے والی، تو یہ نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ مثانی کا معنی ہے مستثنیٰ کی گئی، تو یہ تمام کتابوں سے مستثنیٰ ہے، اس لیے اسے مثانی کہا گیا ہے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا أُنْزِلَ فِيْ التَّوْرَاةِ، وَلَا فِي الْإِنْجِيْلِ وَلَا فِي الزَّبُوْرِ وَلَا فِي الْفُرْقَانِ مِثْلُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ وَإِنَّهَا السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ. (تفسیر کبیر) اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، کہ اس سورت کی مثل تورات میں، انجیل میں، حتی کہ قرآن کریم میں بھی کوئی سورت نہیں اتاری گئی اور یہ سات آیات ہیں جو دہرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم۔

اسے مثانی اس لیے کہا گیا چونکہ یہ سات آیات ہیں، ہر آیت کی تلاوت قرآن کریم کے ساتویں حصے کے برابر ہے، جو شخص سورۃ الفاتحہ پڑھے گا اللہ تعالیٰ اسے پورے قرآن کا ثواب عطاء فرمائیں گے۔

اس سورت کی سات آیات ہیں، اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں، جو شخص اس کی تلاوت کے لیے اپنی زبان کھولے گا تو اس سے دوزخ کے سات دروازے بند کر دیے جائیں گے، اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت جبریل نے آپ ﷺ کو فرمایا:

يَا مُحَمَّدُ، كُنْتُ أَخْشَى الْعَذَابَ عَلَى أُمَّتِكَ،فَلَمَّا نَزَلَتِ الْفَاتِحَةُ أَمِنْتُ، قَالَ: لِمَ يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: لِأَنَّ اللهَ تَعَالَى قَالَ: وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِيْنَ، لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ، لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ (الحجر: ۴۳، ۴۴) وَآيَاتُهَا سَبْعٌ فَمَنْ قَرَأَهَا صَارَتْ كُلُّ آيَةٍ طَبَقًا عَلَى بَابٍ مِّنْ أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، فَتَمُرُّ أُمَّتُكَ عَلَيْهَا مِنْهَا سَالِمِيْنَ (تفسیر کبیر)

اے محمد ﷺ! میں آپ ﷺ کی امت پر عذاب سے خوف زدہ رہتا تھا، لیکن جب سورت الفاتحہ نازل ہوئی تو میں مطمئن ہو گیا، آپ ﷺ نے پوچھا: اے جبریل! کیوں؟ جبریل نے فرمایا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ جہنم ان سب کے وعدے کی جگہ ہے، جس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کا ایک حصہ مقرر ہے اور اس کی سات آیات ہیں، جو شخص انہیں پڑھے گا تو ہر آیت جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازے کا ڈھکن بن جائے گی یوں آپ ﷺ کی امت سلامتی کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر جائے گی۔

اسے مثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ نماز میں دہرائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ دوسری سورت ملائی جاتی ہے، اسے مثانی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور اس کی مدحت ہوتی ہے۔

اسے مثانی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے دوبار اتارا ہے، ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔ اسے مثانی اس لیے کہا گیا کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جیسے حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ میں نے صلوۃ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

اسے مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے، ثناء اور دعا کا، چنانچہ اس کے آدھے حصے میں حق ربوبیت کا ذکر ہے جو کہ ثناء ہے اور آدھے حصے میں حق عبودیت کا ذکر ہے جو کہ

دعاء ہے۔ اسے مثانی اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس میں کلمات دہرے ہیں، جیسے اَلرَّحْمٰنِ اور اَلرَّحِيْمِ، اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرأت میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور غَيْرِ الضَّآلِّيْنَ ہے، اسے مَثَانِی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں دو چیزوں کا ذکر ہے ایک اللہ تعالیٰ کی حمد اور دوسرا اس کی توحید کا۔

القرآنُ العظیم: اس سورت کا ایک نام القرآن العظیم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت فاتحہ کی تفسیر فرمائی تو اس میں یہ نام ذکر فرمایا، اَلْفَاتِحَةُ: هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهُ، سورت فاتحہ وہ سات آیات ہیں جنہیں دہرایا جاتا ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

الصلوٰۃ: اس سورت کا ایک نام الصلوٰۃ ہے، سورۃ فاتحہ کو صلوٰۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ کوئی نماز خواہ فرض ہو یا سنت، نفل ہو یا واجب، اس سے خالی نہیں ہوتی اور نہ ہی نماز اس کے بغیر درست ہوتی ہے، اس کا نام صلوٰۃ اسی طرح رکھا گیا ہے جس طرح نماز کو قرآن کہا گیا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ، میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کیا ہے، تو اس حدیث قدسی سے بھی اس کا نام ماخوذ ہے، پھر نماز میں چونکہ یہ سورۃ شرط ہے اس لئے اسے صلوٰۃ کہا جاتا ہے، دونوں میں گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے۔

رُقْيَةُ الْحَقِّ: اس کا ایک نام جھاڑ پھونک والی سورۃ ہے اور یہ نام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی اصحاب عرب کے ایک قبیلہ پر پہنچے۔ جنہوں نے ان کی ضیافت نہ کی، اتفاق سے ان کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا۔ وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس آئے اور کہنے لگے: تم میں سے کسی کے پاس بچھو کے کاٹے کی کوئی دوا یا منتر ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں ہے۔ مگر چونکہ تم نے ہماری ضیافت نہیں کی اس لیے ہم اس کا معاوضہ لیں گے، انہوں نے چند بکریاں دینا قبول

کیں۔ ایک صحابی (خود ابو سعید رضی اللہ عنہ) نے سورۃ فاتحہ پڑھنا شروع کی۔ وہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر پھونک مار دیا کرتے۔ چند دنوں میں وہ سردار اچھا ہو گیا۔ (حسب وعدہ) قبیلہ کے لوگ بکریاں لے آئے تو صحابہ کو تردد ہوا (کہ آیا یہ معاوضہ لینا بھی چاہئے یا نہیں) اور کہنے لگے کہ جب تک ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیں یہ بکریاں نہ لینا چاہئیں۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ منتر بھی ہے؟ وہ بکریاں لے لو اور (ان میں سے) میرا حصہ بھی نکالو اور ابن عباس کی روایت میں ہے کہ جب صحابہ مدینہ پہنچے تو کسی نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص (ابو سعید خدری) نے کتاب اللہ پر اجرت لی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ (بخاری کتاب الطب)

(تمہارے اجرت لینے کی سب سے زیادہ مستحق تو کتاب اللہ ہی ہے)

سورۃ الحمد: اس سورت کا ایک نام سورۃ الحمد ہے، اس کا نام سورۃ الحمد رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے شروع میں الحمد کا لفظ ہے، اسی مناسبت سے اسے سورۃ الحمد کہا جاتا ہے۔

أساس القرآن: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس سورۃ کا نام اساس القرآن رکھا ہے، اساس کا معنی ہے بنیاد، ابتدا چونکہ یہاں سے قرآن کی ابتدا ہوتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے کولہے میں درد کی شکایت کی، تو انہوں نے اسے جواب دیا کہ

عَلَيْكَ بِأَسَاسِ الْقُرْآنِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ، سَمِعْتُ ابنَ عَبَّاس يَقُوْلُ: لِكُلِّ شَيْءٍ أَسَاسٌ، وَأَسَاسُ الدُّنْيَا مَكَّةُ، لِأَنَّهَا مِنْهَا دُحِيَتْ، وَأَسَاسُ السَّمٰوَاتِ عَرِيبَا وَهِيَ السَّمَاءُ السَّابِعَةُ، وَأَسَاسُ الْأَرْضِ عَجِيبَا، وَهِيَ الْأَرْضُ السَّابِعَةُ السُّفْلَى، وَأَسَاسُ الْجِنَانِ جَنَّةُ عَدْنٍ، وَهِيَ سُرَّةُ الْجِنَانِ عَلَيْهَا أُسِّسَتِ الْجَنَّةُ، وَأَسَاسُ النَّارِ جَهَنَّمُ، وَهِيَ الدَّرَكَةُ السَّابِعَةُ السُّفْلَى عَلَيْهَا أُسِّسَتِ الدَّرَكَاتُ، وَأَسَاسُ الْخَلْقِ آدَمُ، وَأَسَاسُ الْأَنْبِيَاءِ

نُوحٌ، وَأَسَاسُ بَنِي إِسْرَائِيلَ يَعْقُوبُ، وَأَسَاسُ الْكُتُبِ الْقُرْآنُ، وَأَسَاسُ الْقُرْآنِ الْفَاتِحَةُ، وَأَسَاسُ الْفَاتِحَةِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، فَإِذَا اعْتَلَلْتَ أَوِ اشْتَكَيْتَ فَعَلَيْكَ بِالْفَاتِحَةِ تُشْفَى {قرطبی ج ا ص ۱۱۳}

تُو اساس القرآن سورۃ الفاتحہ کو لازم پکڑ، میں نے حضرت ابن عباس سے سنا ہے ،وہ فرماتے ہیں، ہر چیز کی ایک اساس ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اسی سے زمین کو پھیلایا گیا ہے اور آسمانوں کی اساس عَرِیا ہے اور یہ ساتواں آسمان ہے اور زمین کی اساس عجیبا ہے اور یہ ساتویں نچلی زمین ہے اور جنتوں کی اساس جنت عدن ہے اور یہ جنتوں کی ناف ہے، اس پر جنت کی اساس رکھی گئی ہے اور دوزخ کی اساس جہنم ہے اور یہ ساتویں نچلی زمین کا ایک حصہ ہے، اس پر باقی حصے رکھے گئے ہیں اور مخلوق کی اساس حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور انبیاء کی اساس حضرت نوح علیہ السلام ہیں، اور بنی اسرائیل کی اساس حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور کتابوں کی اساس قرآن ہے اور قرآن کی اساس سورۃ الفاتحہ ہے اور سورۃ الفاتحہ کی اساس بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے، پس جب تو علیل ہو یا بیمار ہو تو سورۃ الفاتحہ کو لازم پکڑ۔

اَلْکَافِیَۃُ: یحیٰ بن کثیر رحمہ اللہ نے اس سورۃ کا نام کافیہ رکھا ہے، کیونکہ یہ باقیوں کے علاوہ کفایت کرنے والی ہے، مگر باقی اس کے علاوہ کفایت کرنے والی نہیں ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں لِأَنَّهَا تَكْفِي فِي الصَّلَاةِ عَنْ غَيْرِهَا وَلَا يَكْفِي عَنْهَا غَيْرُهَا (ج ا ص ۱۹۰) نماز میں یہ دوسری سورتوں کے علاوہ کفایت کرتی ہے جب کہ دوسری سورتیں اس کے علاوہ کافی نہیں ہیں۔ یعنی نماز میں اگر صرف یہی سورت پڑھی جائے تو کافی ہو جائے گی مگر دوسری کوئی سورت اس کے بغیر پڑھی جائے تو اس کا پڑھنا کافی نہیں ہو گا، فاتحہ کا نماز میں پڑھنا لازم ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، حدیث شریف میں اس بارے میں بڑی تاکید آئی ہے۔

اَلْکَنْزُ: علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں اس سورۃ کا نام سورۃ الکنز رکھا ہے، کنز کا معنی ہے جمع کیا ہوا مال خواہ وہ زمین کے اندر رکھا جائے یا زمین کے اوپر رکھا جائے، اس سورت کو کنز کہنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں علوم کے خزانے پوشیدہ ہیں، مگر ساتھ ہی حضرت انس کی ایک مرفوع روایت بھی ہے، جس میں اس سورت کو عرش کے خزانوں میں سے آنے والی سورت کہا گیا ہے، ارشاد ہے

إِنَّ اللّٰهَ أَعْطَانِي فِيمَا مَنَّ بِهِ عَلَيَّ إِنِّي أَعْطَيْتُكَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَهِيَ مِنْ كُنُوزِ عَرْشِي

بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطیہ کر کے مجھ پر احسان فرمایا ہے، فرمایا: میں نے تجھے فاتحۃ الکتاب دی ہے اور یہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ہے۔ (الاتقان علامہ سیوطی)

اسی طرح معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے أُعْطِيتُ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ (الاتقان) مجھے سورت فاتحہ اور سورت بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے دی گئیں۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ

أَرْبَعُ آيَاتٍ نَزَلَتْ مِنْ كَنْزِ الْعَرْشِ لَمْ يَنْزِلْ مِنْهُ شَيْءٌ غَيْرُهُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَآيَةُ الْكُرْسِيِّ وَخَاتِمَةُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ وَالْكَوْثَرِ (الاتقان فی علوم القرآن ج ا ص ۱۳۹) چار آیات عرش کے خزانوں سے اتری ہیں، ان کے علاوہ کوئی چیز نہیں اتری، وہ ام الکتاب، آیۃ الکرسی، سورت البقرہ کی آخری آیات اور سورت الکوثر ہے۔

شفاء: اس سورۃ کا ایک نام سورۃ شفاء بھی ہے، اس لئے کہ نبی اکرم نے فرمایا؛

فِي فَاتِحَةِ الكِتَابِ شِفَاءٌ مِّن كُلِّ دَاءٍ، فَاتِحَةُ الكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ سَمٍّ (ترمذی)

سورۃ فاتحہ میں ہر بیماری کی شفاء ہے، سورۃ فاتحہ میں ہر زہر کی دوا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ سُمٍّ، وَمَرَّ بَعْضُ الصَّحَابَةِ بِرَجُلٍ مَّصْرُوعٍ فَقَرَأَ هٰذِهِ

السُّوْرَةَ فِي أُذُنِهِ فَبَرِءَ فَذَكَرُوْهُ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: هِيَ أُمُّ الْقُرْآنِ، وَهِيَ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ دَاءٍ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۹)

سورۃ الفاتحہ ہر زہر سے شفاء ہے۔ کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک مرگی والے آدمی کے پاس سے گزرے تو اس کے کان میں سورۃ الفاتحہ پڑھ کر پھونکی، چنانچہ وہ ٹھیک ہو گیا، اس بات کا ذکر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورۃ الفاتحہ ام القرآن ہے اور یہ ہر بیماری کی شفاء ہے۔

بیماریوں میں کچھ روحانی ہوتی ہیں اور کچھ جسمانی، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفر کو بھی بیماری قرار دیا ہے، سورۃ الفاتحہ اصول، فروع اور مکاشفات کی معرفت پر مشتمل ہے، تو گویا یہ ان تین مقامات میں شفاء کے حصول کا سبب ہے۔

سورۃ السوال: اس سورۃ کا ایک نام سورۃ السوال بھی ہے، امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رب العزت سے یہ بات روایت کی ہے کہ مَنْ شَغَلَهُ ذِكْرِي عَنْ سُؤَالِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِيْنَ، وہ شخص جسے میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھے تو میں اسے سوال کرنے والوں سے زیادہ دوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا تھا، انہوں نے فرمایا تھا کہ اَلَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِيْنِ [الشُّعَرَاءِ: ۷۸] یہاں سے لے کر رَبِّ هَبْ لِي حُكْماً وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِيْنَ (الشُّعَرَاءِ: ۸۳) تک اس سورت میں بھی ابتدا اسی کی ثناء سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ إِلَى قَوْلِهِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ثُمَّ ذَكَرَ الْعُبُوْدِيَّةَ وَهُوَ قَوْلُهُ: إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پھر اس کا خاتمہ ہدایت کے طلب کرنے پر ہوا ہے، جیسا کہ فرمان ہے

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: جو اس بات پر دلالت ہے کہ دین میں اہم ترین مقصود وہ ہدایت فی الدین ہے اور یہ اس بات پر بھی دلالت ہے کہ معرفت کی جنت یہ جنت النعیم سے بہتر ہے، کیونکہ اللہ

تعالیٰ نے اپنے کلام کے خاتمہ پر اھدنا کا لفظ استعمال فرمایا ہے ارزُقنَا الجَنَّۃَ نہیں فرمایا۔

سورۃ الشکر: اس سورت کا ایک نام سورۃ الشکر بھی ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل، کرم اور احسان پر اس کی ثناء کی گئی ہے۔

سورۃ الدعا: اس سورت کا ایک نام سورۃ الدعا بھی ہے، کیونکہ اس میں صراط المستقیم پر چلنے کی دعا کی گئی ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں سورت الفاتحہ کے گیارہ نام ذکر کیے ہیں۔

سورۃ النور: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں سورت الفاتحہ کے چوبیس نام ذکر کیے ہیں ان میں ایک نام سورت النور بھی ذکر کیا ہے، مگر الاتقان اس بارے میں خاموش ہے کہ اس عظیم الشان سورت کا نام النور رکھنے کی وجہ کیا ہے۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں جن دو نوروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک سورۃ الفاتحہ بھی ہے، ہو سکتا ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اس روایت سے استفادے کے بعد اس سورۃ کا نام سورۃ نور لکھا ہو۔

الوافیہ: جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس سورت کا ایک نام سورت الوافیہ ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس سورت کا یہ نام حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے رکھا ہے، وافیہ وفا سے ہے جس کا معنی ہے پورا کرنا، علامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس کو وافیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت نماز میں مکمل پڑھی جاتی ہے، آدھی نہیں پڑھی جاتی جس طرح دوسری سورتیں پڑھی جاتی ہیں، دوسری سورتیں نصف نصف کر کے مختلف رکعتوں میں پڑھی جاسکتی ہیں مگر سورت الفاتحہ ہر رکعت میں مکمل پڑھنا پڑتی ہے۔

سورۃ الحمد اولیٰ: سورۃ الفاتحہ کا ایک نام سورۃ الحمد اولیٰ ہے، یہ نام علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاتقان میں نقل فرمایا ہے۔

سورۃ الحمد قصریٰ: سورۃ الفاتحہ کا ایک نام سورۃ الحمد قصریٰ ہے، یہ نام بھی علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں نقل فرمایا ہے۔

شافیہ: سورۃ الفاتحہ کا ایک نام شافیہ بھی ہے، جسے علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب

الاتقان فی علوم القرآن میں نقل فرمایا ہے۔

سورۃ تعلیم المسئلہ :اس سورت کا ایک نام تعلیم المسئلہ بھی ہے، مرسی کہتے ہیں کہ چونکہ اس سورت میں مانگنے کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ سوال سے پہلے صفت وثناء بیان کی جائے۔

سورۃ المناجات: مناجات کا معنی ہے سرگوشیاں کرنا، اس میں بھی انسان اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

سورۃ التفویض :اس سورت کا ایک نام سورت التفویض بھی ہے، جس کا معنی ہے کسی کے سپرد کرنا، اس میں بھی انسان جب ایاک نعبد کہتا ہے تو اپنے کو اپنے رب کے سپرد کر رہا ہوتا ہے۔

تفاسیر اور علوم القرآن کی کتابوں میں سورت فاتحہ کے یہ اسماء ذکر کیے گئے ہیں، جس سے سورت الفاتحہ کی عظمت واضح ہوتی ہے، فَإِنَّ كَثْرَةَ الْأَسْمَاءِ دَالَّةٌ عَلَى شَرَفِ الْمُسَمَّى

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عظیم الشان تفسیر کبیر میں سورت الفاتحہ کے گیارہ نام لکھے ہیں، جب کہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب لاجواب الاتقان میں پچیس نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ الاتقان سے پہلے یہ اسماء کسی کتاب میں یکجا نہیں تھے، یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے ہے کہ اگر علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی عربی میں لکھی جانے والی کتاب میں فاتحہ کے نام ان کی تحریر سے پہلے یکجا نہیں تھے تو ہماری اس اردو کی کتاب سے پہلے کسی اردو کتاب میں سورت الفاتحہ کے تمام اسماء یکجا نہیں تھے، اگر کسی دوسری اردو کتاب میں سورۃ فاتحہ کے اسماء یکجا تھے تو ہمارے علم میں ایسی کتاب نہیں تھی، اس پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں اظہار شکر کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فقیر منش بندے کو اپنے برگزیدہ بندوں اور اہل علم کے ساتھ ادنیٰ سی نسبت عطا فرمائی ہے، جو اس فقیر کا توشہ اور زاد سفر ہے، ورنہ خاطی اور آثم بندے کے دامن میں آثام وذنوب کے بوجھ کے سوا کیا ہے۔ فللہ الحمد علی ھذا

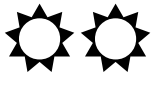

فضائل سورۃ الفاتحہ

سورۃ الفاتحہ نور ہے: سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

بَيْنَمَا جِبْرِيْلُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ نَقِيْضًا مِّنْ فَوْقِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ: هٰذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمُ لَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ، فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ، فَقَالَ: هٰذَا مَلَكٌ نَزَلَ إِلَى الْأَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ، فَسَلَّمَ وَقَالَ: أَبْشِرْ بِنُورَيْنِ أُوْتِيتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ: فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، وَخَوَاتِيمُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ، لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِّنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيتَهُ {مسلم}

ایک دن جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے اوپر ایک زور دار آواز سنی انہوں نے اپنا سر اٹھایا۔ پھر فرمایا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا پھر فرمایا: یہ ایک فرشتہ ہے جو آج سے پہلے زمین پر کبھی نازل نہیں ہوا۔ پھر اس فرشتے نے آپ کو سلام کیا اور دونوروں کی خوشخبری دی اور کہا : یہ دونور آپ ہی کو دیے جارہے ہیں۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ ایک سورۃ فاتحہ اور دوسرا سورۃ البقرہ کی آخری آیات۔ آپ جب کبھی ان دونوں میں سے کوئی کلمہ تلاوت کریں گے تو آپ کو طلب کردہ چیز ضرور عطا کی جائے گی۔

سب سے بڑی سورت: حضرت سعید بن معلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

كُنْتُ أُصَلِّي فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أُجِبْهُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي كُنْتُ أُصَلِّي، فَقَالَ: (أَلَمْ يَقُلِ اللهُ اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ ثُمَّ قَالَ) إِنِّي لَأُعَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي، فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ: أَلَمْ تَقُلْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ أَعْظَمُ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قَالَ: (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ

الَّذِیْ أُوتِیْتُهُ {بخاري}

ایک دن میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا، اس وقت میں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر (نماز سے فارغ ہو کر) جب میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (اس وقت) میں نماز پڑھ رہا تھا (اس لیے میں نے آپ کا جواب نہیں دیا تھا) آپ نے فرمایا کہ (کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: کہ اللہ اور رسول کا جواب دو جب کہ رسول اللہ تمہیں بلائیں اور ان کے حکم کی اطاعت کرو؟ پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: قبل اس سے کہ تو اس مسجد سے نکلے، کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بہت بڑی یعنی افضل سورت نہ سکھلاؤں؟ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور جب آپ ﷺ مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بہت بڑی سورت نہ سکھلاؤں؟ آپ نے فرمایا وہ سورت الحمد للہ رب العالمین ہے وہ سات آیتیں ہیں جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے۔

ارشاد گرامی اِسْتَجِیْبُوْا (جواب دو) سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو نماز کی حالت میں جواب دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی تھی جیسا کہ نماز میں آپ ﷺ کو خطاب کرنے سے نماز فاسد نہ ہوئی۔

سورت فاتحہ کو ایک بہت بڑی سورت اس لئے فرمایا کہ وہ اللہ رب العزت کے نزدیک بڑی قدر رکھتی ہے اور الفاظ کے اختصار کے باوجود اس کے فوائد و معانی بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سورت فاتحہ کے صرف ایک جزء کے تحت دین و دنیا کے تمام مقاصد آجاتے ہیں بلکہ بعض عارفین نے تو یہ کہا ہے کہ جو کچھ سابق آسمانی کتابوں میں ہے وہ سب قرآن مجید میں ہے اور جو کچھ قرآن مجید میں ہے وہ سب سورت فاتحہ میں ہے اور جو کچھ سورت فاتحہ میں ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ سب کچھ اس کی: ب: میں ہے۔

وہ سات آیتیں ہیں۔ جن سے دراصل قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ آیت

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (الحجر : ۸۷)

یعنی اے محمد! {ﷺ} ہم نے آپ کو وہ سات آیتیں عطا کی ہیں جو نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں، یا ان سات آیات کی ثناء عطاء کی گئی ہے، فصاحت اور اعجاز کے ساتھ اور ان سات آیات سے سورۃ الفاتحہ مراد ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ کو قرآن عظیم دیا ہے، یہاں قرآن عظیم سے بھی یہی سورت فاتحہ مراد ہے، کیونکہ سورۃ الفاتحہ معانی اور فوائد کے لحاظ سے قرآن کریم کا بڑا جزو ہے، اس لیے مبالغۃً فرمایا کہ یہ قرآن عظیم ہے۔

ایسی سورت صرف قرآن کا اعزاز ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ؟ فَقَرَأَ أُمَّ الْقُرْآنِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا أُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْفُرْقَانِ مِثْلُهَا وَإِنَّهَا سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ الَّذِي أُعْطِيتُهُ (ترمذی، دارمی)

ایک دن رسول کریم ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ نماز میں تم کس طرح پڑھتے ہو یعنی کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے سورت فاتحہ پڑھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ایسی سورت نہ تو توریت انجیل زبور میں اتاری گئی ہے اور نہ ہی قرآن میں نازل کی گئی ہے سورت فاتحہ سبع مثانی ہے (یعنی سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور یہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

فاتحہ عرش الٰہی پر معلّق: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، وَآيَةُ الْكُرْسِيِّ، وَشَهِدَ اللهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَقُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ، هٰذِهِ الْآيَاتُ مُعَلَّقَاتٌ بِالْعَرْشِ لَيْسَ بَيْنَهُنَّ وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ {قرطبی ج ۱ ص ۱۰۰}

سورۃ الفاتحہ، آیۃ الکرسی، اور وَشَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وقُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ، یہ آیات اللہ تعالیٰ کے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں، ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

ہر بیماری کی شفاء: حضرت عبد الملک بن عمیر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ دَاءٍ سورت فاتحہ ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔ (دارمی، بیہقی)

علامہ ابن ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ایک حدیث نقل فرمائی ہے، حضرت جابر سے روایت ہے اِنْتَهَيْتُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ أَهْرَاقَ الْمَاءَ، فَقُلْتُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ، قَالَ: فَقُلْتُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ، قَالَ: فَقُلْتُ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ. قَالَ: فَانْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِيْ، وَأَنَا خَلْفَهُ حَتّٰى دَخَلَ رَحْلَهُ، وَدَخَلْتُ أَنَا الْمَسْجِدَ، فَجَلَسْتُ كَئِيْبًا حَزِيْنًا، فَخَرَجَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ تَطَهَّرَ، فَقَالَ: عَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ ثُمَّ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَابِرٍ بِأَخْيَرِ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قُلْتُ: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. قَالَ: اِقْرَأْ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، حَتّٰى تَخْتِمَهَا

میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضوء کر رہے تھے، میں نے کہا: السلام علیک یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا، میں نے پھر دوسری بار السلام علیک یارسول اللہ! کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جواب نہیں دیا، میں نے تیسری بار کہا: السلام علیک یارسول اللہ! پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے اور میں مسجد میں، میں بہت دل گرفتہ، پریشان ہو کر بیٹھ گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضوء کر چکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا:

عَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ،

پھر فرمانے لگے کہ اے جابر! کیا میں تجھے قرآن کی سب سے بہترین سورت نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہاں: آپ ﷺ نے فرمایا: کہ سورۃ الفاتحہ آخیر تک پڑھو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

إِذَا وَضَعْتَ جَنْبَكَ عَلَى الْفِرَاشِ، وَقَرَأْتَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَ { قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ } فَقَدْ أَمِنْتَ مِنْ كُلِّ شَيءٍ إِلَّا الْمَوْت{تفسير القرطبي (۱:۱۵۴) } جب تو اپنے پہلو کو بستر پر رکھے (یعنی سونے کا ارادہ کرے) سورۃ فاتحہ اور سورۃ الاخلاص پڑھے تو تُو موت کے علاوہ ہر چیز سے محفوظ ہو گیا۔

زہر سے شفاء: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنَ السُّمِّ فاتحۃ الکتاب ہر زہر سے شفاء ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۶۰)

جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ زہر کی زہرناکی کیا ہوتی ہے؟ زہر جب جسم میں پھیل جاتا ہے، دل پر اثر انداز ہو جاتا ہے تو کس طرح پورے جسم میں کھلبلی مچاتا ہے، کس طرح جسم انسانی کو متاثر کرتا ہے، جسم انسانی تو جسم انسانی ہے حیوانات کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہتا، رحمت دوعالم ﷺ نے ایسا مفت کا علاج عطا فرمایا جس کو بروئے کار لانے میں اللہ تعالیٰ کرم کے فیصلے فرما دیتے ہیں، ہاں اگر تقدیر الٰہی میں یہی لکھا ہوا تھا کہ اس شخص نے زہر ہی سے جان دینا تھی، زہر سے اس نے خوفناک حد تک متاثر ہونا تھا تو پھر دنیا کا کوئی حیلہ اور کوئی وسیلہ کارگر نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو ٹالا نہیں جا سکتا، از روئے حدیث شریف جو تقدیر کا لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا اور جو تقدیر میں نہیں تھا وہ کسی کو پہنچ نہیں سکتا۔

چالیس سال کے لیے عذاب کا ٹلنا: حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْقَوْمَ لَيَبْعَثُ اللهُ عَلَيْهِمُ الْعَذَابَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا فَيَقْرَأُ صَبِيٌّ مِّنْ صِبْيَانِهِمْ فِي الْمَكْتَبِ الْحَمْدُ للهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فَيَسْمَعُهُ اللهُ تَعَالَى فَيَرْفَعُ عَنْهُمْ بِسَبَبِهِ الْعَذَابَ

أَرْبَعِيْنَ سَنَةً.

بے شک اللہ تعالیٰ ایک قوم پر حتمی طور پر عذاب نازل کرتے ہیں، پھر اس کے بچوں میں سے کوئی کسی مدرسہ میں سورۃ الفاتحہ الحمدللہ رب العالمین پڑھتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ سن لیتا ہے تو اس سے چالیس سال تک عذاب کو دور کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۶۰)

ایک سو چار کتابوں میں شان امتیازی: حضرت حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى مِائَةً وَّأَرْبَعَةَ كُتُبٍ مِنَ السَّمَاءِ فَأَوْدَعَ عُلُوْمَ الْمِائَةِ فِي الْأَرْبَعَةِ، وَهِيَ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيْلُ وَالزَّبُوْرُ وَالْفُرْقَانُ، ثُمَّ أَوْدَعَ عُلُوْمَ هٰذِهِ الْأَرْبَعَةِ فِي الْفُرْقَانِ، ثُمَّ أَوْدَعَ عُلُوْمَ الْفُرْقَانِ فِي الْمُفَصَّلِ، ثُمَّ أَوْدَعَ عُلُوْمَ الْمُفَصَّلِ فِي الْفَاتِحَةِ فَمَنْ عَلِمَ تَفْسِيْرَ الْفَاتِحَةِ كَانَ كَمَنْ عَلِمَ تَفْسِيْرَ جَمِيْعِ كُتُبِ اللهِ الْمُنَزَّلَةِ، وَمَنْ قَرَأَهَا فَكَأَنَّمَا قَرَأَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيْلَ وَالزَّبُوْرَ وَالْفُرْقَانَ، اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں نازل کی ہیں، ان سب کے علوم چار میں رکھ دیے ہیں، وہ چار تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم ہیں، پھر ان چاروں کے علوم قرآن کریم میں رکھ دیے ہیں، پھر قرآن کریم کے علوم مفصلات (بڑی سورتوں) میں رکھ دیے ہیں، پھر مفصل کے علوم سورۃ الفاتحہ میں رکھ دیے ہیں، پس جس نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کا علم جان لیا گویا کہ اس نے تمام آسمانی کتابوں کی تفسیر کا علم حاصل کر لیا، جس نے سورۃ الفاتحہ کو پڑھا گویا اس نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن کو پڑھ لیا۔ (تفسیر کبیر ا/ ۱۶۰)

فاتحہ کی انوکھی فضیلت: امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ میں سات حروف نہیں ہیں، ان میں ث، ج، خ، ز، ش، ظ، ف، ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سات حروف عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ثاء۔ ویل، بربادی اور ہلاکت پر دلالت کرتا ہے، قرآن میں ہے

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَّاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا (الْفُرْقَانِ: ۱۴)

جیم: جہنم کے نام میں پہلا حرف جیم ہے، قرآن میں ہے

وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ (الْحِجْرِ: ۴۳)

بے شک جہنم ان سب کے لیے وعدے کی جگہ ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ (الْأَعْرَافِ: ۱۷۹)

ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

حناء: یہ حرف خزیٌ کی طرف اشارہ کرتا ہے، خزیٌ عربی میں رسوائی اور ذلت پر بولا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ (التَّحْرِيمِ: ۸) جس دن اللہ اپنے نبی کو اور ان کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد ہے

إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ (النَّحْلِ: ۲۷) بے شک آج کے دن رسوائی اور عذاب کافروں پر ہو گا۔

زا: کا حرف سورۃ الفاتحہ میں نہیں ہے، اسی طرح حرف شین بھی سورۃ الفاتحہ میں نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں حروف زفیر اور شھیق میں پائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ (هُودٍ: ۱۰۶) تو جو بد بخت ہوں گے وہ دوزخ میں (ڈال دیئے جائیں گے) اس میں انکو چلانا اور دھاڑنا ہو گا۔ اسی طرح زا، زقوم پر دلالت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ (الدُّخَانِ: ۴۳)

بے شک زقوم کا درخت گناہگاروں کا کھانا ہو گا۔

اور حرف شین شقاوت پر دلالت کرتا ہے اور شقاوت عربی زبان میں بد بختی کو کہا جاتا ہے، اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے فَأَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ (هُوْدٍ: ۱۰۶) پس جو بد بخت ہوں گے وہ اس دن دوزخ میں ہوں گے۔

ظا: حرف ظاء کو اس لیے اس میں نہیں آنے دیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ظاء کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے

اِنْطَلِقُوْا إِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلَاثِ شُعَبٍ لَا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (الْمُرْسَلَاتِ ۳۰)

اس سائے کی طرف چلو جس کی تین شاخیں، نہ ٹھنڈی چھاؤں اور نہ لپٹ سے بچاؤ، اسی طرح ظاء کا حرف اس کلمہ میں موجود ہے جو لظی پر دلالت کرتا ہے، ارشاد ہے

كَلَّا إِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (الْمَعَارِجِ: ۱۵، ۱۶)

ایسا ہرگز نہ ہوگا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے کھال ادھیڑ ڈالنے والی

فاء: یہ حرف اس لیے یہاں نہیں آنے دیا گیا کیونکہ یہ فراق پر دلالت کرتا ہے، فراق کا عربی زبان میں معنیٰ جدائی اور علحدگی ہے، ارشاد ہے يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ (الرُّوْمِ: ۱۴) یہی فاء افترا کے لفظ میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَّقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى (طٰهٰ: ۶۱)

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی یہ اعتراض کرے کہ حروف میں سے کوئی حرف تو ہوگا جو عذاب کی کسی قسم میں موجود ہوگا، تو تمہارے بیان کا کیا فائدہ ہے؟ کہتے ہیں کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کی صفت یہ بیان کی ہے کہ اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لیے ایک حصہ تقسیم کیا ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت سے سات حروف کو ساقط کر دیا ہے اور یہ ابتدائی الفاظ ہیں جو عذاب پر دلالت کرتے ہیں، اس بات پر خبردار کرنے کے لیے کہ جو شخص اس سورت کو پڑھے گا اور اس پر ایمان لائے گا، اور اس کے حقائق کو جانے گا تو وہ جہنم کے سات درکات سے محفوظ ہو جائے گا۔

سورۃ الفاتحہ اللہ اور بندے کے درمیان تقسیم: رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ فَنِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ میں نے نماز (یعنی سورہ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کیا ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائیگا (مسلم)

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی ہے اور جب وہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعاء و درخواست کا ہے اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی پھر جب بندہ کہتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (تفسیر مظہری ۱) (آخر تک) تو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سب میرے بندے کے لئے ہے اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی۔

سورۃ الفاتحہ کی خصوصیات

حضرت مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہے، سورۂ اقرأ، مزمّل اور مدّثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضرات صحابہ سے سورۂ فاتحہ کا اوّل مانزل یعنی نزول

میں سب سے پہلی سورت ہونا منقول ہے اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نہیں نازل ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی فاتحۃ الکتاب رکھا گیا۔

دوسری خصوصیت: یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارقرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں اوران دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کردیئے گئے ہیں (معارف القرآن ج ا ص ۷۲)

سورۃ الفاتحہ کا نزول: نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد چند آیات سورۃ العلق کی نازل ہوئی ہیں، اس کے بعد بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سمیت سورۃ الفاتحہ پوری نازل ہوئی، اس کا ثبوت اس مشہور واقعہ سے ہوتا ہے، جو آپ ﷺ کو ابتدائی دور میں پیش آیا۔ وہ یوں ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

إِنِّيْ إِذَا خَلَوْتُ وَحْدِيْ سَمِعْتُ نِدَاءً وَّقَدْ وَاللّٰهِ خَشِيْتُ أَنْ يَّكُوْنَ هٰذَا أَمْرًا قَالَتْ: مَعَاذَ اللّٰهِ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَفْعَلَ بِكَ، فَوَاللّٰهِ إِنَّكَ لَتُؤَدِّي الْأَمَانَةَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ. کہ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں، قسم بخدا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے ساتھ ایسا نہیں کریں گے، اللہ کی قسم آپ ﷺ امانتیں ادا کرتے ہیں، اور صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچی بات کہتے ہیں۔ قرطبی ج ا ص ۱۱۵)

اتنے میں اسی وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، اس وقت آپ ﷺ وہاں موجود نہیں تھے، حضرت خدیجہ نے آپ کو آپ ﷺ کی بات بتائی اور انہیں کہنے لگیں کہ اے عتیق! آپ حضرت محمد ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے چلیں، جب نبی ﷺ تشریف لائے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: کہ ہمارے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس چلیں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا، تو انہوں نے عرض کی کہ مجھے خدیجہ نے

بتایا ہے، پھر دونوں ورقہ کے پاس پہنچے اور انہیں قصّہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا خَلَوْتُ وَحْدِی سَمِعْتُ نِدَاءً خَلْفِیْ یَا مُحَمَّدُ یَا مُحَمَّدُ فَأَنْطَلِقُ هَارِبًا فِی الْأَرْضِ فَقَالَ: لَا تَفْعَلْ، إِذَا أَتَاكَ فَاثْبُتْ حَتّٰی تَسْمَعَ مَا یَقُوْلُ ثُمَّ ائْتِنِی فَأَخْبِرْنِی. فَلَمَّا خَلَا نَادَاهُ: یَا مُحَمَّدُ، قُلْ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ حَتّٰی بَلَغَ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ فَأَتٰی وَرَقَةَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: أَبْشِرْ ثُمَّ أَبْشِرْ، فَأَنَا أَشْهَدُ أَنَّكَ الَّذِیْ بَشَّرَ بِهِ عِیْسٰی بْنُ مَرْیَمَ، وَأَنَّكَ عَلٰی مِثْلِ نَامُوْسِ مُوْسٰی، وَأَنَّكَ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ، وَأَنَّكَ سَوْفَ تُؤْمَرُ بِالْجِهَادِ بَعْدَ یَوْمِكَ هٰذَا، وَإِنْ یُدْرِكْنِی ذٰلِكَ لَأُجَاهِدَنَّ مَعَكَ. فَلَمَّا تُوُفِّیَ وَرَقَةُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: (لَقَدْ رَأَیْتُ الْقَسَّ فِی الْجَنَّةِ عَلَیْهِ ثِیَابُ الْحَرِیْرِ لِأَنَّهُ آمَنَ بِیْ وَصَدَّقَنِیْ) یَعْنِیْ وَرَقَةَ. {تفسیر قرطبی ۱:۱۱۶،۱۱۵}

جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو اپنے پیچھے سے ایک آواز سنتا ہوں، یا محمد، یا محمد، جس کے ڈر سے میں بھاگتا ہوں، ورقہ نے کہا: ایسا نہ کریں، ثابت قدم رہیے، یہاں تک کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے سن لیں، پھر میرے پاس تشریف لائیں اور مجھے بتائیں، اس کے بعد آپ ﷺ ایک جگہ اکیلے تھے کہ آواز آئی، یا محمد پڑھیے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے وَلَا الضَّآلِّیْنَ، تک، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کہو، آپ ﷺ یہ سب کچھ سننے کے بعد ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لائے اور اس بات کا ان کے سامنے ذکر کیا، انہوں نے آپ ﷺ کو کہا: کہ آپ کو خوشخبری ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ بلاشبہ وہی نبی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ بن مریم نے دی تھی، اور آپ ﷺ کی شریعت حضرت موسیٰ کی شریعت کی طرح ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ آپ ﷺ کو اس دن کے بعد عنقریب جہاد کا حکم دیا جائے گا، اگر مجھے یہ موقع ملا تو میں آپ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا، ورقہ بن نوفل کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: البتہ میں نے ایک عیسائی عالم کو جنت میں دیکھا ہے، وہ ریشمی لباس میں تھا، کیونکہ اس نے میری تصدیق کی تھی اور مجھ پر ایمان بھی لایا تھا۔

اس سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ کے مبعوث ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد سورۃ الفاتحہ پوری آپ ﷺ پر نازل ہوئی تھی، اس کا نزول حضرت خدیجہ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کے بعد ہوا۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کی زبانی اپنے مومن بندوں کو حکم فرماتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے وہ شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کریں، اسے تعوذ پڑھنا کہا جاتا ہے۔

{فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (۹۸)} {سورۃ النحل} پھر جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔

قرآن حکیم کے دوسرے مقامات پر بھی شیطان کے وساوس اور شرارتوں سے بچاؤ کے طریقے سکھائے گئے ہیں، ارشاد ہے

{خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ * وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ} (الأعراف: ۱۹۹، ۲۰۰) (اے محمد ﷺ) درگزر کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا وسوسہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگو بیشک وہ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔ اسی طرح ارشاد فرمایا

{ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ * وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ * وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ} (المؤمنون: ۹۶ - ۹۸)

اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے * اور کہو کہ اے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں * اور اے پروردگار! اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آموجود ہوں * اسی طرح ارشاد فرمایا:

{اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ * وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ * وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ} (فصلت: ۳۴ -۳۶)

آپ (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دیں جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے آپ دیکھیں گے) کہ جس شخص میں اور آپ کے درمیان دشمنی تھی گویا وہ آپ کا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں، اور اگر تمہیں شیطان کی جانب سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو خدا کی پناہ مانگ لیا کرو بیشک وہ سنتا (اور) جانتا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر شہیر میں یہ آیات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس معنی میں یہی تین آیات ہیں چوتھی کوئی آیت اس معنی کو واضح نہیں کرتی۔ دشمن انسانوں میں سے بھی ہوتا ہے اور شیطانوں میں سے بھی ہوتا ہے، انسانی دشمن کے ساتھ یہ رعایت بتائی گئی کہ اس کے ساتھ اچھائی اور احسان کرو تاکہ یہ دشمنی زیادہ پنپنے اور پھلنے پھولنے کے بجائے دوستی اور محبت میں تبدیل ہو جائے اور شیطانی دشمن سے لامحالہ پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ وہ کسی احسان کے زیر بار نہیں آتا، اس کی تو خواہش ایک ہی ہے کہ اولاد آدم کو بہکانا ہے اور اسے ہلاکت کی وادی میں دھکیلنا ہے، اس کی اولاد آدم کے ساتھ شدت کی دشمنی ہے، جس طرح وہ آدم کا سخت دشمن ہے۔

اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو خبردار کیا، سورۃ الاعراف کی آیت ۲۷ میں ارشاد فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ {الأعراف} اے بنی آدم! دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا اور ان سے ان کے کپڑے اتروا دیئے تاکہ ان

کے ستر ان کو کھول دکھائے وہ اور اس کے بھائی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے شیطانوں کو انہیں لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے

اسی طرح شیطان کی دشمنی کا یوں ذکر فرمایا:

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ

شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو وہ اپنے (پیروؤں کے) گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخ والوں میں سے ہوں۔ (سورۃ فاطر آیت ٦) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا (الکہف: ۵۰] کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں (اور شیطان کی دوستی) ظالموں کے لئے (خدا کی دوستی کا) برا بدل ہے۔

شیطان نے انسانوں کے باپ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے سامنے قسمیں کھائی تھیں کہ میں تمہارا خیر خواہ اور مخلص ہوں، مگر اس نے ان کے ساتھ جھوٹ بولا، تو ہمارے ساتھ اس کی کیا دوستی اور تعلق ہے، وہ ہمارا کیسے خیر خواہ ہو سکتا ہے، شیطان نے اولاد آدم کو راہ راست سے ہٹانے کی قسم کھا رکھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جوش و خروش کو یوں ذکر کیا، {فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ * إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ} (ص: ۸۲، ۸۳) کہنے لگا کہ مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا، سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔

قرآن حکیم سے دور کرنے اور اس کی تعلیمات سے ہٹانے کی شیطان سر توڑ کوشش کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ جب وہ قرآن کریم پڑھنے کا ارادہ کریں تو اس سے پہلے تعوذ پڑھ لیا کریں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ * إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (النحل: ۹۸، ۹۹) پھر جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو

شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں* اس کا ان لوگوں پر کوئی بس نہیں چلتا جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

قرأ کرام کی ایک جماعت نے یہ کہا کہ ہمیں قرآن حکیم کی تلاوت کے بعد بھی اعوذ باللہ پڑھنا چاہیے، کیونکہ تلاوتِ قرآن کریم ایک عبادت ہے اور عبادت کی وجہ سے بندے کے دل میں عُجب اور تکبر پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد بھی استعاذہ ہونا چاہیے۔

فخر الدین محمد بن عمر رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنے والا سورۃ الفاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد تعوذ پڑھے، لیکن ابن عربی نے اس قول کو پسند نہیں کیا، کیونکہ یہ داؤد بن علی ظاہری کا مسلک ہے، کہ آیت کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ تلاوت کے بعد تعوذ پڑھا جائے۔ اور ایک تیسرا قول نقل کیا گیا جس میں تلاوت کے آغاز اور تلاوت کے بعد استعاذہ کا ذکر ہے۔ لیکن مشہور اور معروف بات وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے کہ استعاذہ وسوسوں کو دور کرنے کے لئے ہوتا ہے، اس لئے اسے تلاوت سے پہلے ہی ہونا چاہیے، ان کے نزدیک اس آیت {فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ} (النحل:۹۸)

قرأتَ سے پہلے اردتَ محذوف ہے، مطلب یہ کہ جب آپ قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو پھر شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں، جیسے سورۃ المائدہ کی وہ آیت جس میں وضو کا حکم ہے اس میں ارشاد ہے {إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ} الآية (المائدۃ:۶)
جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو پھر اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو دھو لیا کرو۔

اس پر احادیث مبارکہ کی راہنمائی بھی موجود ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو اپنی نماز کو اللہ اکبر سے شروع کرتے تھے، پھر سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ پڑھتے تھے اور تین بار لا الہ اللہ فرماتے تھے، پھر آپ

ﷺ یوں فرماتے تھے۔أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ، مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ میں اللہ خوب سننے والے، خوب جاننے والے کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے، اس کے وسوسوں اور اس کی پھونکیں مارنے سے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے لفظ همزه کا معنی کیا ہے گلا گھونٹ کر مارنا، نفخ کا معنی کیا ہے تکبر کرتے ہوئے شیخیاں مارنا، نفث کا معنی بالوں میں پھونکیں مارنا۔

حضرت عمرو بن مرہ، حضرت عاصم العنزی، حضرت نافع بن جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم اجمعین فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو نماز میں داخل ہوتے وقت دیکھا، آپ ﷺ نے تین بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا، تین بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، تین بار سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا فرمایا، پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ (تفسیر قرطبی ج ۱۰ ص ۱۷۵)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، وَهَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ

ایک شخص نے حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تین بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہتے، پھر تین بار لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے، پھر تین بار سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہتے، پھر آپ ﷺ یوں کہتے تھے، أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، وَهَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں لڑے، ان میں سے ایک کی ناک غصے میں پھیل رہی تھی، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنِّيْ لَأَعْلَمُ شَيْئًا لَوْ قَالَهُ ذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ،میں ایک چیز جانتا ہوں، اگر یہ اسے کہہ لے تو جو غصہ اسے آیا ہوا ہے وہ اس سے ہٹ جائے، وہ ہے أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے، ان میں سے ایک کو بہت زیادہ غصہ آگیا، یہاں تک کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ اس غصے کی وجہ سے دوسرے کی ناک پھیلا دے گا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں اگر یہ اسے کہہ دے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا، کہ یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ یوں کہے اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اسے یہ کہنا شروع کیا، مگر اس کا غصہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا، مزید بڑھنے لگا، اس نے یہ الفاظ نہیں کہے۔

سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے، ہم آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک نے دوسرے کو غصے کی حالت میں گالی دی، اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ایسا کلمہ جانتا ہوں اگر یہ اسے کہے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے۔ اگر یہ کہے: أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس آدمی کو کہا: رسول اللہ ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں، آپ سن رہے ہیں؟ اس نے کہا: میں کوئی پاگل تھوڑا ہی ہوں۔ {مسلم، ابی داؤد، نسائی،}

جبریل سب سے پہلے اِستعاذہ کا حکم لائے

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک روایت اپنی تفسیر میں نقل کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: أَوَّلُ مَا نَزَلَ جِبْرِيْلُ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ، اِسْتَعِذْ. قَالَ: أَسْتَعِيْذُ بِاللهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَالَ: قُلْ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ثُمَّ قَالَ: {اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ} (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۱۳) سب سے پہلے جو چیز جبریل لے کر نازل ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے کہا: اے محمد اللہ سے پناہ مانگیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں

جوخوب سننے والااورخوب جاننے والا ہے، شیطان مردود سے۔پھر جبریل نے کہا: کہو،بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، پھر جبریل نے کہا: اِقۡرَأۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ

استعاذہ کا شرعی حکم: جمہور علماء کے نزدیک استعاذہ مستحب ہے{تفسیر بیضاوی ج۳ص ۳۷۹،الفتح الکبیر فی الاستعاذۃ والتکبیر ص۲}،اسے نہ پڑھنے والا گنہ گار نہیں ہوتا۔مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھا کہ تلاوت سے پہلے استعاذہ سنت ہے۔علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مستحب کہاہے(تفسیر ابن کثیر ج۴ص ۴۰۲)

تفسیر بغوی میں استعاذہ کو تلاوت کے لئے سنت قرار دیا گیاہے،وَالِاسۡتِعَاذَۃُ سُنَّۃٌ عِنۡدَ قِرَأۡۃِ الۡقُرۡآنِ(تفسیر بغوی ۵ص ۴۲)تلاوت قرآن کریم کے وقت استعاذہ سنت ہے۔

علامہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں إِذَا تَعَوَّذَ مَرَّۃً وَّاحِدَۃً فِي عُمُرِہٖ فَقَدۡ کَفٰی فِي إِسۡقَاطِ الۡوُجُوۡبِ،جب آدمی زندگی میں ایک بار تعوذ پڑھ لے تواِسقاط وجوب کے لئے یہ کافی ہے،یعنی ان کے نزدیک اس سے واجب ساقط ہو جاتاہے۔

داؤدبن علی نے کہاکہ تعوّذ کاپڑھناواجب ہے،ان کے نزدیک اگر نماز میں قرأت سے پہلے تعوّذ نہیں پڑھاتو نماز باطل ہو جائے گی،(الفتح الکبیر ص۲) وہ قرآن کریم کی سورۃ النحل میں موجود آیت استعاذہ کے لفظ{فَاسۡتَعِذۡ} سے دلیل پکڑتے ہیں،کیونکہ یہ امر کاصیغہ ہے اورامر وُجوب کے لئے آتاہے،اس لئے اِستعاذہ واجب ہے، وسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعاذہ پر ہمیشگی فرمائی ہے اوراس سے شیطان کے شر کو دُور کیا جاتاہے اوریہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کے بغیر واجب تام نہ ہوتاہووہ واجب ہوتی ہے، بعض کایہ کہناہے کہ استعاذہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے واجب تھانہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں کہاجاتاہے کہ وہ فرض نمازوں میں تعوّذ کے قائل نہیں تھے البتہ ماہ رمضان کی تراویح میں صرف پہلی رات کے قیام میں تعوّذ کے قائل تھے(ابن کثیر)

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ نے حضرت عطاء رحمۃ اللہ کا مسلک تحریر کیا ہے کہ أَنَّهُ تَجِبُ الِاسْتِعَاذَةُ عِنْدَ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ سَوَاءٌ كَانَتِ الْقِرَأَةُ فِي الصَّلَاةِ أَوْ غَيْرِهَا، وَسَائِرُ الْفُقَهَاءِ اتَّفَقُوا عَلَىٰ أَنَّهُ لَيْسَ كَذٰلِكَ، {تفسیر کبیر ۹/۴۶۴} ان کے نزدیک استعاذہ تلاوت قرآن کے وقت نماز میں ہو یا نماز سے باہر واجب ہے، لیکن باقی تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ استعاذہ واجب نہیں ہے الفتح الکبیر فی الاستعاذہ والتکبیر کے مصنف کا خیال ہے کہ علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کا عطاء کی طرف جھکاؤ ہے، لیکن یہ بات قرائن کی روشنی میں درست نہیں ہے اس لئے کہ علامہ رازی نے ساتھ ہی جمہور کا مسلک بھی ذکر کر دیا ہے، اس لئے رازی جیسے ذہین اور فطین مفسر سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلک جمہور سے اعراض کر سکتے ہیں۔

تعوّذ قرأت کے لیے یا نماز کے لیے؟: حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کے نزدیک تعوّذ قرأت کے لیے ہے اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک نماز کے لیے ہے، اس بنیاد پر یہاں دو تفریعات ہیں، ایک یہ کہ کیا مقتدی امام کے پیچھے تعوّذ پڑھے گا یا کہ نہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور امام محمد رحمۃ اللہ کے نزدیک مقتدی امام کے پیچھے تعوّذ نہیں پڑھے گا، کیونکہ وہ تلاوت نہیں کرے گا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک مقتدی امام کے پیچھے تعوّذ پڑھے گا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور امام محمد رحمۃ اللہ کے نزدیک مقتدی امام کے پیچھے تعوذ اس لیے نہیں پڑھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ استعاذہ وہ شخص کرے جو قرأت کرے تو مقتدی پر تو قرأت ہے ہی نہیں، اس لیے وہ تعوّذ نہیں پڑھے گا۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اگر تعوّذ قرأت کے لیے ہے تو پھر وہ قرأت کے تکرار کے ساتھ دہرائی جائے گی اور اگر اس وجہ سے دہرائی نہ جائے تو نماز کی وجہ سے دہرائی جائے گی، یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ تعوّذ نماز کے لیے ہے نہ کہ قرأت کے لیے۔

دوسری تفریع یہ ہے کہ جب نماز عید شروع کرے گا، اس کے بعد سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ کہے گا تو کیا اعوذ باللہ کہنے کے بعد تکبیر کہے گا یا کہ نہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ اور امام

محمد رحمۃ اللہ کے نزدیک وہ تکبیرات کہے گا پھر قرأت کے وقت اَعُوْذُباللّٰہِ کہے گا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک تعوّذ تکبیرات سے پہلے کہے گا۔

اِستِعاذہ کب کرے؟: اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ استعاذے کا وقت سورۃ فاتحہ پڑھنے سے پہلے ہے، امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ استعاذہ کا وقت سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہے، امام داؤد اصفہانی رحمۃ اللہ کا قول بھی یہی ہے اور امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی دو روایتوں میں سے ایک روایت یہی ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ مکمل پڑھنے کے بعد آمین کہے اور اس کے بعد اعوذ باللہ کہے۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ تعوذ سورۃ فاتحہ سے پہلے ہے وہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو تین بار اللہ اکبر کبیراً اور تین بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا اور تین بار سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلاً کہتے پھر أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ کہتے۔

جو حضرات سورۃ فاتحہ کے بعد تعوّذ پڑھنے کو کہتے ہیں وہ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ سے استدلال کرتے ہیں، کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت شرط ہے اور استعاذہ جزا ہے، لہذا جزا شرط کے بعد ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ استعاذہ قرأت قرآن کے بعد ہے، پھر ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ عقل کے مطابق بھی ہے، کیونکہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے وہ بڑے اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے، اگر اس نیکی کی ادائیگی میں اس شخص کے اندر تکبر اور بڑائی داخل ہو گئی تو سارا ثواب ضائع ہو گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہلاک کرنے والی چیزوں کا ذکر فرمایا ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اندر عُجب، خود پسندی اور تکبر کا ذکر فرمایا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شیطان مردود سے استعاذے کا حکم دیا ہے، تاکہ قرآنی تلاوت کے بعد شیطان اس شخص کو ایسے عمل پر نہ ابھارے جس سے اس کی اس نیکی کا ثواب ختم ہو جائے۔

ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو استعاذہ کرلیا کرو، جیسے سورۃ المائدہ کی آیت ۶ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ میں ہے، کیونکہ وہاں اس کا یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ نماز کے ارادے سے پہلے تم اپنے چہرے دھو لیا کرو کیونکہ اس طرح کہا جائے گا تَرْكُ الظَّاهِرِ فِي مَوْضِعِ الدَّلِيلِ لَا يُوجِبُ تَرْكَهُ فِي سَائِرِ الْمَوَاضِعِ لِغَيْرِ دَلِيلٍ

جمہور فقہاء کرام کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں یہ احتمال موجود ہے کہ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کا مفہوم إِذَا أَرَدْتَ ہو، یعنی جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو استعاذہ کرلیا کرو، لہذا جب احتمال ثابت ہو گیا تو پھر یہ بات ضروری ہے کہ لفظ کو اسی پر محمول کیا جائے تاکہ حدیث شریف اور قرآن شریف دونوں میں موافقت ہو جائے اور یہ چیز عقلی مناسبات کو مضبوط کر دے گی کیونکہ استعاذے کا مقصد تو قرأت قرآن کے دوران شیطانی وسوسوں کو دور کرنا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ (الحج: ۵۲)

اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تعوّذ کو تلاوت سے پہلے پڑھنے اور بعد پڑھنے کے اختلافات ذکر کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تعوذ قرأت سے پہلے پڑھی جائے ازروئے حدیث شریف اور قرأت کے بعد پڑھی جائے ازروئے قرآن شریف۔ (تفسیر کبیر ج ۱)

تعوّذ کا آہستہ اور اونچا پڑھنا: حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب الاملاء میں فرمایا کہ تعوذ کو اونچا پڑھا جائے اور آہستہ پڑھنے میں بھی کوئی نقصان نہیں ہے، اور اپنی کتاب "الاُم" میں فرمایا کہ پڑھنے والے کو اختیار ہے چاہے تو آہستہ پڑھے اور چاہے تو اونچی آواز سے پڑھے۔ کیونکہ حضرت

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تعوذ کو آہستہ پڑھا تھا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اونچی آواز سے پڑھا تھا، امام شافعی کے ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعوذ اونچا پڑھنے کو ترجیح دیتے کتاب الام میں ہے

أَبَا هُرَيْرَةَ وَهُوَ يَؤُمُّ النَّاسَ رَافِعًا صَوْتَهُ رَبَّنَا إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ فِي الْمَكْتُوبَةِ وَإِذَا فَرَغَ مِنْ أُمِّ الْقُرْآنِ. وَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَتَعَوَّذُ فِي نَفْسِهِ. وَ أَيُّهُمَا فَعَلَ الرَّجُلُ أَجْزَأَهُ إِنْ جَهَرَ، أَوْ أَخْفَى (کتاب الام ج ا ص ۱۲۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ لوگوں کو امامت کرواتے تھے تو رَبَّنَا اِنَّانَعُوذُبِكَ مِنَ الشَّيطَان الرَّجيم فرض نماز میں اونچی آواز سے پڑھتے تھے اور یہ سورۃ الفاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد کہتے تھے۔

② ۔امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تعوذ اپنے دل میں پڑھا کرتے تھے۔

③ ۔امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اونچا پڑھے یا آہستہ پڑھے دونوں طور پر جائز ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے دوسرے ائمہ تعوذ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں، مفسر قرآن امام رازی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر ہم تعوذ کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ملائیں پھر تو اسے اونچا ہی پڑھا جائے گا اور اگر اسے افتتاح نماز کے ساتھ ملایا جائے تو پھر ظاہر ہے اسے آہستہ پڑھنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

تعوُّذ کے لئے کلمات: قرآن اور حدیث میں استعاذہ سے متعلق مختلف الفاظ اور کلمات وارد ہوئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (النَّحل: ۹۸) پس جب آپ قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کریں۔ دوسری سورۃ میں ارشاد ہے إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الدخان: ۶) بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ تیسری سورۃ میں ارشاد ہے إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الْأَعْرَافِ: ۲۰۰) بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء کے مابین اس میں اختلاف پایا جاتا ہے، حضرت امام شافعی فرماتے ہیں کہ

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کہنا واجب ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے، ان حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ اس طرح کہنا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، اور یہ حدیث شریف کے بھی مطابق ہے، جیسا کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح دونوں آیات کے درمیان موافقت ہو جائے گی، بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، کہا جائے تو پھر بھی دو آیات کے درمیاں موافقت پائی جائے گی۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ كَبَّرَ ثَلَاثًا (بیہقی کتاب السنن) جب رات کو اٹھتے تو تین بار اللہ اکبر کہتے اور یوں کہتے أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ،

امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہتر اور اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہے

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ،

امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ

أَنَّ أَوَّلَ مَا نَزَلَ جِبْرِيْلُ عَلَى مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ قَالَ: قُلْ يَا مُحَمَّدُ: أَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، ثُمَّ قَالَ: قُلْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (العلق)

سب سے پہلے جبریل جو چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں، میں اللہ خوب سننے والے، خوب جاننے والے کی شیطان مردود سے پناہ چاہتا ہوں، پھر فرمایا! کہ فرمائیں، بسم اللہ الرحمن الرحیم، پڑھیے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔ معلوم

ہوا کہ استعاذہ دل کو ان تمام چیزوں سے پاک کرتا ہے جو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہونے کے راستے میں رکاوٹ ہوں اور بسم اللہ دل کی توجہ اللہ تعالیٰ کے جلال کی ہیبت کی طرف کرنے کے لیے ہے۔(تفسیر کبیر ج ا)

اِستعاذہ کے بارے میں چند لطائف

بندے کے منہ سے جو لغویات اور گناہ کی باتیں صادر ہوتی ہیں، استعاذہ ان کے لئے طہارت کا کام کرتا ہے، اس کے منہ کو خوشبودار بناتا ہے، اسے تلاوت قرآن کے لئے تیار کرتا ہے، استعاذہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف کرنے کا نام ہے، استعاذہ بندے کی اپنے پوشیدہ دشمن کے مقابلے سے عاجز اور کمزور ہونے کا اقرار ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ جس ذات نے اسے پیدا کیا اس کے بغیر اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، وہ ایسا دشمن ہے جو رشوت قبول نہیں کرتا اور نہ ہی احسان کے ساتھ بھلتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسانوں میں کوئی دشمنی کرے تو اسے کسی طرح سے بھی رام کیا جا سکتا ہے، اسے اپنا بنایا جا سکتا ہے، مگر یہ پوشیدہ دشمن چھپ کر وار کرتا ہے، نظر بھی نہیں آتا۔ پوشیدہ دشمن کے وار سے اللہ کے متقی پرہیز گار بندے محفوظ رہتے ہیں، ان پر اس کا داؤ نہیں چلتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح کر دیا ہے۔

{إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَّ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا} (الإسراء: ٦٥)

بیشک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا تسلط نہیں ہو سکے گا، اور تیرا رب ان (اللہ والوں) کی کارسازی کے لئے کافی ہے۔

انسانی دشمنوں کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بدر میں فرشتے اتارے تھے، جسے انسانی دشمن قتل کر ڈالے وہ شہید کہلاتا ہے اور جسے پوشیدہ دشمن مار ڈالے اسے مردود اور مقہور کہا جاتا ہے، جس پر ظاہری دشمن غالب آجائے اسے اجر دیا جاتا ہے اور جس پر پوشیدہ دشمن غالب آجائے اسے

مَفْتُون(مصیبت زدہ) اور موزور (گناہ کی تہمت لگایاہوا) کہا جاتاہے۔جب شیطان انسان کووہاں سے دیکھ رہاہے جہاں سے انسان اسے نہیں دیکھ سکتاتو پھر کیوں نہ اس ذات عالی کی بارگاہ سے استعاذہ کیاجائے جواسے دیکھ رہی ہے اوراسے شیطان نہیں دیکھ رہا۔

اِستعاذہ کا معنی اور مفہوم:اِستِعَاذَۃُ یہ اِستَعَاذَ فعل کی مصدر ہے، باب اِستِفعَال ہے، اس کے شروع میں سین طلب کی ہے، اس کامادہ عوذہے، اس کامعنی ہے پناہ طلب کرنا،عوذ اور عیاذدونوں پر عربی زبان میں تَعَوُّذ کا لفظ بولاجاتاہے،تَعَوُّذ بھی مصدر ہے،عَوذ،عِیَاذ کالغت میں معنی ہے التجاء کرنا،امتناع،اوراعتصام،جب قرآن پڑھنے والایوں کہتاہے اعوذباللہ تو گویاوہ یوں کہہ رہا ہے، اَلجاء میں التجا کرتا ہوں، اَعتصم میں پناہ لیتا ہوں، پھر تعوذاوراستعاذہ عرف میں اَعُوذُباللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم کو کہا جانے لگا،یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ پر بولاجانے لگا۔یہ کلمات قرآنی نہیں ہیں، اس پر اجماع ہے، اس کے الفاظ خبری ہیں اوراس کامعنی انشائی ہے یعنی اَللّٰھُمَّ أَعِذنِي مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ. اے اللہ!مجھے شیطان مردود سے بچا۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے استعاذہ کامعنی یوں بیان کیاہے

ھِیَ الِالْتِجَاءُ إِلَی اللّٰہِ وَالِالْتِصَاقُ بِجَنَابِہٖ مِنْ شَرِّ کُلِّ ذِی شَرٍّ (ابن کثیر ۱/۱۱۴}

استعاذہ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے اوراس کی جناب کے ساتھ چمٹنے اور لپٹنے کو کہاجاتاہے، تاکہ ہر شریر کے شر سے حفاظت ہوسکے۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اس کامعنی یہ کرتے ہیں اَلعَوذُ:اَلِالتِجَاءُ اِلَی الغَیرِ وَالتَّعلُّقُ بِہٖ(مفردات امام راغب ص ۵۹۴)عوذ کسی دوسرے سے التجاکرنے اوراس سے منسلک رہنے کو کہا جاتاہے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وَالْعِیَاذَۃُ تَکُوْنُ لِدَفْعِ الشَّرِّ، وَاللِّیَاذُ یَکُوْنُ لِطَلَبِ جَلْبِ الْخَیْرِ (ابن کثیر ۱:۱۱۴} عیاذہ شرارت کودور کرنے کے لیے ہوتاہے اور لیاذہ کامعنی ہے جلب

خیر طلب کرنا۔ اس پر متنبی شاعر کا ایک شعر بھی ہے

يَامَنْ أَلُوْذُبِهِ فِيْمَا أُؤَمِّلُهُ ...وَمَنْ أَعُوْذُبِهِ مِمَّنْ أُحَاذِرُهُ

لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا أَنْتَ كَاسِرُهُ ...وَلَا يَهِيْضُوْنَ عَظْمًا أَنْتَ جَابِرُهُ

اے وہ ذات! جس سے میں امید رکھ کر پناہ مانگتا ہوں اور وہ کہ میں اس سے ڈر کر پناہ مانگتا ہوں جن ہڈیوں کو تو توڑ ڈالے لوگ انہیں جوڑ نہیں سکتے اور جن ہڈیوں کو تو جوڑ دے انہیں کوئی توڑ نہیں سکتا۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لغت کے اعتبار سے اعوذ، عوذ سے مشتق ہے جس کے دو معنیٰ ہیں ایک معنیٰ ہے اِلْتِجَاءٌ اور اِسْتِجَارَةٌ اور دوسرا معنی ہے اِلْتِصَاقٌ (چمٹنا) جیسے کلام عرب کا محاورہ ہے أَطْيَبُ اللَّحْمِ عَوَذُهُ کہ جو گوشت ہڈی کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے وہ زیادہ اچھا ہوتا ہے، ان معانی کے لحاظ سے اعوذ کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی حفاظت کی طرف التجاء کرتا ہوں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ مفہوم ہوگا کہ میں اپنے کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کی طرف چمٹاتا ہوں ۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کا مطلب ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شیطان مردود سے پناہ چاہتا ہوں، کہ وہ مجھے میرے دینی یا دنیوی کاموں میں کوئی نقصان پہنچائے، یا وہ مجھے کسی ایسے فعل سے باز رکھے جس کا مجھے کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا وہ مجھے کسی ایسے کام پر ابھارے جس سے مجھے روکا گیا ہے، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نصرت کے بغیر شیطان کے داؤ پیچ سے بچ نہیں سکتا۔

انسان اور شیطان: انسان کے دو دشمن ہیں، انسان اور شیطان، دونوں کے وار کی نوعیت بہت مختلف ہے، انسان کا دشمن اگر انسان بن جائے تو اسے قابو کرنے اور اس کا دل نرمانے کی تدابیر اللہ تعالیٰ نے انسان کو قرآن حکیم میں سکھادی ہیں، کہ وہ کس طرح رام ہو سکتا ہے، اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں موجود شیطانوں کے ساتھ خاطر مدارت اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اس کے ساتھ اچھا رویہ رکھنے کا ارشاد فرمایا ہے، تاکہ اس کے شر سے اس کی حفاظت ہو اور جناتی شیطان سے

استعاذہ کا حکم فرمایا ہے، کیونکہ وہ رشوت قبول کرتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی بھلائی واچھائی اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ طبعی طور پر شریر واقع ہوا ہے، اس کے شر وشرارت سے انسان کو وہی بچا سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے، یہی مفہوم یہ تین آیات مبارکات ادا کر رہی ہیں، علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میں ان تین آیات کے علاوہ کوئی چوتھی آیت نہیں جانتا جو اس مفہوم کو ادا کرے۔

انسان انسان کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ انسانی بستی میں رہنے والے لوگوں میں اونچ نیچ، کمی بیشی کا امکان ہر وقت رہتا ہے، یہ اونچ نیچ کبھی ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور کبھی اس سے بڑھ جاتی ہے، کبھی جان بوجھ کر ہوتی ہے اور کبھی انجانے میں ہوتی ہے، اس سے دلوں میں رنجشوں کا پیدا ہونا لازمی امر ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس کا علاج بتایا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے اور کس طرح اس انسانی دشمن کو اس کی شرارتوں سے روکنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الأعراف ۱۹۹) درگزر سے کام لیں اور جاہلوں سے روگردانی فرمائیں۔ یہ آیت انسانی دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے بارے میں ہے۔

انسان شیطان کا کیا کرے؟ شیطان نظر نہیں آتا، چھپ کر انسان پر حملہ کرتا ہے، انسان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرے اوپر یہ نادیدہ حملہ کرنے والا کون ہے؟ جس نے مجھے عظمت سے ذلت کی کھائی کی طرف لڑھکا دیا ہے، اس سے بچاؤ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص سے ہو سکتا ہے، وہی اپنی قدرت اور اپنی بے پایاں حکمت سے اس کے تمام مکر و دجل، فریب اور دھوکہ دہی سے بچا سکتا ہے، اس نے اس سے بچاؤ کا طریقہ بھی سکھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (الأعراف: ۲۰۰) اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا وسوسہ پیدا ہو

تو خدا سے پناہ مانگو بیشک وہ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ السَّیِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا یَصِفُونَ * وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِینِ * وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ یَحْضُرُونِ (المؤمنون: ۹۶ -۹۸)

اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے * اور کہو کہ اے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں * اور اے پروردگار! اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آموجود ہوں۔دوسری جگہ ارشاد ہے

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِی هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِی بَیْنَكَ وَبَیْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیمٌ * وَمَا یُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِینَ صَبَرُوا وَمَا یُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِیمٍ * وَإِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِیعُ الْعَلِیمُ } (فصلت: ۳۴، ۳۶)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ شخص جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے * اور یہ بات انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں * اور اگر تمہیں شیطان کی جانب سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو خدا کی پناہ مانگ لیا کرو بیشک وہ سنتا (اور) جانتا ہے۔

لفظ شیطان کی تحقیق: لفظ شیطان کے اشتقاق کے بارے میں دو قول ہیں، علامہ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ اَلشَّیْطَانُ اَلنُّوْنُ فِیْهِ اَصْلِیَةٌ ،وَهُوَمِنْ شَطَنَ ای تَبَاعَدَ(مفردات امام راغب ص۴۵۴) شیطان میں :ن: اصلی ہے، یہ شَطَن سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے دور ہوا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ شیطان اپنی طبیعت کے اعتبار سے انسانی طبیعت سے دور ہے اور اپنے فسق اور نافرمانی کے اعتبار سے ہر بھلائی اور خیر سے دور ہے۔

دوسرا قول یہ ہے۔ وَقِيْلَ: بَلِ النُّوْنُ فِيْهِ زَائِدَةٌ، مِنْ: شَاطَ يَشِيْطُ: اِحْتَرَقَ غَضَباً، فَالشَّيْطَانُ مَخْلُوْقٌ مِّنَ النَّارِ (مفردات امام راغب ص ۴۵۴) کہا گیا ہے کہ نون اس میں زائد ہے، یہ شاط یشیط سے مشتق ہے، جس کا معنی غصے میں جلنا، تو شیطان آگ سے بنایا گیا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ دونوں معنی صحیح ہیں، لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ صحیح ہے، اس پر کلام عرب میں بھی دلالت موجود ہے۔ جیسے امیہ بن ابی الصلت کے اشعار میں لفظ شاطن استعمال ہوا ہے، جہاں اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے

أَيُّمَا شَاطِنٍ عَصَاهُ عَكَاهُ ..... ثُمَّ يُلْقَى فِي السِّجْنِ وَالأَغْلاَلِ

یہاں اس نے لفظ شاطن استعمال کیا ہے نہ کہ شائط۔ اسی طرح عرب شاعر نابغہ ذبیانی نے کہا تھا

نَأَتْ بِسُعَادٍ عَنْكَ نَوًى شَطُوْنُ ... فَبَانَتْ وَالفُؤَادُ بِهَا رَهِيْنُ

یہاں اس نے بھی شطون کا لفظ استعمال کیا ہے۔

سیبویہ یہ کہتے ہیں کہ عرب لوگ تشیطن کا لفظ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شیطانی کام کرے، اس سے معلوم ہوا کہ شیطان شَطَنَ سے ہے، اگر یہ لفظ شَاطَ سے ہوتا تو کسی شیطانی کام کرنے والے کے لئے شَاطَ يَشِيْطُ استعمال کیا جاتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے شیطان کے بارے میں دو قول نقل کیے ہیں پہلا قول یہ ہے کہ شیطان شَطَنَ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے دور ہونا، جیسے عربی کا محاورہ ہے شَطَنَ دَارُكَ أَيْ بَعُدَ، یعنی تیرا گھر دور ہوا، اسی لیے یقینی طور پر ہر سرکش جن، انسان اور جانور کو شیطان کہا جاتا ہے اس کے درست طریقے سے ہٹنے کی وجہ سے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا، اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شریر آدمیوں اور جنوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کے لیے سکھاتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو یہ کام نہ

کرتے سو توانہیں اور جو جھوٹ بناتے ہیں چھوڑ دے۔(سورۃ الانعام آیت ۱۱۲)

دوسرا قول یہ ہے کہ شیطان شاط یشیط سے ماخوذ ہے، جب وہ باطل ہو جائے، جب ہر سرکش اپنی ذات میں باطل کی طرح ہے باطل کرنے کے سبب سے، اسی لیے اس کا نام شیطان رکھا گیا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱)

مسند امام احمد رحمہ اللہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يَا أَبَا ذَرٍّ، تَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْ شَرِّ شَيَاطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، وَلِلْإِنْسِ شَيَاطِينُ؟ قَالَ: نَعَمْ اے ابوذر! جنات اور انسانی شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیا کرو، میں نے عرض کیا: کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں۔

مسند احمد ہی کی روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا نَعَمْ شَيَاطِينُ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا، ہاں! انسانوں اور جنات میں سے جو شیاطین ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے دلوں میں ملمع سازی کی باتیں ڈالتے ہیں۔(مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان نقل فرمایا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت، گدھے اور کالے کتے کا نمازی کے آگے سے گزرنے کو قاطع نماز قرار دیا ہے، حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کالے کتے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے حوالے سے بتایا کہ کالا کتا تو شیطان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فَإِنَّهُ يَقْطَعُ صَلَاتَهُ الْحِمَارُ، وَالْمَرْأَةُ، وَالْكَلْبُ الْأَسْوَدُ» قُلْتُ: يَا أَبَا ذَرٍّ، مَا بَالُ الْكَلْبِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْكَلْبِ الْأَحْمَرِ مِنَ الْكَلْبِ الْأَصْفَرِ؟ قَالَ: يَا ابْنَ أَخِي، سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا سَأَلْتَنِي فَقَالَ: الْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ (مسلم) عورت، گدھا

اور کلب اسود نماز کو توڑ دیتے ہیں، میں نے عرض کیا: اے ابوذر! سرخ، پیلے کے بجائے یہ کالے کتے کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ اے میرے بھتیجے! میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح سوال کیا تھا جس طرح آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کالا کتا شیطان ہے۔

ہمارا مقصود یہاں صرف اپنی بات پر استدلال پیش کرنا ہے، کیا ان کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، یا ان کے نمازی کے سامنے موجود رہنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، اس پر اور بھی کئی روایات موجود ہیں، جن کو ذکر کرنے کے بعد شارحین نے تطبیق کی کوشش کی ہے۔ مسلم کی شرح میں کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ سُمِّيَ شَيْطَانًا لِّكَوْنِهِ أَعْقَرَ الكِلَابِ وَأَخْبَثَهَا وَأَقَلَّهَا نَفعًا وَأَكثَرَهَا نُعَاسًا کالے کتے کو شیطان اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کتوں میں زیادہ کاٹ کھانے والا ہے، ان میں سب سے زیادہ خبیث ہے، ان میں نفع کے اعتبار سے کم ترین اور سونے کے اعتبار سے زیادہ ہے۔

اسی طرح حضرت وھب رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک بار ایک گھوڑے پر سوار ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے شیطان قرار دیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں

وَرَكِبَ عُمَرُ بِرْذَوْنًا فَطَفِقَ يَتَبَخْتَرُ بِهِ فَجَعَلَ يَضْرِبُهُ فَلَا يَزْدَادُ إِلَّا تَبَخْتُرًا فَنَزَلَ عَنْهُ وَقَالَ: مَا حَمَلْتُمُونِي إِلَّا عَلَى شَيْطَانٍ. (إسنادہ صحیح)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھوڑے پر سوار ہوئے جس نے اٹکھیلیاں شروع کر دیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مارنا شروع کیا تو وہ اور زیادہ اٹکھیلیاں کرنے لگا، آپ رضی اللہ عنہ اس سے اتر گئے، اور فرمانے لگے، تم نے مجھے شیطان پر سوار کیا ہے، میری طبیعت نے اس پر سواری کو ناپسند کیا اس لئے میں اس سے اتر آیا۔

رجیم (دھتکارہ ہوا): رجیم فعیل کے وزن پر اسم مفعول ہے، اس کا معنی ہے مرجوم اور مطرود عن الخیر، یعنی خیر سے دھکیلا ہوا اور دھتکارا ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: {وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ} (الملك: ۵) اور ہم نے دنیا کے آسمان کو

چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور ہم نے انہیں شیطانوں کو مارنے کے لیے آلہ بنا دیا ہے اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

{ إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ * وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَارِدٍ * لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الأَعْلَى وَيُقْذَفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ * دُحُورًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ * إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ }(الصافات ۱۰،۶) ہم نے نیچے کے آسمان کو ستاروں سے سجایا ہے * اور اسے ہر ایک سرکش شیطان سے محفوظ رکھا ہے * وہ عالم بالا کی باتیں نہیں سن سکتے اور ان پر ہر طرف سے (انگارے) پھینکے جاتے ہیں * بھگانے کے لیے اور ان پر ہمیشہ کا عذاب ہے * مگر جو کوئی اچک لے جائے تو اس کے پیچھے دہکتا ہوا انگارہ پڑتا ہے * (سورۃ الصافات ۱۰،۶)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

{ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ * وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيْمٍ * إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ } (الحجر: ۱۶ -۱۸)اور البتہ تحقیق ہم نے آسمان پر برج بنائے ہیں اور دیکھنے والوں کی نظر میں اسے رونق دی ہے * اور ہم نے اسے ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا * مگر جس نے چوری سے سن لیا تو اس کے پیچھے چمکتا ہوا انگارہ پڑا * شیطان کو یہاں رجیم کہا گیا ہے جس کا لغوی معنی ہے سنگسار کیا ہوا، جب کہ اس کا مرادی معنی ہے لعنت کیا ہوا، مرجوم بمعنی ملعون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے

فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ (الْحِجْرِ: ۳۴) پس تو جنت سے نکل جا کیونکہ تو ملعون ہے۔

لعنت کو رجم کہا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات نقل فرمائی ہے، جب انہوں نے اپنے والد کو کہا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ (مَرْيَمَ: ۴۶) اگر تو بتوں کی عبادت سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کروں گا۔

تواس رجم سے مراد پتھروں کے ساتھ مارنا نہیں ہے بلکہ قول مراد ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے اس قول کو نقل کیا جو انہوں نے حضرت نوح کی توحیدی دعوت کے جواب میں کہا تھا کہ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يَا نُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشُّعَرَاءِ: ۱۱۶)اے نوح!اگر تو باز نہ آیا تو تُو سنگسار کیے ہوؤں میں سے ہو جائے گا۔یہاں بھی مرجوم سنگسار کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی قول مراد ہے۔

اسی طرح سورۃ یٰسین میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ (یس: ۱۸)اگر آپ باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو سنگسار کریں گے۔یہاں بھی رجم سے پتھروں کی مار مراد نہیں ہے بلکہ قول مراد ہے۔

شیطان رجیم کون ہے؟شیطان رجیم ابلیس ہی کو کہا جاتا ہے،جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باعث شیطان قرار پایا اور رحمت خداوندی سے اسے دور پھینکا گیا ہے،قرآن حکیم میں ابلیس کے شیطان بن جانے کی وضاحت فرمائی گئی ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا إِلَّا إِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ (۱۱) قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ (۱۲) قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِيْنَ (۱۳){الاعراف} اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو پھر سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا* فرمایا تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا ہے جب کہ میں نے تجھے حکم دیا کہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا ہے* کہا تو یہاں سے اتر جا تجھے یہ لائق نہیں کہ یہاں تکبر کرے پس نکل جا بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے* اسی سورت میں ہے۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِيْنَ

فرمایا یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا جو شخص ان سے تیرا کہا مانے گا میں تم سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔(سورۃ الاعراف آیت ۱۸)

قرآنی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کے شیطان قرار دیئے جانے کی وجہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی لایعنی دلیلیں دینا ہے، اپنے کو آدم علیہ السلام سے افضل سمجھنا ہے، جب اس نے کہا کہ اللہ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھے آگ سے بنایا ہے، آگ بلندی چاہتی ہے جب کہ مٹی پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے۔ یہی بات تھی کہ اللہ تعالیٰ کو جلال آیا اور شیطان مردود بھی ٹھہرا، مرجوم بھی بن گیا اور رحمت خداوندی سے مطرود بھی ہو گیا۔

استعاذہ کے ارکان: علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں کہ استعاذہ کے پانچ ارکان ہیں ① الاستعاذہ: اس سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ مانگی جاتی ہے۔

② المستعیذ: اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ مانگتا ہے۔

③ المستعاذ بہ: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کی بارگاہ میں پناہ مانگی جاتی ہے۔

④ المستعاذ منہ: اس سے مراد شیطان مردود ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے۔

⑤ اجل الاستعاذہ: اس سے مراد استعاذہ کی حکمت اور غرض وغایت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لی جاتی ہے۔

پناہ کون لوگ مانگیں؟ قرآنی نصوص اور نبوی ارشادات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ استعاذہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دیا ہے، چاہے وہ عام بندے ہوں یا خاص بندے یعنی حضرات انبیا کرام علیہم السلام ہوں بقول امام رازی یہ کسی شخص معین کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ علی سبیل العموم حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ کے واقعات نقل فرمائے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ تمام مخلوق پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ لے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی بات نقل فرمائی ہے کہ

رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (هُودٍ: ۴۷) اے میرے رب! میں تیری

پناہ مانگتا ہوں اس بات کی کہ میں تجھ سے کسی ایسی بات کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو دو جوڑے عطاء کیے، ایک سلامتی کا اور دوسرا برکات کا، جیسا کہ ارشاد ہے قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ (هُودٍ: ۴۸) کہا گیا اے نوح! تو ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اتر جا اور تجھ پر برکات ہوں۔

یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے ورغلایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے میں عافیت سمجھی اور فرمایا: مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ (يُوسُفَ: ۲۳) میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں، بے شک میرا پروردگار میرا بہترین ٹھکانہ ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یوسف کو دو جوڑے عطاء فرمائے ایک ان سے برائی دور کرنے کا اور دوسرا ان سے بے حیائی دور کرنے کا۔ جیسا کہ ارشاد ہے لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ (یوسف: ۲۴) ہم ان سے بُرائی اور بے حیائی کو پھیر دیں گے۔

اسی طرح جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کہا کہ ہمارے بھائی کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لو تو اس پر یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی بات کی تھی، ارشاد ہے قِيلَ لَهُ: فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ (يُوسُفَ: ۷۸) انہیں کہا گیا کہ ہم میں سے اس کی جگہ کسی کو رکھ لو۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ (يُوسُفَ: ۷۹) اللہ تعالیٰ کی پناہ، اس بات سے کہ ہم کسی ایسے شخص کو پکڑیں سوائے اس کے جس کے پاس ہمارا سامان ہو۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کے ساتھ ان کو اعزاز بخشا وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّداً، (يُوسُفَ: ۱۰۰) اس کے والدین کو تخت شاہی پر بلند کیا اور وہ اس کے لیے سجدے میں گر گئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ نقل فرمایا جب انہوں نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، تو ان کی قوم نے انہیں یہ جواب دیا تھا کہ کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے تو اس

پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ (الْبَقَرَةِ: ٦٧) میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں دو جوڑے عطاء فرمائے ایک تہمت کو ختم کرنے اور دوسرا مقتول کو زندہ کرنے کا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ، (الْبَقَرَةِ: ٧٣) پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ پر اس گائے کا ایک حصہ، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔

اسی طرح جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے انہیں قتل کرنے کی دھمکیاں دیں تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ (الدُّخَانِ: ٢٠) اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (غَافِرٍ: ٢٧) میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں ہر متکبر سے جو قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مراد پوری کی، ان کے دشمن کو فنا کر دیا اور انہیں ان کی زمین اور وطن کا وارث بنا دیا۔

حضرت مریم علیہا السلام نے فرمایا

وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ: (آلِ عِمْرَانَ: ٣٦) اور بے شک میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔ اس پر حضرت مریم علیہا السلام نے خلعت اور قبولیت حاصل کی۔ فرمان خداوندی ہے فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتاً حَسَناً (آلِ عِمْرَانَ: ٣٧) پھر اس کے رب نے اسے قبول کیا اچھی طرح قبول کرنا اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا۔

جب حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت جبریل امین کو انسانی شکل وصورت میں دیکھا جو ان کے ساتھ تنہائی میں ملاقات کر رہے تھے تو وہ پکار اٹھیں إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ

تَقِيًّا (مَرْيَمَ: ۱۸) مجھے رحمن کی پناہ تجھ سے اگر تو اللہ سے ڈرتا ہے۔

اس پر حضرت مریم کو دو نعمتوں سے نوازا گیا، ایک انہیں بغیر خاوند کے بیٹا عطا فرمایا گیا، دوسرا اسی بیٹے کی زبان سے ان کی عصمت کی گواہی دلوائی گئی، جیسا کہ ارشاد ہے إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ (مَرْيَمَ: ۳۰) بے شک میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو یکے بعد دیگرے استعاذہ کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ اور فرمادیجیے اے میرے رب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کی چھیڑ سے اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔ (سورۃ المومنون ۹۸،۹۷)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (الفلق: ۱) وقُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (النَّاسِ: ۱) فرمادیجیے میں پناہ چاہتا ہوں صبح کے رب کی اور فرمادیجیے میں پناہ چاہتا ہوں لوگوں کے رب کی۔

سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ارشاد فرمایا خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (الْأَعْرَافِ: ۱۹۹، ۲۰۰) درگزر کی عادت اپنایئے، نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے منہ موڑیئے اور اگر آپ کو شیطان کی چھیڑ ابھارے تو آپ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگیں، بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

سورۃ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (فُصِّلَتْ: ۳۴) اچھی بات کے ساتھ دفاع کریں، پس وہ شخص کہ اس کے اور آپ کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسے ہو جائے گا جیسا کہ دلی دوست۔ اس کے ساتھ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ

السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (فُصِّلَتْ: ۳۶) اوراگر شیطان آپ کو ابھارے چھیڑ کے ساتھ تو آپ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگیے، بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ یہ تمام آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہمیشہ جن اور انسانی شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

اَحادیث مبارکہ میں اِستعاذہ کا ذکر

ذخیرہ احادیث میں استعاذہ کا کثرت کے ساتھ ذکر ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی ایک دوسرے کو بہت زیادہ برا بھلا کہہ رہے تھے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَاهَا لَذَهَبَ عَنْهُمَا ذَلِكَ. وَهِيَ قَوْلُهُ: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بے شک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں، اگر یہ دونوں اس کلمہ کو کہیں تو ان سے یہ چیز چلی جائے اور وہ ہے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ مفہوم تو ذہنوں میں کئی وجوہ سے ثابت ہے، ایک تو یہ کہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ اس کا علم اس دنیا کے مصالح کے لیے ہے، جب کہ اس کے مفاسد بہت ہی تھوڑے ہیں، تو ان تھوڑے سے مفاسد کو عقل کے ذریعے جاننا اس کے لیے ممکن ہے اور غصہ کے وقت عقل ختم ہو جاتی ہے، اس وقت انسان جو کچھ کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے وہ عمدہ طریقے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتا، اگر اس وقت اسے یہ بات مستحضر ہو تو تو یہ مفہوم اسے ایسا کرنے اور ایسا کہنے سے رکاوٹ بن جائے اور اسے اللہ تعالیٰ کی نیکیوں کے حصول اور آفات کے دفعیہ کے لیے متوجہ ہونے کی ترغیب دے، اس لیے اسے یقینی طور پر اعوذ باللہ کہنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے انسان یہ بات قطعی نہیں جانتا کہ حق اس کی طرف ہے یا اس کے مخالف کی طرف ہے، جب اسے معلوم ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، پس اگر حق میری طرف ہے تو اللہ تعالیٰ اسے میرے مخالف سے پورا پورا وصول کرلے گا اور اگر حق میرے مخالف کی جانب ہے تو بہتر یہ ہے کہ میں اس پر زیادتی نہ کروں، اس

وقت وہ اس فیصلے کو اللہ کے سپرد کرتا ہے اور اعوذ باللہ کہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ انسان جب اپنی طرف قوت کی زیادتی محسوس کرتا ہے تو اسے غصہ آتا ہے اس پر وہ اپنے مخالف پر رعب ڈالتا ہے، لیکن جب اس کے ذہن میں اس بات کا استحضار ہوتا ہے کہ دنیا کا معبود مجھ سے بہت زیادہ قوت والا اور بہت زیادہ قدرت والا ہے، پھر میں اس کی بار بار نافرمانی کرتا ہوں اور وہ اپنی مہربانی کرتے ہوئے مجھ سے درگزر کرتا ہے تو میرے لیے بہتر یہ ہے کہ میں اس مغضوب علیہ شخص سے درگزر کروں، جب اس کے ذہن میں یہ معنی آتا ہے تو وہ لڑائی جھگڑے چھوڑ دیتا ہے اور اعوذ باللہ کہتا ہے۔ کیونکہ اہل تقویٰ کو جب شیطان چرکہ لگاتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ تلاش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا، آیت مبارکہ ہے إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (الْأَعْرَافِ: ۲۰۱) جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، اُنہیں جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آکر چھوتا بھی ہے تو وہ (اللہ کو) یاد کر لیتے ہیں، چنانچہ اچانک اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں یہ اسرار و معانی یاد آتے ہیں تو انہیں رشد و ہدایت دکھائی دیتی ہے تو وہ نزاع اور دفاع چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں یعنی عام متقین کے حق میں یہ محال نہیں کہ شیطان کا گزران کی طرف ہو اور کوئی چرکہ لگا جائے، البتہ متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ شیطان کے اغوا سے ممتد غفلت میں نہیں پڑتے بلکہ ذرا غفلت ہوئی اور خدا کو یاد کر کے چونک پڑے، ٹھوکر لگی اور معاً سنبھل گئے، سنبھلتے ہی آنکھیں کھل گئیں، غفلت کا پردہ اٹھ گیا، نیکی بدی کا انجام سامنے نظر آنے لگا اور بہت جلد نازیبا کام سے رک گئے، بہر حال متقی کی شان یہ ہے کہ جب شیطان دق کرے، فوراً خدا سے پناہ مانگے، دیر نہ کرے، ورنہ غفلت میں تمادی ہو کر رجوع الی اللہ کی توفیق بھی نہیں رہے گی (تفسیر عثمانی)

حضرت معقِل بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، وَقَرَأَ ثَلَاثَ آيَاتٍ مِّنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْحَشْرِ، وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ سَبْعِيْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ حَتّٰى يُمْسِيَ، فَإِنْ مَّاتَ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيْدًا، وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِيْ كَانَ بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ. جو شخص صبح کو تین بار اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہے اور سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھے، تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے اس کے سپرد کر دیتے ہیں جو اس پر شام تک رحمت بھیجتے رہتے ہیں، اگر وہ اسی روز مر جائے تو شہادت کی موت مرے گا اور اگر اس نے یہ کام شام کو کیا تو پھر بھی اس کے لیے ایسا ہی ہے۔ (تفسیر علامہ فخر الدین رازی ج ا ص ۷۸)

معلوم ہوا کہ اعوذ باللہ کہنا اس کی کمال عجز وانکساری اور انتہاء درجے کے قصور کا مشاہدہ ہے، جب کہ سورۃ الحشر کی آخری تین آیات اللہ تعالیٰ کے کمال، جلال اور اس کی عظمت کا مشاہدہ ہے اور مقام عبودیت میں کمالِ حال ان دو مقامات کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

مَنِ اسْتَعَاذَ فِي الْيَوْمِ عَشْرَ مَرَّاتٍ وَكَّلَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ مَلَكًا يَذُوْدُ عَنْهُ الشَّيْطَانَ جو شخص ایک دن میں دس بار شیطان سے پناہ مانگے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیتے ہیں جو اس سے شیطان کو دور کرتا ہے۔ (تفسیر رازی ج ا ص ۷۸)

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا فَقَالَ: أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ مِنْ ذٰلِكَ الْمَنْزِلِ (تفسیر رازی ج ا ص ۷۸) جو شخص کسی مقام پر پڑاؤ کرے اور یہ کلمات کہے أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے تام کلمات کے ساتھ ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی تو جب تک وہ اس جگہ سے کوچ نہیں کر لیتا کوئی چیز اسے نقصان نہیں پہنچائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم عقلیہ میں یہ بات ثابت ہے کہ روحانی اشخاص کی کثرت جسمانی اشخاص کی کثرت پر فوقیت رکھتی ہے اورآسمان پاکیزہ ارواح سے بھرے ہوئے ہیں جیساکہ نبی کریم ﷺ کاارشادہے أَطَّتِ السَّمَآءُ، وَحَقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ، مَا فِيْهَا مَوْضِعُ قَدَمٍ إِلَّا وَفِيْهِ مَلَكٌ قَائِمٌ أَوْ قَاعِدٌ

آسمان چِرچِراتاہے اوراس کا حق ہے کہ وہ چِرچِرائے، کیونکہ اس میں ایک قدم کی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ کھڑا یابیٹھا ہوا نہ ہو۔اسی طرح اثیر اور ہوا روحوں سے بھری ہوتی ہے،ان میں بعض پاکیزہ ،روشن اور بہتر ہوتی ہیں اور بعض گندی ،نقصاندہ اور شریر ہوتی ہیں ،جب انسان (أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّآتِ) پڑھتاہے تو یہ پاکیزہ ارواح ان خبیث ارواح سے پناہ مانگتی ہیں،اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلمات "کن" یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نافذہ کانام ہے اورجو شخص اس کی قدرت کے ساتھ پناہ مانگے تواسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاسکتی۔ (تفسیر رازی ج ا ص ۷۸)

حضرت عمروبن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:إِذَا فَزِعَ أَحَدُكُمْ مِنَ النَّوْمِ فَلْيَقُلْ أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ شَرِّ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّ (تفسیر رازی ج ا) جب تم میں کوئی شخص نیند میں ڈر جائے تو وہ یہ کلمات أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ شَرِّ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ میں اللہ تعالیٰ کے تام کلمات کے ذریعے اس کے غضب، اس کی سزا، اس کے بندوں کے شر، ہمزات الشیاطین کے شر اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں پناہ مانگتاہوں) کہے تووہ اسے نقصان نہیں دے سکتے

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وَكَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ يُعَلِّمُهَا مَنْ بَلَغَ مِنْ عَبِيْدِهِ، وَمَنْ لَمْ يَبْلُغْ كَتَبَهَا فِي صَكٍّ ثُمَّ عَلَّقَهَا فِي عُنُقِهِ (تفسیر کبیر علامہ رازی ج ا ص ۷۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کاطریقہ کاریہ تھاکہ ان کے جوغلام بالغ ہوچکے تھے انہیں یہ کلمات

سکھا دیتے تھے اور جو غلام نابالغ ہوتے تھے تو ایک کاغذ پر لکھتے پھر اسے اس کی گردن میں لٹکا دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنے نواسوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے پناہ مانگا کرتے تھے اور یوں فرمایا کرتے تھے، أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَآمَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَآمَّةٍ، اسی طرح آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ كَانَ أَبِي إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَوِّذُ بِهَا إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ، میرے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے دونوں بیٹوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے لیے ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگا کرتے تھے۔

حضرت حسن علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنے غلام کی پٹائی کر رہا تھا، غلام نے اعوذ باللہ کہنا شروع کر دیا، اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، تو اس غلام نے کہا: اعوذ برسول اللہ تو آقا نے پٹائی روک دی، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی پناہ مانگنے والا اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ اس سے ہاتھ روکا جاتا، اس پر آقا نے کہا: یارسول اللہ! میں آپ ﷺ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد ہے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: أَمَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَمْ تَقُلْهَا لَدَافَعَ وَجْهُكَ سَفْعَ النَّارِ. (مصنف عبدالرزاق) قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تو یہ نہ کہتا تو وہ تیرے چہرے کو آگ میں جھلسا دیتا۔

حضرت سوید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سنا ہے وہ یوں کہہ رہے تھے أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۷۸) اور آپ نے فرمایا کہ میں نے آپ ﷺ کو شیطان مردود سے پناہ مانگتے ہوئے سنا ہے، اس لیے میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں یہ کلمات ادا کرنا چھوڑ دوں۔

آپ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَأَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ غَضَبِكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ (اے اللہ!) میں تیری رضا کے ذریعے تیری ناراضگی سے اور تیری معافی کے ذریعے تیرے غصے سے پناہ چاہتا ہوں اور تجھ سے پناہ چاہتا ہوں۔

استعاذہ سے مقصود: شیطان کے شر اور وساوس سے بچنے کے لیے استعاذہ کیا جاتا ہے، امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں

وَالْمَقْصُوْدُ مِنَ الِاسْتِعَاذَةِ دَفْعُ شَرِّ الشَّيْطَانِ، وَاعْلَمْ أَنَّ شَرَّ الشَّيْطَانِ إِمَّا أَنْ يَّكُوْنَ بِالْوَسْوَسَةِ أَوْ بِغَيْرِهِمَا، كَمَا ذَكَرَهُ فِيْ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ (البقرہ: ۲۷۵)

استعاذہ سے مقصود شر شیطان کو دور کرنا ہے، اور جان لیجیے کہ شیطانی شر یا تو وسوسہ کے ساتھ ہوتا ہے یا اس کے علاوہ کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں اس کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ (تفسیر کبیر للرازی)

جنات اور شیاطین

جنات اور شیاطین کے وجود کے بارے میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے، بعضوں نے تو ان کے وجود کا انکار بھی کیا ہے، مگر قرآن اور حدیث کی واضح نصوص موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات اور شیاطین ایک حقیقت ہیں ان کے وجود کا انکار قرآن اور حدیث کی نصوص کا صریح انکار ہے، تاہم یہ بات واضح ہے کہ جنات اور شیاطین کوئی ٹھوس اجسام نہیں ہیں، جن کی انسانوں اور حیوانوں کی طرح آمد و رفت ہوتی ہے، امام رازی کے مطابق اس بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ

أَنَّهَا أَجْسَامٌ هَوَائِيَّةٌ قَادِرَةٌ عَلَى التَّشَكُّلِ بِأَشْكَالٍ مُّخْتَلِفَةٍ، وَلَهَا عُقُوْلٌ وَأَفْهَامٌ وَقُدْرَةٌ عَلَى أَعْمَالٍ صَعْبَةٍ شَاقَّةٍ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۷۹)

یہ ہوائی اجسام ہیں، جو مختلف شکلیں بنانے پر قدرت رکھتے ہیں، یہ عقل و فہم والی مخلوق ہے، جو مشکل اور مشقت والے کاموں پر قدرت رکھتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ أَنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ أَثْبَتُوا أَنَّهَا مَوْجُوْدَاتٌ غَيْرُ مُتَحَيِّزَةٍ وَّلَا حَالَّةٍ فِي الْمُتَحَيِّزِ، وَزَعَمُوْا أَنَّهَا مَوْجُوْدَاتٌ مُجَرَّدَةٌ عَنِ الْجِسْمِيَّةِ، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۷۹)

بہت سے لوگوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ یہ مخلوق موجود ہے، مگر کسی خاص جگہ میں نہیں ہے اور نہ کسی خاص حالت میں ہے، ان کا خیال ہے کہ وہ جسم کے بغیر موجود ہیں۔ پھر یہ موجودات کبھی بالکل جسمانی تدبیر سے پاکیزہ اور بلند ہوتی ہیں، یہ مقرب فرشتے ہوتے ہیں

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ اور اس کے پاس جو مخلوق ہے وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتی اور نہ ہی کمی کرتی ہے۔ (الانبیاء: ۱۹)

اور اس کے ساتھ وہ روحیں ملی ہوئی ہیں جو اجسام کے ساتھ متعلق ہیں، ان میں اشرف اور اعلیٰ درجہ ان فرشتوں کا ہے جنہوں نے اللہ کا عرش اٹھار کھا ہے، انہیں حملۃ العرش کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (الْحَاقَّةِ: ۱۷) اور اس دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتوں نے اٹھار کھا ہو گا۔ اور دوسرا درجہ عرش کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوئے فرشتوں کا ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَتَرَى الْمَلَآئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (الزُّمَرِ: ۷۵) اور دیکھے گا تو فرشتوں کو عرش کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوں گے۔

تیسرا درجہ کرسی والے فرشتوں کا ہے اور چوتھا مرتبہ طبقاً طبقاً آسمانی فرشتوں کا ہے اور پانچواں مرتبہ کُرّۂ اثیر کے فرشتوں کا ہے، چھٹا مرتبہ کرّہ ہوائی فرشتوں کا ہے اور ساتواں مرتبہ کرّۂ زمہریر فرشتوں کا ہے اور آٹھواں مرتبہ ان ارواح کا ہے جو دریاؤں کے ساتھ متعلق ہیں اور نواں مرتبہ ان روحوں کا ہے جو پہاڑوں سے متعلق ہیں اور دسواں مرتبہ ان سُفلی روحوں کا ہے جو اس جہاں میں موجود نباتاتی اور حیوانی اجسام میں تصرف کرتی ہیں اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ ان دونوں قولوں کے مطابق یہ روحیں کبھی کبھی روشن، الٰہیاتی بہترین اور نیک بخت ہوتی ہیں، ان کا نام صالح جنات ہے اور کبھی کبھی یہ روحیں میلی، سُفلی، شرارتی اور بدبخت ہوتی ہیں، ان کا نام شیاطین ہے۔

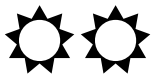

جنات اور قرآن

جنات اور شیاطین موجود ہیں، اس پر قرآن اور حدیث میں بہت سے دلائل موجود ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنْصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ (الْأَحْقَافِ:۲۹،۳۰)

اور جس وقت متوجہ کر دیے ہم نے آپ کی طرف کتنے ہی لوگ جنوں میں سے جو قرآن سننے لگے، پس جب وہ وہاں پہنچ گئے تو انہوں نے کہا کہ خاموش ہو جاؤ، پھر جب ختم ہوا الٹے پھرے اپنی قوم کو ڈر سناتے ہوئے، انہوں نے کہا: اے ہماری قوم بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، حق اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

یہ آیت جنات اور شیاطین کے وجود پر نص ہے اور اس بات پر نص ہے کہ انہوں نے قرآن سنا اور اس بات پر نص ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو ڈرایا۔

اسی طرح دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ، (الْبَقَرَةِ: ۱۰۲) اور اس علم کی انہوں نے پیروی کی جسے شیاطین سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں پڑھتے تھے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے، جس میں شیاطین کی ایک عجیب شرارت کا ذکر ہے كَتَبَتِ الشَّيَاطِينُ كُتُبًا فِيهَا كُفْرٌ وَشِرْكٌ , ثُمَّ دَفَنَتْ تِلْكَ الْكُتُبَ تَحْتَ كُرْسِيِّ سُلَيْمَانَ, فَلَمَّا مَاتَ سُلَيْمَانُ اسْتَخْرَجَ النَّاسُ تِلْكَ الْكُتُبَ فَقَالُوا: هَذَا عِلْمٌ كَتَمَنَاهُ سُلَيْمَانُ شیاطین نے کفر اور شرک پر مبنی کچھ کتابیں لکھیں، پھر انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی

کے نیچے دفن کر دیا، جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے ان کتابوں کو نکالا اور کہنے لگے یہ وہ علم ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھپایا تھا۔ (تفسیر عبد الرزاق ج ا ص ۲۸۱، تفسیر طبری ج ۲)

اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں کیا وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (البقرۃ: ۱۰۲) اور اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین (حضرت) سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے، سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے، اور بابل میں ہاروت ماروت دو فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں ذکر فرمایا يَعْمَلُوْنَ لَهُ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (سبأ: ۱۳) بناتے اس کے لیے جو کچھ وہ چاہتے ، قلعے تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں چولہوں پر جمی ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالشَّيَاطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّآخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ اور تابع کر دیے شیطان سارے، عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے اور دوسرے جو بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ (ص: ۳۷، ۳۸)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَّأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (سبأ: ۱۲) اور ہوا کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا، اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ اور شام کی منزل ایک مہینہ ہے اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنوں میں سے کتنے ہی لوگ ہیں جو اس کے سامنے کام کرتے ہیں اس کے رب کے حکم سے اور ان میں سے جو ہمارے حکم سے منہ پھیرے تو ہم اسے آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الرحمٰن ۳۳) اے گروہ جنات اور انسان! اگر تم سے ہو سکے تو نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے کناروں سے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظاً مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ (الصّٰفّٰت: ۷) بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی خوبصورتی کے ساتھ مزین کیا اور حفاظت سرکش شیطان سے۔ ان آیات سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ جنات اور شیاطین کا وجود ہے، اس لیے جو جنات اور شیاطین کا انکار کرتا ہے وہ ان نصوص قرآنیہ کا انکار کرتا ہے۔

جنات اور حدیث

ابو سائب رضی اللہ عنہ نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بار حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو ملنے کے لیے گیا، فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّي، فَجَلَسْتُ أَنْتَظِرُهُ حَتَّى يَقْضِيَ صَلَاتَهُ، قَالَ: فَسَمِعْتُ تَحْرِيكًا تَحْتَ سَرِيرِهِ فِي بَيْتِهِ، فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ، فَقُمْتُ لِأَقْتُلَهَا، فَأَشَارَ أَبُو سَعِيدٍ أَنِ اجْلِسْ، فَلَمَّا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهِ أَشَارَ إِلَى بَيْتٍ فِي الدَّارِ فَقَالَ: تَرَى هَذَا الْبَيْتَ؟ فَقُلْتُ نَعَمْ، فَقَالَ: إِنَّهُ كَانَ فِيهِ فَتًى حَدِيثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ، وَسَاقَ الْحَدِيثَ إِلَى أَنْ قَالَ: فَرَأَى امْرَأَتَهُ وَاقِفَةً بَيْنَ النَّاسِ، فَأَدْرَكَتْهُ غَيْرَةٌ فَأَهْوَى إِلَيْهَا بِالرُّمْحِ لِيَطْعَنَهَا بِسَبَبِ الْغَيْرَةِ فَقَالَتْ: لَا تَعْجَلْ حَتَّى تَدْخُلَ وَتَنْظُرَ مَا فِي بَيْتِكَ، فَدَخَلَ فَإِذَا هُوَ بِحَيَّةٍ مُطَوِّقَةٍ عَلَى فِرَاشِهِ فَرَكَزَ فِيهَا رُمْحَهُ فَاضْطَرَبَتِ الْحَيَّةُ فِي رَأْسِ الرُّمْحِ وَخَرَّ الْفَتَى مَيِّتًا، فَمَا نَدْرِي أَيُّهُمَا كَانَ أَسْرَعَ مَوْتًا: الْفَتَى أَمِ الْحَيَّةُ، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّ بِالْمَدِينَةِ جِنًّا قَدْ أَسْلَمُوا، فَمَنْ بَدَا لَكُمْ مِنْهُمْ فَآذِنُوهُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ بَدَا لَكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاقْتُلُوهُ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ (کبیر ۱: ۸۳)

میں نے دیکھا کہ وہ نماز ادا کر رہے تھے میں ان کی نماز مکمل کرنے کی انتظار میں بیٹھ گیا، اتنے میں میں

نے ان کے گھر میں موجود چارپائی کے نیچے کسی چیز کو حرکت کرتے ہوئے سنا، پس کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سانپ ہے، میں اسے مارنے کے لیے اٹھا، حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے حویلی میں موجود ایک گھر کی طرف اشارہ کیا، پھر انہوں نے پوچھا کیا تو نے گھر دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں، انہوں نے فرمایا کہ اس گھر میں ایک نوشادی شدہ نوجوان تھا، اس نے اپنی بیوی کو لوگوں کے سامنے کھڑے دیکھا، تو اسے غیرت آئی اور اس نے اسے مارنے کے لیے نیزہ سیدھا کیا، اس عورت نے کہا کہ تو گھر میں داخل ہو کر معاملہ دیکھنے سے پہلے جلد بازی سے کام نہ لے، وہ گھر میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک سانپ اس کے بستر کو لپٹا ہوا ہے، اس نے وہ نیزہ اس میں پیوست کر دیا، نیزے کے سرے پر اس سانپ نے حرکت کی تو وہ نوجوان اس حال میں گرا کہ وہ مرا ہوا تھا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ دونوں میں سے کون پہلے فوت ہوا، سانپ یا نوجوان، میں نے یہ قصہ آپ ﷺ کو جا کر سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا: مدینہ میں کچھ جنات ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں، ان میں سے اگر کسی کا تم سے سابقہ پڑے تو اسے تین دن کی اجازت دو، اگر تین دن کے بعد بھی اس کا تم سے سابقہ پڑے تو اسے مار ڈالو، کیونکہ وہ شیطان ہے۔

شب معراج میں جن کا تعاقب کرنا: حضرت یحی بن سعید رضی اللہ عنہ نے شب معراج میں نبی کریم ﷺ کا ایک عفریت کو دیکھنے کا واقعہ بیان کیا، علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں یہ واقعہ نقل فرمایا ہے، بن سعید اس واقعہ کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

رَأَى عِفْرِيتًا مِنَ الْجِنِّ يَطْلُبُهُ بِشُعْلَةٍ مِنْ نَارٍ كُلَّمَا الْتَفَتَ رَآهُ فَقَالَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ إِذَا قُلْتَهُنَّ طَفِئَتْ شُعْلَتُهُ وَخَرَّ لِفِيهِ، قُلْ: أَعُوذُ بِوَجْهِ اللهِ الْكَرِيمِ، وَبِكَلِمَاتِهِ التَّآمَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ، مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيهَا، وَمِنْ شَرِّ مَا نَزَلَ إِلَى الْأَرْضِ، وَشَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَمِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۴)

جنوں میں سے ایک عفریت کو دیکھا، جو آپ ﷺ کو شعلۂ آگ کے ساتھ تلاش کر رہا تھا، جب بھی وہ متوجہ ہوتا آپ ﷺ اسے دیکھتے تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: کیا میں آپ ﷺ کو چند کلمات نہ سکھادوں جب آپ ﷺ انہیں پڑھیں تو اس کا شعلہ بجھ جائے اور وہ منہ کے بل گر پڑے، فرمایئے، میں اللہ کریم کے چہرے اور اس کے تام کلمات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں وہ کلمات کہ ان سے کوئی نیکوکار، کوئی گناہ گار آگے نہیں جاسکتا، میں ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو آسمان سے اترتی ہیں اور جو آسمان کی طرف چڑھتی ہیں اور ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو زمین کی طرف اترتی ہیں اور جو زمین سے نکلتی ہیں اور دن اور رات کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں اور دن اور رات کو آنے والے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، مگر وہ آنے والا کہ جو خیر کے ساتھ آئے، اے رحمن!

حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے موطّا میں نقل کیا ہے کہ حضرت کعب اخبار رحمہ اللہ یہ کہا کرتے تھے

أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ، وَبِأَسْمَائِهِ كُلِّهَا مَا قَدْ عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ

میں پناہ چاہتا ہوں اللہ عظیم کے چہرے کے ساتھ، وہ ذات کہ اس سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے اور اس کے تام کلمات کے ساتھ وہ کلمات کہ ان سے کوئی نیکوکار اور کوئی گناہگار سبقت نہیں کر سکتا اور اس کے تمام ناموں کے ساتھ جنہیں میں جانتا ہوں یا جنہیں میں نہیں جانتا، ان چیزوں کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہیں۔ (تفسیر کبیر)

شیاطین کے حملوں سے پناہ: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں خواب میں ڈر جاتا ہوں، اس پر آپ ﷺ نے انہیں یہ کلمات پڑھنے کا ارشاد فرمایا أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ، وَأَنْ يَحْضُرُوْنِ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۴) میں اللہ تعالیٰ کے تام کلمات کے ساتھ اس کے غضب سے، اس کے عذاب سے، اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے حملوں سے پناہ چاہتا ہوں اور اس سے کہ وہ میرے

پاس حاضر ہوں۔ یہ واقعہ بہت مشہور و معروف ہے، بلکہ حد تواتر تک پہنچا ہوا ہے کہ آپ ﷺ لیلۃ الجن کو باہر نکلے، آپ ﷺ نے جنات کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی اور آپ ﷺ نے جنات کو اسلام کی طرف دعوت بھی دی تھی

شیطان کا سر ابن آدم کے دل پر: قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایہ میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ أَنَّ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ دَعَا رَبَّهُ أَنْ يُرِيَهُ مَوْضِعَ الشَّيْطَانِ مِنْ بَنِي آدَمَ، فَأَرَاهُ ذٰلِكَ فَإِذَا رَأْسُهُ مِثْلُ رَأْسِ الْحَيَّةِ وَاضِعٌ رَأْسَهُ عَلَى قَلْبِهِ، فَإِذَا ذَكَرَ اللهَ تَعَالَى خَنَسَ، وَإِذَا لَمْ يَذْكُرْهُ وَضَعَ رَأْسَهُ عَلَى حَبَّةِ قَلْبِهِ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۸۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ انہیں ابن آدم کے ہاں شیطان کی جگہ دکھائیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ جگہ دکھائی کہ شیطان سانپ کے سر کی طرح اپنے سر کو اس کے دل پر رکھے ہوئے ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان چھپ جاتا ہے اور جب وہ ذکر نہیں کرتا تو وہ اپنے سر کو اس کے دل کے دانے پر رکھ دیتا ہے۔

شیطان کی ناک ابن آدم کے دل پر: انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ الشَّيْطَانَ وَاضِعٌ خَطْمَهُ عَلَى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ فَإِنْ ذَكَرَ اللهَ خَنَسَ وَإِنْ نَسِيَ اللهَ الْتَقَمَ قَلْبَهُ (مکائد الشیطان لابن ابی الدنیا ص ۴۳) بے شک شیطان اپنی ناک کے اگلے حصے کو ابن آدم کے دل پر رکھتا ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ چھپ جاتا ہے اور اگر وہ اللہ کا ذکر بھول جاتا ہے تو وہ اس کے دل کو نگل جاتا ہے۔

شیطان کا خون کی طرح دوڑنا: آپ ﷺ کا ارشاد ہے إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَجْرِي مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ وَقَالَ: مَا مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا وَلَهُ شَيْطَانٌ قِيلَ: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنَّ اللهَ تَعَالَى أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ. بے شک شیطان ابن آدم میں خون کی طرح دوڑتا ہے اور فرمایا: تم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا شیطان نہ ہو، آپ ﷺ سے کہا گیا: کیا آپ ﷺ کا بھی شیطان ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میرا بھی شیطان ہے، صرف اتنی بات ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے اس پر میری اعانت کی ہے تو وہ میرا تابعدار ہو گیا ہے۔(کبیر ۱:۸۴)

ان ارشادات اور واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ جنات اور شیاطین کا وجود ہے اور وہ کسی نہ کسی شکل میں اپنے کام میں مصروف ہیں، وہ لوگوں کو پریشان کرتے ہیں، گمراہ کرتے ہیں، راہ راست سے انہیں دور کرتے ہیں، وہ ان کو بداعمالیوں کی طرف راغب کرتے ہیں، وہ ان میں وسوسے ڈالتے ہیں، غرضیکہ وہ ہر ایسا کام ان سے کروانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

جنات کس چیز سے پیدا کیے گئے؟ قرآن اور حدیث کے نصوص سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح معلوم ہوتی ہے کہ جنات ایسی مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آگ سے پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَالْجَآنَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ (الحجر: ۲۷) اور جنات کو ہم نے اس سے پہلے پیدا کیا لو کی آگ سے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی بات نقل کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ شیطان نے بارگاہ خداوندی میں جو سجدہ نہیں کیا تو اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور آدم مٹی سے۔

شیطان کی متکبرانہ بات قرآن کریم نے یوں نقل کی خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (الأعراف: ۱۲) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے ان آیات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ آگ کے اندر زندگی کا حصول کوئی بعید نہیں ہے، کیا آپ اطباء کے اس فرمان سے آگاہ ہیں جس میں انہوں نے کہا کہ نفس کے ساتھ جو چیز پہلے درجے میں متعلق ہے وہ دل اور روح ہے، اور یہ دونوں چیزیں بہت ہی گرم جگہ پر ہوتی ہیں، جالینوس نے کہا کہ میں نے بندر کو ایک مرتبہ پھاڑا تو اس کے پیٹ میں میں نے ہاتھ ڈالا اور میں نے اپنی انگلی اس کے دل میں داخل کی تو میں نے اس کو بہت گرم محسوس کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ ،اطباء کہتے ہیں زندگی سخت حرارت کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی، بعض کا گمان یہ ہے کہ کُرّہ نار تو روحانیات سے بھرا ہوا ہے۔

جنات کو جنات کیوں کہا جاتا ہے؟ عربی زبان میں جن کا معنیٰ ہے پوشیدہ، اس لیے کہ یہ آنکھوں

سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی لیے باغ کو بھی عربی میں جنت کہا جاتا ہے کہ اس کی زمین درختوں کی وجہ سے پوشیدہ اور چھپی ہوتی ہے، اسی طرح عربی زبان میں ڈھال کو جُنّہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو چھپاتی ہے، مجنون کو بھی مجنون اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے، اسی طرح عربی زبان میں ماں کے پیٹ میں موجود بچے کو جنین کہا جاتا ہے کہ وہ پیٹ میں پوشیدہ ہوتا ہے، اسی سے جُنّہ کا لفظ ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا ارشاد ہے اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے۔ یہاں ڈھال سے مراد بچاؤ اور پردہ ہے (سورۃ المجادلہ، سورۃ المنافقون ۲)

مکلفین کے چند طبقات: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ مکلفین کے چار طبقات ہیں ،فرشتے، انسان، جنات اور شیاطین۔ جنات اور شیاطین کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ شیاطین ایک جنس ہے اور جنات دوسری جنس ہے، جیسا کہ انسان ایک جنس ہے اور گھوڑا دوسری جنس ہے، بعض کہتے ہیں کہ جنات میں کچھ لوگ اچھے ہیں اور کچھ برے ہیں اور ان میں شیاطین ان جنات کو کہا جاتا ہے جو شریر ہیں۔

جنات کا انسانوں پر تسلط: جنات کو انسان کے اندر داخل ہونے کی قدرت حاصل ہے، مگر معتزلہ نے اس بات کا انکار کیا ہے۔ جو لوگ اثبات کا موقف رکھتے ہیں وہ کئی وجوہ سے دلائل رکھتے ہیں، پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر جنات نام کی مخلوق موجود ہے کوئی جسم اور جسمانی مخلوق نہیں ہے تو اس وقت اس کا معنی ہو گا کہ وہ انسانی باطن میں نفوذ پر قدرت رکھتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جنات کو انسان کے باطن میں نفوذ پر قدرت حاصل ہے، مگر معتزلہ انکار کرتے ہیں اور یہ بات بعید بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ (الْبَقَرَةِ: ۲۷۵) وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر ایسے جیسے وہ شخص جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَجْرِيْ مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ بے شک شیطان البتہ ابن آدم میں خون

کی طرح چلتا ہے۔

جنات اور شیاطین میں ایک فرق: اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ فرشتے کھاتے ہیں اور نہ ہی پیتے ہیں اور نہ ہی شادی بیاہ کرتے ہیں بلکہ وہ دن اور رات لگاتار تسبیح میں مصروف رہتے ہیں، جب کہ جنات وشیاطین کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں، آپ ﷺ نے گوبر اور ہڈی کو جنات کی خوراک بتایا ہے، آپ ﷺ نے گوبر اور ہڈی کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: إِنَّهُ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ بے شک وہ تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہے۔ اسی طرح جنات کی اولاد ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں شیطان کی اولاد کے بارے میں ارشاد فرمایا: أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي (الکھف: ۵۰) کیا تم میرے سوا اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو؟

شیطانی وساوس: شیطان کس طرح انسان میں وسوسے ڈالتا ہے، اس کا ذکر احادیث رسول ﷺ میں موجود ہے، جب کہ قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ شیطان انسانی دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو ورغلایا اور ان کی اولاد کو راہ راست سے ہٹانا اس کا مقصد زندگی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان وسوسوں کی کیفیت اس طرح ذکر کی ہے کہ شیطان انسان کے باطن میں گھس جاتا ہے، پھر وہ اپنا سر اس کے دل کے دانے پر رکھ دیتا ہے اور اس کی طرف وسوسے ڈالتا ہے، اس پر دلیل یہ حدیث پاک ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَجْرِي مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ، أَلَا فَضَيِّقُوا مَجَارِيَهُ بِالْجُوعِ بے شک شیطان البتہ اولاد آدم میں خون کی طرح چلتا ہے، خبردار! اس کی گزرگاہوں کو بھوک کے ساتھ روکو۔

جنات کی غیب دانی: کیا جنات غیب جانتے ہیں؟ اس سلسلے میں دو آراء پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ جنات غیب نہیں جانتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر فرمایا کہ جنات حضرت سلیمان کی قید میں رہے اور ان کی موت کے بعد بھی ایک مدت تک وہ اسی قید میں رہے، مگر انہیں علم نہیں ہو

سکا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں، یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جنات کو غیب کا علم حاصل نہیں ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ جنات غیب جانتے ہیں، پھر جو لوگ جنات کے غیب دان ہونے کے قائل ہیں ان میں اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ آسمان کی طرف جاتے ہیں یا ان کے قریب جاتے ہیں اور وہاں سے فرشتوں کی زبانی بعض غیب کی باتوں کی خبر پالیتے ہیں اور ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ ان کے پاس غیب دانی کے بعض دوسرے ذرائع ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی بلاواسطہ غیب کی باتوں کا علم نہیں رکھتا، قرآن کریم میں بے شمار دلائل اس پر موجود ہیں۔ حضرات انبیاء کی تعلیمات اور واقعات بھی اس چیز کی نفی کرتے ہیں کہ مخلوق میں سے کوئی غیب کا علم رکھے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس قسم کے مباحث کے دروازے کھولنے سے سوائے ظن اور گمان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لیے کہ ان چیزوں کی حقیقتوں سے صرف ایک اللہ ہی آگاہ ہے۔

استعاذہ کے اسباب وانواع: انسانی ضروریات بہت زیادہ ہیں، خیر کے کاموں میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے حصول کا انسان محتاج نہ ہو، اسی طرح شر کے کاموں میں سے کوئی ایسا کام نہیں جس کو دور کرنے کی انسان کو ضرورت نہ ہو، اس لیے اعوذ باللہ روحانی اور جسمانی تمام شرور کو دور کرنے کو شامل ہے، اب یہ شرور یا تو عقائد کے باب سے تعلق رکھتے ہیں، جو دل میں جگہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں یا یہ شرور اعمال کے باب سے تعلق رکھتے ہیں جو انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں، عقائد کے باب سے متعلق چیزوں میں تمام باطل عقائد شامل ہیں، اس لیے اعوذ باللہ ان تمام کو شامل ہے۔

عقائد کے باب سے متعلق جو چیزیں ہیں ان میں درست عقائد کا احتمال بھی ممکن ہے اور برے عقائد کا احتمال بھی ممکن ہے، اس قسم میں دنیا کے گمراہ فرقے شامل ہیں، جن کی تعداد بہتّر بتائی گئی ہے، بلکہ اکثر اس امت سے خارج ہیں، اس لیے اعوذ باللہ کے ذریعے استعاذہ ان تمام کو شامل ہے۔

اوران میں سے جن چیزوں کا تعلق بدنی اعمال کے ساتھ ہے وہ دو طرح کی ہیں، ایک وہ جن کا نقصان دین کے لحاظ سے ہے اور ایک وہ ہیں جن کا تعلق دنیا کے لحاظ سے ہے، ان میں سے جن چیزوں کا نقصان دینی اعتبار سے ہے اعوذ باللہ کے ذریعے استعاذہ ان تمام کو شامل ہے اور جن چیزوں کا نقصان دنیوی ہے، ان میں تمام بیماریاں دکھ، مصیبتیں، تکالیف، جلنا، ڈوبنا، فقر وفاقہ، ان میں سے استعاذہ ہر ایک کو شامل ہے۔

جس طرح معلومات متناہیہ سے استعاذہ ضروری ہے اسی طرح جہالات متناہیہ سے بھی استعاذہ ضروری ہے، اس میں تمام کفری مذاہب شامل ہیں، تمام اہل بدعت شامل ہیں، اسی طرح فسق وفجور کی تمام اقسام اس میں شامل ہیں، ان سب سے استعاذہ ضروری ہے، اسی طرح مکروہات، آفات، خوف کی تمام اقسام سے استعاذہ ضروری ہے۔

طب کی کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی جسم میں کس کس طرح کی بیماریاں پائی جاتی ہیں، جب بیماریوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے جسم میں موجود ہے تو پھر ہر عقل مند کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے پناہ مانگے اور استعاذہ کرے، یہ تمام اقسام خواہ انسان کی معلومات متناہیہ ہوں یا غیر متناہیہ، اسی طرح اس کی جہالات متناہیہ ہوں یا غیر متناہیہ، ان کا تعلق مضرت دینیہ سے ہو یا دنیویہ سے ہو ان سب سے اللہ کی پناہ مانگے۔ کیونکہ ایک وہی ذات قادر وقدیر ہے، وہی ملجا اور ماویٰ ہے، اسی کی توفیق خاص سے انسان خیر کو حاصل کر سکتا ہے، اسی کی توفیق خاص سے انسان برائیوں کے جال سے نکل سکتا ہے، اسی کے فضل واحسان سے انسان کفریات، شرکیات، بدعات اور خرافات سے بچ سکتا ہے، اسی کے کرم سے انسان گمراہ فرقوں اور گمراہ لوگوں کی چالوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، اسی کی توفیق سے انسان شیطانی وساوس اور دسیسہ کاریوں سے بچ سکتا ہے۔

تعوذ اور استعاذہ میں پائے جانے والے نکات

پہلا نکتہ: تعوّذ میں مخلوق سے خالق کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ممکن سے واجب کی طرف رجوع

کیاجاتا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو اول الامر میں متعین کیاجاتاہے، کیونکہ اول الامر میں اس کی معرفت کاراستہ سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس بات کو دلیل بنانے کے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، اعوذ میں حاجت تامہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اگر انسان کی حاجت نہ ہو تو پھر استعاذہ کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے اور باللہ میں اللہ کے غنائے تام کی طرف اشارہ ہے، جب بندہ اعوذ کہتاہے تو یہ اس بات کا اقرار ہوتاہے کہ وہ فقیر اور حاجت مند ہے اور باللہ میں دو باتوں کا اقرار ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام خیر کے کاموں کے حاصل کرنے اور تمام آفات کو دور کرنے پر قادر ہے، دوسری یہ ہے کہ اس کا غیر ان باتوں سے موصوف نہیں ہے، اس لیے اس کے سوا حاجت کو کوئی پورا نہیں کر سکتا اور اس کے علاوہ خیر کوئی دے نہیں سکتا۔

جب انسان اس حالت زار کا مشاہدہ کرتا ہے تو پھر اپنی ذات سے اور تمام چیزوں سے صرف اللہ کی ذات کی طرف بھاگتاہے، پھر وہ اس بھاگنے کا مشاہدہ کرتا ہے، اس بھاگنے کا راز اسے اس فرمانِ الٰہی میں دکھائی دیتاہے، جس میں ارشاد فرمایا: فَفِرُّوْٓا إِلَى اللّٰهِ (الذّٰرِيٰتِ: ۵۰) پس اللہ کی طرف بھاگو۔

اور یہ حالت اسے اعوذ باللہ کہنے کے وقت ہی حاصل ہوتی ہے، پھر جب انسان غَیبَت حق میں پہنچ جاتاہے اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے نور میں غرق ہو جاتاہے تو پھر اسے اس فرمان کا مشاہدہ ہوتاہے ، جیسے ارشاد ہے قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ (الأنعام: ۹۱) فرمادیجیے : اللہ ہی نے اتاری ہے پھر انہیں چھوڑ دیجیے ان کو ان کی خرافات میں، اس وقت وہ یوں کہے کہ اعوذ باللہ۔

دوسرا نکتہ: اعوذ باللہ میں نفس انسانی کی عاجزی اور انکساری کا اور رب العالمین کی قدرت کاملہ کا کھلے طور پر اعتراف ہے اور یہ اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری اور قرب عجز و انکساری کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسی طرف نبی کریم ﷺ کا اشارہ ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ جس نے اپنے کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی کمزوری، اپنی کوتاہی کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا کہ وہ ہر چیز پر قادر و قدیر ہے، جس نے اپنے جہل اور لاعلمی کو پہچانا اس نے اللہ تعالیٰ کے فضل و عدل کو پہچانا، جس نے اپنی حالت زار کو پہچانا، اس

نے اپنے رب کے کمال اور جلال کو پہچانا۔

تیسرا نکتہ: نیکیوں کی سمت بڑھنا شیطان سے فرار کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اسی کو استعاذہ کہا جاتا ہے، ہاں مگر یہ استعاذہ اطاعت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، پس اگر نیکیوں کی سمت بڑھنا یہ استعاذہ کو مقدم کرنے کو واجب کرتا ہے تو اس طرح یہ استعاذہ ایک اور استعاذہ کو مقدم کرنے کا محتاج ہو گا، یوں تسلسل لازم آئے گا اور اگر نیکی کی سمت اقدام استعاذہ کو مقدم کرنے کا محتاج نہیں ہے تو پھر استعاذہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نیکی کا کوئی کام بھی استعاذہ کو مقدم کرنے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، یوں تو پھر ایسی چیز کا لانا ضروری ٹھہرا جس کی کوئی نہایت اور انتہاء نہیں ہے، حالانکہ یہ چیز انسانی بساط میں نہیں ہے، ہاں جب تو نے اس حالت کو پہچان لیا تو نے اپنی عاجزی اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا، تو پھر میں اطاعت اور نیکی پر تمہاری دستگیری کروں گا اور اس نیکی میں لگنا اور مگن ہونا سکھاؤں گا، اس لیے تو أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھیں۔

چوتھا نکتہ: استعاذہ کا راز یہ ہے کہ اس میں قادر مطلق ذات کی طرف التجاء کی جاتی ہے جو آفات کو دور کرتی ہے، پھر شیطان اہم کاموں میں سے تلاوت قرآن کے دوران وسوسے ڈالتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور اپنے رب رحمن کی عبادت کی نیت کی اس کے وعدے اور وعید پر غور و فکر، اس کی آیات اور براہین پر توجہ دی تو نیکیوں میں اس کا شوق بڑھے گا، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچے گا، اس لیے تلاوت قرآن تمام اطاعت میں بڑا درجہ رکھتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ انسان کو اس سے روکے، تو ایسے موقع پر انسان کو شدت سے ضرورت ہے ایسی چیز کی جو اسے شیطان کے شر سے بچائے، اسی حکمت کے تحت تلاوت قرآن کے لیے استعاذہ کو تلاوت قرآن کے لیے خاص کیا گیا۔

پانچواں نکتہ: شیطان انسان کا دشمن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا (فَاطِرٍ: ٦) بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی سمجھو۔ اور رحمٰن انسان کا دوست ہے، اسے پیدا کرنے والا ہے، اس کے اہم امور کی اصلاح کرنے والا ہے، پھر انسان

اطاعت اور عبادت کے آغاز میں دشمن سے خوف زدہ ہوتا ہے، پھر وہ اپنے مالک کی رضاجوئی کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اسے دشمن کی اس زحمت سے چھٹکارہ دے، مگر کچھ عوارض کے باعث وہ اپنے دشمن کو بھول جاتا ہے اورانجانے میں یا جان بوجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اس لیے اس صورت میں دشمن سے راہ فرار اختیار کرنا اول ترجیح ہے، اس لیے اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد اپنے اللہ کے لیے ثابت قدمی اختیار کرنا ہے، جس کے لیے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

چھٹا نکتہ: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ (الْوَاقِعَۃِ: ۷۹) قرآن کریم کو پاک لوگ ہی چھوسکتے ہیں۔ جب انسانی دل غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اورانسانی زبان پر غیر اللہ کا ذکر جاری ہو جاتا ہے تو اس میں آلودگی آجاتی ہے، اس لیے پانی کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے، جب انسان اعوذ باللہ کہتا ہے تو اسے پاکی حاصل ہو جاتی ہے، اس وقت وہ حقیقت میں نماز کی تیاری کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، پھر اس کے بعد کہتا ہے بسم اللہ

ساتواں نکتہ: انسان کے دو دشمن ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی، انسان کو ظاہری اور باطنی دونوں دشمنوں کے ساتھ لڑائی کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہری دشمن کے ساتھ لڑائی کا یوں حکم دیا ہے قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (التَّوْبَۃِ: ۲۹) ان لوگوں کے ساتھ لڑائی کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

اور باطنی دشمن کے بارے میں ارشاد فرمایا: اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا (فَاطِرٍ: ۶) بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن سمجھو۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ جب تو ظاہری دشمن کے ساتھ لڑائی کرے تو فرشتے تیری نصرت کو اتریں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں واضح ارشاد ہے یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَآئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَ (آلِ عِمْرَانَ: ۱۲۵) تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا، جو نشان لگے ہوں گے اور جب تو

باطنی دشمن کے ساتھ لڑائی کرے تو فرشتے تیری نصرت کو آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر: ۴۲) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہری دشمن کی نسبت باطنی دشمن سے لڑائی زیادہ بہتر ہے، کیونکہ ظاہری دشمن اگر موقع پائے گا تو دنیا کے مال اور اسباب میں ہاتھ ڈالے گا اور باطنی دشمن اگر موقع پائے گا تو وہ دین اور یقین کو برباد کرے گا، اسی طرح ظاہری دشمن اگر ہمارے اوپر غالب آگیا تو ہمیں اجر ملے گا اور اگر باطنی دشمن ہمارے اوپر غالب آگیا تو ہم فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اسی طرح جس شخص کو ظاہری دشمن نے قتل کر ڈالا وہ شہید ہو جائے گا اور جسے باطنی دشمن نے قتل کر ڈالا وہ راندۂ درگاہ ہو جائے گا، اس لیے باطنی دشمن سے بچنا یہ زیادہ بہتر ہے اور باطنی دشمن سے بچاؤ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آدمی اپنی دل اور زبان سے أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ نہ کہے۔

آٹھواں نکتہ: ایمان والے بندے کا دل بہترین جگہوں میں ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں أَنَّ قَلْبَ الْمُؤْمِنِ أَشْرَفُ الْبِقَاعِ، فَلَا تَجِدُ دِيَارًا طَيِّبَةً وَلَا بَسَاتِيْنَ عَامِرَةً وَلَا رِيَاضًا نَاضِرَةً إِلَّا وَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ أَشْرَفُ مِنْهَا، مومن کا دل بہترین جگہوں میں ہے، تو کسی پاکیزہ دیس، کسی بھرے پُرے باغ، کسی سر سبز و شاداب گلشن کو مومن کے دل سے بہتر نہیں پائے گا، بلکہ امام رازی رحمہ اللہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ مومن کا دل تو صاف و شفاف آئینہ کی طرح ہے بلکہ شیشہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں بَلْ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ كَالْمِرْآةِ فِي الصَّفَاءِ، بَلْ فَوْقَ الْمِرْآةِ، لِأَنَّ الْمِرْآةَ إِنْ عَرَضَ عَلَيْهَا حِجَابٌ لَمْ يُرَ فِيهَا شَيْءٌ وَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ لَا يَحْجُبُهُ السَّمٰوَاتِ السَّبْعُ وَالْكُرْسِيُّ وَالْعَرْشُ مومن کا دل صاف شیشہ کی طرح ہے، بلکہ شیشہ سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ شیشے پر اگر پردہ ڈال دیا جائے تو اس میں کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی اور مومن کا دل ایسا ہے کہ اسے سات آسمان، کُرسی اور عرش چھپا نہیں سکتے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فَاطِرٍ: ۱۰) اس کی طرف چڑھتا ہے کلام ستھرا اور نیک عمل اس کو اٹھالیتا ہے۔ بلکہ دل ان تمام پردوں کے ساتھ جلال ربوبیت کا مطالعہ کرتا ہے اور صفات صمدیت کے علم کا احاطہ کرتا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے جن وجوہ کی بنیاد پر دلِ مومن کو بہترین جگہوں میں سے قرار دیا ہے، ان کا بھی انہوں نے یوں ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ دل مومن کو اشرف البقاع قرار دینے کی چند وجوہات ہیں، ان میں ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دیا ہے۔

جیسا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ، قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں ایک نیک، صالح بندے کی میت کو رکھا جاتا ہے، اس لیے جب دل اللہ تعالیٰ کی معرفت کا تخت اور اس کی الوہیت کا عرش ہے تو ضروری ہوا کہ دل مومن سب جگہوں سے بہترین جگہ ہو۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں

يَا عَبْدِي قَلْبُكَ بُسْتَانِي وَجَنَّتِي بُسْتَانُكَ فَلَمَّا لَمْ تَبْخَلْ عَلَيَّ بِبُسْتَانِكَ بَلْ أَنْزَلْتَ مَعْرِفَتِي فِيهِ فَكَيْفَ أَبْخَلُ بِبُسْتَانِي عَلَيْكَ وَ كَيْفَ أَمْنَعُكَ مِنْهُ؟ اے میرے بندے! تیرا دل میرا باغ ہے اور میری جنت تیرا چمن ہے، جب تو نے مجھ پر اپنے چمن سے بخل نہیں کیا بلکہ تو نے اس میں میری معرفت اتاری ہے تو میں کیسے اپنے باغ سے تجھ پر بخل کروں گا اور میں کیسے تجھے اس سے روکوں گا؟ (تفسیر کبیر رازی ج ۱)

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے جنت کے باغ میں داخل ہونے کی کیفیت نقل فرمائی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ (الْقَمَرِ: ۵۵) بیٹھے سچی بیٹھنے کی جگہ میں بادشاہ کے پاس، جس کا سب پر قبضہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف ملیک کا لفظ استعمال نہیں کیا، گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں اس

دن ایسا بادشاہ ہوں گا جس کا سب پر قبضہ ہو گا، میرے بندے بادشاہ ہوں گے مگر میری قدرت کے تحت ہوں گے ، امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب تونے یہ مقدمہ معلوم کرلیاتو پھر ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ گویا کہ یوں فرمانا چاہتے ہیں

يَا عَبْدِي، إِنِّي جَعَلْتُ جَنَّتِي لَكَ، وَأَنْتَ جَعَلْتَ جَنَّتَكَ لِي، لٰكِنَّكَ مَا أَنْصَفْتَنِي، فَهَلْ رَأَيْتَ جَنَّتِي الْآنَ وَهَلْ دَخَلْتَهَا؟ فَيَقُولُ الْعَبْدُ: لَا يَا رَبِّ، فَيَقُولُ تَعَالَى: وَهَلْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ؟ فَلَا بُدَّ وَأَنْ يَقُولَ الْعَبْدُ: نَعَمْ يَا رَبِّ، فَيَقُولُ تَعَالَى: إِنَّكَ بَعْدَ مَا دَخَلْتَ جَنَّتِي، وَلٰكِنْ لَمَّا قَرُبَ دُخُولُكَ أَخْرَجْتُ الشَّيْطَانَ مِنْ جَنَّتِي لِأَجْلِ نُزُولِكَ، وَقُلْتُ لَهُ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْؤُمًا مَّدْحُورًا، فَأَخْرَجْتُ عَدُوَّكَ قَبْلَ نُزُولِكَ، وَأَمَّا أَنْتَ فَبَعْدَ نُزُولِي فِي بُسْتَانِكَ سَبْعِينَ سَنَةً كَيْفَ يَلِيقُ بِكَ أَنْ لَا تُخْرِجَ عَدُوِّي وَلَا تَطْرُدَهُ، فَعِنْدَ ذٰلِكَ يُجِيبُ الْعَبْدُ وَيَقُولُ: إِلٰهِي أَنْتَ قَادِرٌ عَلَى إِخْرَاجِهِ مِنْ جَنَّتِكَ وَأَمَّا أَنَا فَعَاجِزٌ ضَعِيفٌ وَلَا أَقْدِرُ عَلَى إِخْرَاجِهِ، فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: الْعَاجِزُ إِذَا دَخَلَ فِي حِمَايَةِ الْمَلِكِ الْقَاهِرِ صَارَ قَوِيًّا فَادْخُلْ فِي حِمَايَتِي حَتّٰى تَقْدِرَ عَلَى إِخْرَاجِ الْعَدُوِّ مِنْ جَنَّةِ قَلْبِكَ، فَقُلْ: (أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ)

اے میرے بندے! میں نے اپنی جنت تیرے لیے بنائی ہے اور تونے اپنی جنت میرے لیے بنائی ہے، لیکن تُونے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیا تونے اب میری جنت دیکھی ہے اور کیا تو اس میں داخل ہوا ہے؟ بندہ کہتا ہے، اے میرے رب! نہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: اے میرے بندے کیا تو اپنی جنت میں داخل ہوا ہے؟ یقیناً بندہ کہے گا کہ ہاں! اے میرے رب! اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے، اے میرے بندے! تو اس کے بعد میری جنت میں داخل ہوا ہے، جب تو میری جنت میں داخل ہونے کے قریب تھا تو میں نے تیرے نزول سے پہلے شیطان کو اپنی جنت سے باہر نکال دیا تھا اور میں نے اسے کہا تھا کہ تو میری جنت سے ذلیل اور مردود ہو کر نکل جا، میں نے تیرے دشمن کو تیری آمد سے پہلے نکال

باہر کیا تھا اور تو ایسا ہے کہ ستر سال تیرے باغ میں میرے اترنے کے بعد بھی کیا تیرے لائق نہیں تھا کہ تو میرے دشمن کو اس سے نکالتا اور اسے دھتکارتا؟ اس پر بندہ کہتا ہے کہ اے میرے رب! تو اسے اپنی جنت سے نکالنے پر قادر تھا اور میں عاجز اور کمزور اسے نکالنے پر قادر نہیں تھا۔

اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عاجز اور ضعیف جب زبردست بادشاہ کی پناہ میں آجاتا ہے تو وہ بھی مضبوط ہو جاتا ہے، پس تو میری پناہ میں آجا تاکہ تو اپنے دل کی جنت سے اپنے دشمن کو باہر نکال سکے، پس تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم کہہ (کبیر ج ۱)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دل مومن اللہ تعالیٰ کا باغ ہے تو اس میں سے شیطان کیوں نہیں نکلتا؟

اس کا جواب امام رازی رحمہ اللہ یوں دیتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ بندے کو یہ فرماتے ہیں کہ تو وہ شخص ہے جس نے معرفت کے بادشاہ کو اپنے دل کے حُجرے میں اتارا اور جو شخص بادشاہ کو اپنے دل کے حجرے میں اتارنے کا ارادہ کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حجرے کو جھاڑو دے اور اسے صاف کرے، بادشاہ کے لیے یہ کام ضروری نہیں ہیں، اس لیے تو اپنے دل کے حجرے کو وسوسوں کی آلودگی سے پاک کر اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ۔

نواں نکتہ: گویا اللہ تعالیٰ یوں فرمانا چاہتے ہیں کہ اے میرے بندے! تو نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیا تو جانتا ہے کہ میرے اور شیطان کے درمیان کس چیز نے تکدر ڈالا، وہ تو میری فرشتوں کی طرح عبادت کیا کرتا تھا اور میری الوہیت کا اقرار کرتا تھا، میرے اور اس کے درمیان جس چیز نے تکدر ڈالا وہ یہ تھی کہ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ تمہارے باپ آدم کو سجدہ کرے مگر اس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا، جب اس نے تکبر کیا تو میں نے اس کی خدمت لینے سے انکار کر دیا، حقیقت میں اس نے تیرے باپ کی دشمنی نہیں کی، اس نے میری خدمت سے انکار کیا پھر وہ ستر سال سے تیری دشمنی کر رہا ہے اور تو اس سے محبت کرتا ہے، حالانکہ وہ ہر خیر کے کام میں تیری مخالفت کرتا ہے اور تو اس کی موافقت کرتا ہے، اس لیے یہ مذموم طریقہ چھوڑ دے اور اس کی دشمنی ظاہر کر اور یوں کہہ

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

دسواں نکتہ: اے ابن آدم! اگر تو اپنے باپ آدم کے قصے کی طرف نظر کرے تو تجھے معلوم ہو کہ شیطان نے ان کے سامنے قسم کھائی تھی کہ وہ اس کا خیر خواہ ہے، پھر انجام کار اس کا یہ ہوا کہ اس نے اسے جنت سے نکلوانے کی کوشش کی اور اے ابن آدم! تیرے لیے تو اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کرے گا اور ورغلائے گا۔

جیسا کہ اس نے کہا تھا فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ،پس تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور ورغلاؤں گا، مگر ان میں سے تیرے مخلص بندوں کو نہیں ورغلا سکوں گا۔ جب ان لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ یہ تھا جن کے ساتھ اس نے خیر خواہی کی قسمیں کھائیں، تو ان لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ کیسا ہو گا جن کو گمراہ کرنے اور ورغلانے کی قسمیں کھائیں؟

گیارہواں نکتہ: اللہ تعالیٰ نے یہاں اعوذ باللہ میں اپنا نام اللہ ذکر کیا، کوئی دوسرا نام ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ معاصی پر ڈانٹنے کے لیے یہ نام باقی اسماء اور صفات سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ الٰہ تو مستحق عبادت ہوتا ہے جب تک وہ قادر، علیم اور حکیم نہ ہو تو معاصی پر ڈانٹا نہیں جا سکتا، اس لیے اعوذ باللہ کو أَعُوْذُ بِالْقَادِرِ الْعَلِيْمِ الْحَكِيْمِ، کے قائم مقام کر دیا اور یہ صفات ڈانٹ میں انتہائی درجے کی ہیں اور یہ اس لیے کہ چور بادشاہ کی قدرت جاننے کے باوجود اس کا مال چراتا ہے، حالانکہ چور کو پتا ہے کہ بادشاہ قدرت رکھتا ہے مگر اسے اس چوری کا علم نہیں ہے، اس لیے کہ صرف قدرت اکیلے ڈانٹ کے لیے ناکافی ہے، اس کے ساتھ ساتھ علم بھی ہونا ضروری ہے، اسی طرح قدرت اور علم یہ دونوں ڈانٹ وزجر کے حصول کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ بادشاہ نے جب برائی کرتے دیکھ لیا تو وہ برائی سے روکے گا نہیں، اس کی موجودگی اس کے لیے اس برائی سے مانع نہیں ہو گی، لیکن جب اسے قدرت بھی حاصل ہو گی، علم بھی ہو گا اور برائیوں سے روکنے کی حکمت بھی ہو گی تو اس طرح کامل درجے کی ڈانٹ حاصل ہو گی، اس لیے جب بندے نے کہا: اعوذ باللہ تو گویا اس نے یوں کہا أَعُوْذُ بِالْقَادِرِ الْعَلِيْمِ الْحَكِيْمِ جو برائیوں میں سے کسی چیز کو پسند نہیں کرتا، پس یقیناً کامل درجے کی ڈانٹ حاصل ہو گی۔

بارہواں نکتہ: جب بندے نے أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کہا تو یہ اس بات پر دلالت ہوئی کہ وہ شیطان کے پڑوس میں رہنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس پر راضی ہوتا ہے، کیونکہ شیطان گناہ گار ہے اور اس کا گناہ حقیقتاً اس مسلمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لیے جب بندہ گناہ گار کے پڑوس میں رہنا پسند نہیں کرتا تو پھر گناہ کے پڑوس میں رہنا بدرجہ اولیٰ پسند نہیں کرے گا۔

تیرہواں نکتہ: شیطان نام ہے اور رجیم صفت ہے، اللہ تعالیٰ نے صرف نام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صفت بھی ذکر کر دی ہے، گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتے ہیں، کہ شیطان ہزاروں سال ہماری خدمت میں رہا، مگر کیا کبھی تو نے سنا کہ اس نے ہمیں نقصان پہنچایا یا ہماری برائی کی؟ مگر اس کے باوجود ہم نے اسے راندۂ درگاہ کر دیا اور اسے دھتکار دیا، مگر یہ شیطان جب ایک لمحہ تیرے ساتھ بیٹھ جائے تو تجھے ہمیشہ کی جہنم میں ڈال دے، تو تُو کیوں اس کو دھتکارنے اور اس پر لعنت کرنے میں مشغول نہیں ہوتا، اس لیے تو کہہ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.

چودھواں نکتہ: امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں ایک سوال اٹھایا اور اس کے بعد اس کا جواب بھی دیا ہے، سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے أَعُوْذُ بِالْمَلَائِكَةِ کیونکر نہیں کہلوایا؟ حالانکہ ایک ادنیٰ درجے کا فرشتہ بھی دفع شیطان کے لیے کافی تھا، تو اس کا سبب کیا ہے کہ اس کتے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے مقابلے میں کیا؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے! وہ تجھے دیکھتا ہے اور تو اس کو نہیں دیکھتا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الْأَعْرَافِ: ۲۷) بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔ وہ اپنے مکر و فریب تمہارے اندر ڈالتا ہے کیونکہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھتے، اس لیے ایسی ذات کا سہارا پکڑو جو شیطان کو دیکھتی ہے اور شیطان اسے نہیں دیکھتا اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہے، اس لیے کہو: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.

پندرہواں نکتہ: یہاں الشیطان پر الف لام داخل کر کے جنس کو معرفہ بنایا گیا ہے کیونکہ مرئی اور غیر مرئی شیاطین بہت ہیں، بلکہ مرئی بسا اوقات زیادہ سخت ہوتے ہیں، جیسے اہل تذکیر کہتے ہیں کہ ایک

آدمی جب صدقہ دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے پاس ستر شیطان آتے ہیں، وہ اس کے ہاتھوں، اس کی ٹانگوں اور اس کے دل کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں اور اسے صدقہ کرنے سے روکتے ہیں جب لوگوں میں سے ایک نے سنا تو یہ کہا کہ میں ان ستر کے ساتھ لڑائی کروں گا، اس کے بعد وہ مسجد سے باہر نکلا اور گھر آگیا، یہاں اس نے اپنا دامن گندم کے دانوں سے بھر لیا، ان دانوں کو صدقہ کرنے کی نیت سے اس نے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کی بیوی نے جست لگائی، اس نے اپنے خاوند کے ساتھ لڑنا اور جھگڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اس نے اپنے خاوند کے دامن سے دانے نکلوا دیئے، یہ شخص خائب ہو کر مسجد کی طرف چل پڑا، وعظ گو نے اسے کہا: تو نے کیا کیا؟ اس نے کہا: میں نے ان ستر کو شکست دے دی تھی، مگر ان کی ماں آگئی جس نے مجھے شکست دے دی۔

سولھواں نکتہ: شیطان کا لفظ شَطَنَ سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہے وہ دور ہوا، اس کے دور ہونے کی وجہ سے اس پر یہ حکم لگایا گیا، اطاعت کرنے والا قریب ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا کہ تو سجدہ کر اور قریب ہو جا (العلق:۱۹) اور اللہ تعالیٰ بندے کے زیادہ قریب ہے، اسی لیے تو ارشاد فرمایا: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (الْبَقَرَةِ: ۱۸۶) اور جب آپ ﷺ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں فرما دیں کہ میں قریب ہوں۔

اور رجیم بمعنی مرجوم کے ہے، جس کا معنی ہے جس پر لعنت اور بد بختی کے تیر مارے گئے ہوں اور تجھے تو سعادت کی رسی ملی ہوئی ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى (الْفَتْحِ: ۲۶) اور قائم رکھا ان کو ادب کی بات پر۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ شیطان دور ہے اور رجم کیا ہوا ہے اور تجھے اللہ تعالیٰ نے قریب کیا ہوا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جس شیطان کو میں نے دور کیا ہے وہ قریب نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ارشاد ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِيلًا (فَاطِرٍ: ۴۳) اور ہرگز نہیں پائے گا تو اللہ کے طریقے میں کوئی تبدیلی۔ پس تو جان لے کہ جب اس نے تجھے قریب کیا ہے تو وہ تجھے دھتکارے گا نہیں اور نہ ہی وہ اپنے فضل اور اپنی رحمت سے تجھے دور کرے گا۔

ستر ہواں نکتہ: امام جعفر صادق رحمۃ اللہ نے فرمایا: کہ قرأت سے پہلے تعوذ ضروری ہے، باقی اطاعت میں تعوذ نہ پڑھی جائے، اس میں حکمت یہ ہے کہ بندے کی زبان کبھی جھوٹ، غیبت اور چغل خوری کی وجہ سے ناپاک ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ تعوّذ پڑھے تا کہ اس کی زبان پاک ہو جائے اور وہ پاک زبان کے ساتھ اس کلام پاک کو پڑھے جو رب پاک کی طرف سے اتاری گئی ہے۔

اٹھارہواں نکتہ: گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ شیطان رجیم ہے اور میں رحمن رحیم ہوں، پس تو شیطان رجیم سے دور ہو جا تا کہ رحمن رحیم سے مل سکے۔

انیسواں نکتہ: شیطان تیرا دشمن ہے اور تو اس سے غافل اور غائب ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے، وہ بھی اور اس کا قبیلہ بھی مگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے ﴿إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الْأَعْرَافِ: ٢٧) اس لیے تیرا ایک دشمن ہے جو تیرا دشمن ہے اور تجھ سے غائب ہے اور تیرا ایک دوست ہے جو غالب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا ارشاد ہے ﴿وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ (يُوسُفَ: ٢١) اور اللہ تعالیٰ اپنے کاموں پر غالب ہے۔ جب تیرے غائب دشمن نے تجھے تباہ اور برباد کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر تیرے لیے بہتر یہ ہے کہ تو اپنے غالب دوست کی طرف دوڑ جو تجھے تباہی، بربادی اور ہلاکت سے بچائے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی کہ وہ ہر برکت والا کام اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ نام سے شروع کریں، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں جو کام ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ شروع کرتے یہاں تک کہ وہ قرآن حکیم کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع کرتے تھے، اھل علم کی تحریروں اور مفسرین کرام رحمہم اللہ کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پورے قرآن میں صرف سورۃ النمل کی ایک آیت ہے، اس

پر سب کا اتفاق ہے، یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ بسم اللہ دو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے، اس لیے ہر سورت کے شروع میں لکھی جائے گی، ان کے درمیان اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ کیا بسم اللہ ہر سورۃ کے شروع میں خود مستقل ایک آیت ہے؟ یا ہر سورت کی مستقل آیت ہے؟ یا سورۃ الفاتحہ کی آیت ہے؟ اور دوسری سورتوں کی نہیں۔ علماء سلف رحمہم اللہ اور متاخرین رحمہم اللہ کا اس بارے میں اختلاف چلا آتا ہے، مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَعْرِفُ فَصْلَ السُّورَةِ حَتَّى يَنْزِلَ عَلَيْهِ {بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ} (سنن ابو داؤد) رسول اللہ ﷺ سورتوں کی جدائی نہیں جانتے تھے جب تک آپ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل نہیں ہوتی تھی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ الْبَسْمَلَةَ فِي أَوَّلِ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَاةِ وَعَدَّهَا آيَةً. (ابن خزیمہ) رسول اللہ ﷺ نے بسم اللہ کو سورۃ فاتحہ کے شروع میں نماز میں پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عطا رحمہ اللہ، حضرت طاؤس رحمہ اللہ، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، حضرت مکحول رحمہ اللہ، حضرت زہری رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے کہ أَنَّهَا آيَةٌ مِّنْ كُلِّ سُورَةٍ إِلَّا بَرَاءَةٌ: بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں ایک مستقل آیت ہے سوائے سورۃ برأت کے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۷۶)

البتہ امام مالک رحمہ اللہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں۔ کہ لَيْسَتْ آيَةٌ مِّنَ الْفَاتِحَةِ وَلَا مِنْ غَيْرِهَا مِنَ السُّوَرِ. (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۷۷) بسم اللہ نہ تو سورۃ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی اور سورت کی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ هِيَ آيَةٌ مِّنَ الْفَاتِحَةِ وَلَيْسَتْ مِنْ غَيْرِهَا.

(تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۷۷) بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی تو ایک آیت ہے لیکن کسی اور سورۃ کی نہیں۔

حضرت داؤد فرماتے ہیں کہ هِيَ آيَةٌ مُّسْتَقِلَّةٌ فِي أَوَّلِ كُلِّ سُورَةٍ لَّا مِنْهَا، (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۷۷) ہر سورت کے اول میں بسم اللہ ایک مستقل آیت ہے سورت میں داخل نہیں۔

بسم اللہ با آواز بلند یا آہستہ ؟ اب اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا اسے با آواز بلند پڑھنا چاہیے یا آہستہ آواز سے؟ جو لوگ اسے سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں کہتے وہ تو اسے بلند آواز سے پڑھنے کے بھی قائل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسے سورۃ فاتحہ سے الگ ایک آیت مانتے ہیں وہ بھی اس کے پست آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں۔

رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اول سے ہے۔ ان میں اختلاف ہے۔ شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ يَجْهَرُ بِهَا مَعَ الْفَاتِحَةِ وَالسُّورَةِ، سورۃ فاتحہ اور ہر سورت سے پہلے اسے اونچی آواز سے پڑھنا چاہیے۔ تابعین میں سے سب کے سب ان نمازوں میں جن میں قرأت اونچی آواز سے پڑھی جاتی ہے۔ بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيم بھی بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ایک دلیل تو اس کی یہ ہے کہ جب یہ آیت سورۃ فاتحہ میں سے ہے تو پھر پوری سورت کی طرح یہ بھی اونچی آواز سے ہی پڑھنی چاہیے۔

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے صَلَّى فَجَهَرَ فِي قِرَاءَتِهِ بِالْبَسْمَلَةِ، نماز پڑھائی اور قرأت میں اونچی آواز سے بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيم بھی پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد فرمایا إِنِّي لَأَشْبَهُكُمْ صَلَاةً بِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں مشابہ ہوں، اس حدیث کو دار قطنی خطیب اور بیہقی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ {سنن نسائی، حاکم}

مستدرک حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَفْتَتِحُ الصَّلَاةَ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نماز کی ابتدا میں اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

آپ ﷺ کیسے قرأت کیا کرتے تھے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آپ ﷺ کی قرأت کیسی تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا كَانَتْ قِرَاءَتُهُ مَدًّا، ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، يَمُدُّ بِسْمِ اللهِ وَيَمُدُّ الرَّحْمٰنِ، وَيَمُدُّ الرَّحِيْمِ کہ ہر کھڑے لفظ کو آپ لمبا کر کے پڑھتے تھے پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر سنائی بسم اللہ کو کھینچ کر پڑھتے اسی طرح الرحمن کو کھینچ کر پڑھتے اور اسی طرح الرحیم کو بھی کھینچ کر پڑھتے تھے (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۸)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْطَعُ قِرَاءَتَهُ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ {مسند احمد، ابو داؤد} رسول اللہ ﷺ ہر ہر آیت پر رکتے تھے اور آپ کی قرأت الگ الگ ہوتی تھی جیسے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پھر ٹھہر کر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پھر ٹھہر کر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پھر ٹھہر کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

امام شافعی رحمہ اللہ امام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ أَنَّ مُعَاوِيَةَ صَلَّى بِالْمَدِيْنَةِ، فَتَرَكَ الْبَسْمَلَةَ، فَأَنْكَرَ عَلَيْهِ مَنْ حَضَرَهُ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ ذٰلِكَ، فَلَمَّا صَلَّى الْمَرَّةَ الثَّانِيَةَ بَسْمَلَ (مستدرک حاکم)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی تو جو مہاجر اصحاب وہاں موجود تھے انہوں نے اس بات کو اچھا نہیں سمجھا، جب دوسری بار نماز پڑھائی تو اس میں آپ نے بسم اللہ پڑھی۔

بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے: دوسرا مذہب یہ ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں أَنَّهُ لَا يُجْهَرُ بِالْبَسْمَلَةِ فِي الصَّلَاةِ، وَهٰذَا هُوَ الثَّابِتُ عَنِ الْخُلَفَاءِ الْأَرْبَعَةِ خلفاء اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور عبد اللہ بن معقل رضی اللہ عنہ، تابعین اور بعد والوں کی جماعتوں سے یہی ثابت ہے، ابو حنیفہ رحمہ اللہ، ثوری رحمہ اللہ، احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ أَنَّهُ لَا يَقْرَأُ الْبَسْمَلَةَ بِالْكُلِّيَّةِ، لَا جَهْرًا وَلَا سِرًّا، سرے

سے بسم اللہ پڑھے ہی نہیں نہ تو آہستہ نہ بلند۔ ان کی دلیل ایک تو صحیح مسلم والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْتَتِحُ الصَّلَاةَ بِالتَّكْبِيرِ، وَالقِرَاءَةِ بِالحَمْدِ لِلهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ آپ ﷺ نماز کو تکبیر سے اور قرأت کو الحمد للہ رب العالمین سے ہی شروع کیا کرتے تھے۔

صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں صَلَّيْتُ خَلْفَ النَّبِي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكَانُوا يَستَفْتِحُونَ بِالحَمْدِ لِلهِ رَبِّ العَالَمِينَ، میں نے نبی ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی یہ سب الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ مسلم میں ہے کہ لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِي آخِرِهَا (بخاری، مسلم) بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے نہ تو قرأت کے شروع میں نہ اس قرأت کے آخر میں۔

سنن میں حضرت معقل رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے، یہ ہے دلیل ان ائمہ رحمہم اللہ کے بسم اللہ آہستہ پڑھنے کی، ایک بات یہ معلوم ہو گئی کہ ائمہ کرام رحمہم اللہ کے ہاں بسم اللہ آہستہ پڑھی جائے یا اونچی آواز سے دونوں صورتوں میں نماز درست ہو جاتی ہے۔

بسم اللہ کی فضیلت: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی نسبت سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا هُوَ اسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ اللهِ، وَمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اسْمِ اللهِ الْأَكْبَرِ، إِلَّا كَمَا بَيْنَ سَوَادِ الْعَيْنَيْنِ وَبَيَاضِهِمَا مِنَ الْقُرْبِ (ابن ابی حاتم ۱/ ۳۴ تفسیر ابن کثیر ۱/ ۱۱۹) یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اللہ تعالیٰ کے بڑے نام اور اس کے درمیان اس قدر قرب ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں قرب ہے۔

ابن مردویہ رحمہ اللہ یہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَسْلَمَتْهُ أُمُّهُ إِلَى الْكُتَّابِ لِيُعَلِّمَهُ، فَقَالَ الْمُعَلِّمُ: اُكْتُبْ، قَالَ مَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: بِسْمِ

اللّٰہِ قَالَ لَہُ عِیْسَی: وَمَا بِاسْمِ اللّٰہِ؟ قَالَ الْمُعَلِّمُ: مَا أَدْرِی قَالَ لَہُ عِیْسَی: الْبَاءُ بَہَاءُ اللّٰہِ وَالسِّیْنُ سَنَاؤُہُ، وَالْمِیْمُ مَمْلَکَتُہُ، وَاللّٰہُ إِلٰہُ الْآلِہَۃِ، وَالرَّحْمٰنُ رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ، وَالرَّحِیْمُ رَحِیْمُ الْآخِرَۃِ (تفسیر ابن کثیر ۱:۱۱۹) جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا تو اس نے کہا: لکھئے، حضرت عیسی علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا لکھوں؟ معلم نے کہا: بسم اللہ لکھیے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: بسم اللہ کیا ہے؟ استاذ نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا "ب" سے مراد اللہ تعالیٰ کا "بہاء" یعنی بلندی ہے اور "س" سے مراد اس کی سناء یعنی نور اور روشنی ہے اور "م" سے مراد اس کی مملکت یعنی بادشاہی ہے اور "اللہ" معبودوں کے معبود اور "رحمن" دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والے کو اور "رحیم" آخرت میں کرم ورحم کرنے والے کو کہتے ہیں۔

ابن مردویہ رحمہ اللہ میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا أُنْزِلَتْ عَلَیَّ آیَۃٌ لَمْ تَنْزِلْ عَلَی نَبِیٍّ غَیْرِ سُلَیْمَانَ بْنِ دَاوُدَ وَغَیْرِی، وَہِیَ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {الطبرانی فی المعجم الکبیر (۴/۲۳)} مجھ پر ایک ایسی آیت اتری ہے جو کسی اور نبی پر سوائے حضرت سلیمان کے نہیں اتری۔ وہ آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لَمَّا نَزَلَ {بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ} ہَرَبَ الْغَیْمُ إِلَی الْمَشْرِقِ، وَسَکَنَتِ الرِّیَاحُ، وَہَاجَ الْبَحْرُ، وَأَصْغَتِ الْبَہَائِمُ بِآذَانِہَا، وَرُجِمَتِ الشَّیَاطِیْنُ مِنَ السَّمَآءِ، وَحَلَفَ اللّٰہُ تَعَالَی بِعِزَّتِہِ وَجَلَالِہِ أَلَّا یُسَمَّی اسْمُہُ عَلَی شَیْءٍ إِلَّا بَارَکَ فِیہِ جب یہ آیت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اتری بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں تھم گئیں۔ سمندر ٹھہر گیا جانوروں نے کان جھکا لئے۔ شیاطین پر آسمان سے شعلے گرے اور پروردگار عالم نے اپنی عزت وجلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا یہ نام لیا جائے گا اس میں ضرور برکت ہو گی {مسند ابی یعلی (۱:۱۴۷) مستدرک (۴:۸۵) مسند البزار}

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَنْ أَرَادَ أَنْ یُنْجِیَہُ اللّٰہُ مِنَ الزَّبَانِیَۃِ التِّسْعَۃَ

عَشَرَ فَلْيَقْرَأْ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، لِيَجْعَلَ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ حَرْفٍ مِّنْهَا جُنَّةً مِّنْ كُلِّ وَاحِدٍ {قرطبی، ابن کثیر ۱:۱۲۰} جو شخص یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم کے انیس فرشتوں سے نجات عطاء فرمائے تو اسے چاہیے کہ وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھے۔ اس کے بھی انیس حروف ہیں۔ ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا فَقَدْ رَأَيْتُ بِضْعَةً وَّثَلَاثِيْنَ مَلَكًا يَبْتَدِرُوْنَهَا لِقَوْلِ الرَّجُلِ: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ، مِنْ أَجْلِ أَنَّهَا بِضْعَةٌ وَّثَلَاثُوْنَ حَرْفًا وَّغَيْرُ ذٰلِكَ (بخاری ۷۹۹) میں نے تیس سے اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے یہ حضور ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا جب ایک شخص نے رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ پڑھا تھا اس میں بھی تیس سے اوپر حروف ہیں۔

حضرت عاصم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے ابو تمیمہ رحمہ اللہ سے سنا وہ آپ ﷺ کے ردیف (اسامہ بن عمیر رضی اللہ عنہ) کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ جب نبی ﷺ سواری سے پھسلے تو میں نے کہا: تَعِسَ الشَّيْطَانُ تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: کہ إِذَا عَثَرَتْ بِكَ الدَّابَّةُ فَلَا تَقُلْ تَعِسَ الشَّيْطَانُ فَإِنَّهُ يَتَعَاظَمُ حَتّٰى يَصِيْرَ مِثْلَ الْبَيْتِ وَيَقُوْلُ بِقُوَّتِهِ صَنَعْتُهُ وَلٰكِنْ قُلْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَإِنَّهُ يَتَصَاغَرُ حَتّٰى مِثْلَ الذُّبَابِ {قرطبی ۱:۹۲} جب تجھے جانور گرا دے تو تعس الشیطان نہ کہو اس سے شیطان پھولتا ہے یہاں تک کہ گھر کی طرح ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے میں نے اپنی قوت سے ایسا کیا ہے لیکن تو کہہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ایسا کہنے سے وہ ذلیل اور پست ہو جاتا ہے یہاں تک کہ مکھی کی طرح ہو جاتا ہے۔ خطبے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: كُلُّ أَمْرٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، فَهُوَ أَجْذَمُ جس کام کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے (تفسیر علامہ ابن کثیر ۱:۱۲۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا وُضُوءَ لِمَنْ لَّمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ (مسند احمد بن حنبل) جو شخص وضو میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا۔ بعض علماء تو وضو کے وقت آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنا واجب بتاتے ہیں۔ بعض مطلق وجوب کے قائل ہیں۔ جانور کو ذبح کرتے وقت بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ بعض نے یاد آنے کے وقت اور بعض نے مُطْلَقًا اسے واجب کہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کہ قُلْ: بِاسْمِ اللّٰهِ ، وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ { صحیح مسلم } بسم اللہ کہو اور اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے نوالہ اٹھایا کرو۔ بعض علماء اس وقت بھی بسم اللہ کا کہنا واجب بتلاتے ہیں۔ بیوی سے ملنے کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِاسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا، فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذٰلِكَ لَمْ يَضُرَّهُ شَيْطَانٌ أَبَدًا (صحیح البخاری و صحیح مسلم) جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس آئے تو کہے، اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچا اور شیطان کو اس سے بچا جو تو نے ہمیں دیا ہے۔ اگر اس جماع سے حمل ٹھہر جائے تو اس بچہ کو شیطان کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں روایت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سب سے پہلے جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تو فرمایا اے محمد! کہئے أَسْتَعِيْذُ بِالسَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پھر کہا: کہئے {بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ} مقصود یہ تھا کہ اٹھنا، بیٹھنا، پڑھنا سب اللہ کے نام سے شروع ہو۔

بسم اللہ کی اہمیت

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شریعت نے ہر کام کے شروع میں بسملہ کو مستحب قرار دیا ہے ، جیسے کھانے، پینے، ذبح کرنے، جماع کرنے، پاکی حاصل کرنے، اور دریا میں سفر کرنے کے علاوہ دوسرے افعال کے وقت بسم اللہ پڑھنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، پس کھاؤ تم اس چیز میں سے جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا ، اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: أَغْلِقْ بَابَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَأَطْفِئْ مِصْبَاحَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَخَمِّرْ إِنَاءَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَأَوْكِ سِقَاءَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ اپنا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام لو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام لو، اپنے برتن کو ڈھانکو تو اللہ کا نام لو، اپنا مشکیزہ بند کرو تو اللہ کا نام لو۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِينِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ (بخاری، مسلم) اے لڑکے (عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ)! اللہ کا نام لے اور دائیں ہاتھ کے ساتھ کھا اور اپنے سامنے سے کھا۔ اسی طرح حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ إِلَّا يُذْكَرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (سنن ابی داؤد) بے شک شیطان کو کھانے پر اختیار حاصل ہو جاتا ہے مگر جس پر اللہ کا نام لیا جائے ۔

اسی طرح حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ لَمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ بِاسْمِ اللّٰهِ جس نے ذبح نہیں کیا، پس اسے چاہیے کہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔

ایک بار حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے شکایت کی کہ جب سے وہ مسلمان ہوئے ہیں تب سے وہ اپنے جسم میں درد محسوس کرتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ضَعْ يَدَكَ عَلَى الَّذِي تَأَلَّمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ

شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ اپنا ہاتھ اپنے جسم پر دردوالی جگہ پر رکھو اور تین بار اللہ کا نام لو اور سات بار أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ پڑھو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سِتْرُ مَا بَيْنَ الْجِنِّ وَعَوْرَاتِ بَنِي آدَمَ إِذَا دَخَلَ الْكَنِيفَ أَنْ يَقُولَ بِسْمِ اللهِ جنات اور اولاد آدم کی شرم گاہوں کے درمیاں پردہ یہ ہے کہ جب وہ بیت الخلاء میں داخل ہوں تو یوں کہیں بسم اللہ (ابن ماجہ، ترمذی) ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ إِذَا مَسَّ طَهُورَهُ سَمَّى اللهَ تَعَالَى، ثُمَّ يُفْرِغُ الْمَاءَ عَلَى يَدَيْهِ (دار قطنی) جب نبی کریم ﷺ اپنے وضو کے برتن کو ہاتھ لگاتے تو اللہ کا نام لیتے پھر اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے تھے۔

بسم اللہ اور آپ ﷺ کا عمل: آپ ﷺ کا اپنا عمل مبارک بھی یہی تھا کہ وہ ہر کام سے پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اور اگر کسی سے تحریر لکھواتے تو اس کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھواتے تھے آپ ﷺ نے روم کے بادشاہ قیصر کو خط لکھوایا تو اس کے شروع میں یوں لکھوایا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ، إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ، اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے روم کے بادشاہ ھرقل کے نام۔ ((بخاری شریف)

آپ ﷺ نے شاہ ایران خسرو پرویز کے نام اپنے خط میں بسم اللہ شروع میں لکھوائی بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللهِ ﷺ إِلَى كِسْرَىٰ عَظِيمِ فَارِسَ، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے رسول محمد کی طرف سے ایران کے بادشاہ کسریٰ کی طرف۔ (عیون الاثر ج ۲ ص ۳۴۸)

آپ ﷺ نے مصر کے بادشاہ جریج بن میناء مقوقس کے نام خط لکھوایا تو اس کے شروع میں بسم اللہ لکھوائی بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ إِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، محمد بن عبد اللہ کی طرف سے

قبطیوں کے بادشاہ مقوقس کے نام۔(عیون الاثر ج ۲ ص ۳۳۲)

آپ ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام خط لکھوایا تو اس کے شروع میں بسم اللہ لکھوائی،

بِسْمِ اللّٰهِ الرحمٰن الرَّحِيْم، مِنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُول اللّٰهِ إِلَى النَّجَاشِيِّ مَلِكِ الْحَبَشَةِ، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، اللہ کے رسول محمد کی طرف سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف۔ (عیون الاثر ج ۲ ص ۳۳۰)

آپ ﷺ نے منذر بن ساویٰ کے نام خط لکھوایا تو اس کے شروع میں بھی بسم اللہ لکھوائی، بسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰن الرَّحِيم، مِن مُحَمَّدٍ رَّسُول اللّٰهِ إِلَى الْمُنْذِرِ بْنِ سَاوِي، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، اللہ کے رسول محمد کی طرف سے منذر بن ساویٰ کی طرف۔ (عیون الاثر ج ۲ ص ۳۳۷)

آپ ﷺ نے جُلندی کے بیٹے جیفر اور عبد کو ایک خط لکھا تھا جس میں آپ ﷺ نے بسم اللہ لکھوائی تھی، عیون الاثر میں یہ خط موجود ہے، جس کے شروع میں آپ ﷺ نے لکھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِن مُحَمَّدِ بن عَبدِ اللّٰهِ إلى جَيْفَرٍ وَعَبْدٍ ابْنَيِ الْجُلَنْدِيِّ، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، محمد بن عبداللہ کی طرف سے جلندی کے بیٹے جیفر اور عبد کے نام۔(عیون الاثر ج ۲ ص ۳۳۵)

آپ ﷺ نے یمامہ کے ھوذہ بن علی کو خط لکھوایا تو اس کے آغاز میں بھی تسمیہ تھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللّٰهِ إِلَى هَوْذَةَ بْنِ عَلِيٍّ، اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، اللہ کے رسول محمد کی طرف سے ھوذہ بن علی کے نام۔۔(عیون الاثر)

آپ ﷺ نے حرث بن شمر غسانی کی طرف خط لکھوایا تو اس میں بھی تسمیہ تھی،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُول اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلّم إلى الحرث بْنِ أَبِي شِمْرٍ (عیون الاثر ج ۲ ص ۳۳۹) اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، اللہ کے رسول محمد کی طرف سے حرث بن ابی شمر کے نام۔

بسم اللہ چار نہروں کا سرچشمہ

شب معراج میں نبی کریم ﷺ کو جنت اور دوزخ دکھائی گئی تھی، اسی رات جب آپ ﷺ نے جنت میں چار نہریں دیکھیں جن کے سرچشمے کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل سے سوال کیا تو وہ بھی لاعلمی کا اظہار کرنے لگے تھے، جس پر آپ ﷺ کو انہوں نے بتایا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ان چار نہروں کے بارے میں پوچھیں، اللہ آپ ﷺ کی اس بارے میں راہنمائی فرمادیں گے

حضرت نبی کریم رؤف ورحیم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَيْلَةَ أُسرِيَ بِي إِلَى السَّمَآءِ عُرِضَ عَلَيَّ جَمِيْعُ الْجَنَانِ فَرَأَيْتُ فِيْهَا اَرْبَعَةَ أَنْهَارًا نَهرًا مِّنْ مَّاءٍ وَنَهرًا مِّن لَّبَن وَنَهرًا مِّن خَمر وَنَهرًا مِّن عَسَل فَقُلتُ يَا جِبْرِيْلُ مِن اَينَ تَجِيءُ هٰذِهِ الأَنهَارُ وَإِلَى اَينَ تَذهَبُ قَالَ تَذهَبُ إِلَى حَوضِ الْكَوثَرِ وَلَا أَدرِي مِن اَينَ تَجِيءُ فَادْعُ اللهَ تَعَالىٰ لِيُعَلِّمَكَ اَوْ يُرِيْكَ فَدَعَا رَبَّه فَجَاءَ مَلَكٌ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِي عَلَيْهِ السَّلامُ ثُمَّ قَالَ يَا مُحَمَّدُ غَمِّض عَيْنَيْكَ قَالَ فَغَمَضْتُ عَينَيَّ ثُمَّ قَالَ افتَح عَيْنَيْكَ فَفَتَحْتُ فَإِذَا اَنَا عِندَ شَجَرَة وَرَأَيْتُ قُبَّةً مِّنْ دُرَّة بَيْضَاءَ وَلَهَا بَابٌ مِّن ذَهَب اَحمَرَ وَقُفلٌ لَوْ أَنَّ جَمِيْعَ مَا فِي الدُّنْيَا مِنَ الجِنِّ وَالإِنْسِ وُضِعُوْا عَلَى تِلْكَ القُبَّةِ لَكَانُوْا مِثْلُ طَائِر جَالِسٌ عَلَى جَبَل فَرَأَيْتُ هٰذِهِ الأَنْهَارَ الاَرْبَعَةَ تَخْرُجُ مِنْ تَحْتِ هٰذِهِ القُبَّةِ فَلَمَّا أَرَدْتُ اَنْ اَرْجِعَ قَالَ لِي ذٰلِكَ المَلَكُ لِمَ لَا تَدْخُلُ القُبَّةَ قُلْتُ كَيْفَ اَدْخُلُ وَعَلَى بَابِهَا قُفْلٌ لَا مِفْتَاحَ لَهُ عِنْدِي قَالَ مِفْتَاحُهُ بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيْمِ فَلَمَّا دَنَوْتُ مِنَ القُفْلِ وَقُلْتُ بِسْمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيْمِ اِنفَتَحَ القُفْلُ فَدَخَلْتُ فِي القُبَّةِ فَرَأَيْتُ هٰذِهِ الأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ اَرْبَعَةِ اَرْكَانِ القُبَّةِ وَرَأَيْتُ مَكْتُوبًا عَلَى اَرْبَعَةِ اَرْكَانِ القُبَّةِ بِسْمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيْمِ وَرَأَيْتُ نَهْرَ الْمَاءِ يَخْرُجُ مِنْ مِيْمِ بِسمِ اللهِ وَرَأَيْتُ نَهْرَ اللَّبَنِ يَخْرُجُ مِنْ هَاءِ اللهِ وَنَهْرَ الخَمْرِ يَخْرُجُ مِنْ مِّيْمِ الرَّحمٰنِ وَنَهْرَ العَسَلِ مِنْ مِيْمِ الرَّحِيْمِ فَعَلِمْتُ اَنَّ اَصْلَ هٰذِهِ الأَنْهَارِ

الْاَرْبَعَةِ مِنَ الْبَسْمَلَةِ

معراج کی رات مجھے آسمانوں پر لیجایا گیا، تمام جنتیں میرے سامنے کی گئیں، میں نے ان میں چار نہریں دیکھیں، ایک پانی کی، دوسری دودھ کی، تیسری شراب کی اور چوتھی شہد کی، میں نے عرض کیا: اے جبریل! یہ نہریں کہاں سے آتی اور کہاں جاتی ہیں؟ جبریل نے کہا: آتی کہاں سے ہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے، البتہ یہ جاتی حوض کوثر پر ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تاکہ وہ آپ ﷺ کو بتا دے یا آپ ﷺ کو دکھادے، آپ ﷺ نے دعا کی تو اس پر ایک فرشتہ آیا، جس نے آپ ﷺ کو سلام کیا، پھر اس نے کہا: اے محمد! اپنی آنکھیں بند کیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، پھر فرشتے نے کہا: اپنی آنکھیں کھول دیں، پھر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں، پس اچانک میں ایک درخت کے پاس تھا اور میں نے سفید موتیوں کا ایک گنبد دیکھا، اس کے دروازے سرخ سونے کے تھے، ان پر تالا لگا ہوا تھا، اگر ساری دنیا، جنات اور انسان اس گنبد پر رکھ دیئے جائیں تو وہ ایسے لگیں جیسے ایک پرندہ پہاڑی کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ پھر میں نے ان چار نہروں کو دیکھا، جو اس گنبد کے نیچے سے بہہ رہی ہیں، جب میں نے چاہا کہ واپس لوٹوں تو اس فرشتے نے مجھے کہا: آپ ﷺ اس گنبد میں کیوں نہیں جاتے؟ میں نے کہا: میں اس میں کیسے جاسکتا ہوں؟ اس کے دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے، میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے، فرشتے نے کہا: اس کی چابی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے، جب میں نے تالے کے قریب ہو کر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا تو تالا کھل گیا، پھر میں گنبد میں داخل ہو گیا، پھر میں نے دیکھا کہ یہ چار نہریں گنبد کے چار ستونوں سے بہہ رہی ہیں، میں نے اس گنبد کے چار ستونوں پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا دیکھا، میں نے پانی کی نہر دیکھی جو بسم اللہ کی میم سے نکل رہی تھی، میں نے دودھ کی نہر دیکھی جو لفظ اللہ کی ھاء سے نکل رہی تھی، میں نے شہد کی نہر دیکھی جو الرحیم کی میم سے نکل رہی تھی، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ چار نہروں کا سرچشمہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ (روح البیان ج ۱ ص ۹)

محمد اسماعیل حنفی رحمہ اللہ نے اس روایت کا آخری حصہ ذکر کیا، جس میں یہ الفاظ ہیں فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّ

وَجَلَّ يَا مُحَمَّدُ مَنْ ذَكَرَنِي بِهٰذِهِ الْأَسْمَاءِ مِنْ أُمَّتِكَ بِقَلْبٍ خَالِصٍ مِنْ رِيَاءٍ وَقَالَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سَقَيْتُهُ مِنْ هٰذِهِ الْأَنْهَارِ (روح البیان ج۱ص۹) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! آپ ﷺ کی امت میں سے جس نے دکھلاوے سے ہٹ کر خالص دل کے ساتھ مجھے ان ناموں کے ساتھ یاد کیا اور بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا تو میں اسے ان نہروں سے پلاؤں گا۔

بسم اللہ اور دعا کی قبولیت: حدیث شریف میں آتا ہے کہ لَا يُرَدُّ دُعَاءٌ اَوَّلُهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (روح البیان ج۱ص۹) جس دعا کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی جاتی ہے وہ دعا رد نہیں ہوتی۔

بسم اللہ کا احترام: حدیث شریف میں آتا ہے کہ مَنْ رَفَعَ قِرْطَاسًا مِّنَ الْأَرْضِ مَكْتُوبًا عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ إِجْلَالًا لَّهُ وَلِاسْمِهِ عَنْ اَنْ يُّدَنَّسَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَخُفِّفَ عَنْ وَالِدَيْهِ وَاِنْ كَانَا مُشْرِكَيْنِ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کا خیال رکھتے ہوئے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا کاغذ کا ٹکڑا زمین سے اٹھایا، تاکہ وہ میلا نہ ہو جائے تو وہ اللہ کے ہاں صدیقین میں شمار ہو گا، چاہے اس کے والدین مشرک ہی کیوں نہ ہوں ان سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (روح البیان ج۱ص۹)

قیصر بادشاہ اور بسم اللہ: بسم اللہ شریف کی عجیب برکت دیکھی گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے قیصر بادشاہ کے سر درد کو شفا عطا فرمائی، تفسیر روح البیان میں قیصر بادشاہ کی ایک حکایت لکھی ہوئی ہے کہ وَ كَتَبَ قَيْصَرُ مَلِكُ الرُّوْمِ اِلٰى عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّ بِيْ صُدَاعًا لَا يَسْكُنُ فَابْعَثْ اِلَيَّ دَوَاءً اِنْ كَانَ عِنْدَكَ فَاِنَّ الْأَطِبَّاءَ عَجَزُوْا عَنِ الْمُعَالَجَةِ فَبَعَثَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ قَلَنْسُوَةً فَكَانَ اِذَا وَضَعَهَا عَلٰى رَأْسِهٖ سَكَنَ صُدَاعُهٗ وَاِذَا رَفَعَهَا عَنْ رَأْسِهٖ عَادَ صُدَاعُهٗ فَتَعَجَّبَ مِنْهُ فَفَتَّشَ فِي الْقَلَنْسُوَةِ فَاِذَا فِيْهَا كَاغِدٌ مَكْتُوْبٌ عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (روح البیان ۱:۹)

روم کے بادشاہ قیصر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرے سر میں درد ہوتا ہے جو ٹھیک نہیں ہو رہا اگر آپ کے پاس کوئی دوا ہو تو میرے لیے روانہ کریں، کیونکہ ڈاکٹر حکیم میرے علاج معالجے سے عاجز ہو چکے ہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک ٹوپی بھیجی، جب شاہ روم قیصر اس ٹوپی کو سر پر رکھتا تو سر درد ختم ہو جاتا تھا اور جب اس ٹوپی کو سر سے اتارتا تو سر درد پھر شروع ہو جاتا تھا، اس پر وہ حیران ہو گیا، پھر جب اس نے ٹوپی کو چیک کیا تو اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا۔

روح البیان میں ہی شیخ اکبر رحمہ اللہ کی فتوحات کے حوالے سے ایک روایت ہے، شیخ اکبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تو سورۃ الفاتحہ پڑھے تو اس کے ساتھ بسم اللہ کو ایک ہی سانس میں ملا کر پڑھ، اس طرح کہ وہ اس سے الگ نہ ہونے پائے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھاتے ہوئے جبریل سے، جبریل نے قسم کھاتے ہوئے میکائیل سے، میکائیل نے قسم کھاتے ہوئے اسرافیل سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

يَا إِسْرَافِيلُ بِعِزَّتِي وَجَلَالِي وَجُودِي وَكَرَمِي مَنْ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مُتَّصِلَةً بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ مَرَّةً وَّاحِدَةً فَاشْهَدُوْا عَلَيَّ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُ وَقَبِلْتُ مِنْهُ الْحَسَنَاتِ وَتَجَاوَزْتُ لَهُ عَنِ السَّيِّئَاتِ وَلَا أُحْرِقُ لِسَانَهُ بِالنَّارِ وَأُجِيْرُهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَعَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالْفَزَعِ الْأَكْبَرِ وَتَلَقَّانِي قَبْلَ الْأَنْبِيَآءِ وَالْأَوْلِيَآءِ أَجْمَعِيْنَ، اے اسرافیل! مجھے اپنی عزت، جلال، اپنی سخاوت اور اپنے کرم کی قسم ہے جس نے بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ کے ساتھ ایک بار ملا کر پڑھا تو گواہ ہو جا کہ میں نے اسے معاف کر دیا، میں نے اس کی نیکیاں قبول کر لیں اور اس کی برائیوں کو مٹا دیا، میں اس کی زبان کو آگ سے نہیں جلاؤں گا، میں اسے عذاب قبر سے بچاؤں گا، دوزخ کے عذاب سے بچاؤں گا، قیامت کے عذاب سے بچاؤں گا، بڑی گھبراہٹ سے بچاؤں گا اور یہ شخص انبیاء اور تمام اولیاء سے پہلے میرے ساتھ ملاقات کرے گا۔ (روح البیان ج ۱ ص ۹)

ان روایات سے روز روشن کی طرح بسم اللہ شریف کی اہمیت واضح ہو رہی ہے، آپ ﷺ کی زبا ن مبارک سے بھی اس کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور کیوں نہ ہو کہ اس میں ایک برکت والی ذات کا اسم ذات موجود ہے، اس برکت والی ذات کے دو وہ صفاتی نام ہیں جن کا عکس ہر مقام پر دکھائی دیتا ہے، اس کی رحمت عام اور تام ہے، انسانوں اور حیوانوں تک اس کی رحمت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، اس کی رحمت نہ ہو تو کائنات ہستی معدوم ہو جائے۔

بسم اللہ کا تاریخی تسلسل

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ اگرچہ امت محمدیہ علیہا الصلوۃ والتحیہ کے لیے خاص ہیں مگر اس کے ساتھ ملتے جلتے مفہوم والے الفاظ حضرات انبیاء کرام کی زبانوں پر بھی جاری رہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور بسم اللہ: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ قول نقل کیا، جس میں انہوں نے اپنے والد سے کہا تھا يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ (مَرْيَم: ۴۵)، اے اباجان! میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ کہیں آپ کو رحمن کا عذاب نہ پکڑ لے۔

اسی طرح قرآن نے ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمان بھی نقل کیا، سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا [مَرْيَم: ۴۷] عنقریب میں آپ کے گناہ بخشواؤں گا اپنے رب سے بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے۔

پہلی آیت میں رحمن کا لفظ واضح ہے جب کہ اس آیت میں حفی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا معنیٰ رحیم کے معنیٰ کے مترادف ہے۔ اسی طرح ان کا یہ قول بھی قرآن کریم نے نقل کیا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (الْبَقَرَة: ۱۲۸) اور ہمیں معاف کر دے، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ یہاں بھی لفظ رحیم کا استعمال ہوا ہے۔

سیدنا سلیمان علیہ السلام اور بسم اللہ: قرآن کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے ملک سباء کی ملکہ بلقیس کو لکھا تھا، جس میں انہوں نے اسے مسلمان ہونے کی دعوت دی تھی

، اس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ذکر ہے، ارشاد ہے إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ، بے شک وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور بے شک وہ اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے، میرے مقابلے میں زور نہ کرو اور چلے آؤ تابعدار بن کر۔ (سورۃ النمل ۳۰، ۳۱)

علامہ محمد طاہر تونسی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "التحریر والتنویر" میں لکھتے ہیں کہ گمان یہی ہے کہ سلیمان نے اپنے خط کے آغاز میں بسم اللہ ذکر کی تو اس میں انہوں نے اپنے مورث حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کی پیروی کی ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سنت کو امت مسلمہ میں باقی رکھا ہو۔ (التحریر والتنویر ج ۱ ص ۱۵۵)

بسملہ ایک مختصر نام: اہل لغت سے بسم اللہ کا ایک مختصر نام بَسْمَلَ بھی منقول ہے، یعقوب بن سکیت رحمہ اللہ، مطرز رحمہ اللہ اور علامہ ثعالبی رحمہ اللہ وغیرہ اہل لغت نے کہا بَسْمَلَ الرَّجُلُ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص: بِسْمِ اللَّهِ کہتا ہے، اسی طرح حَوْقَلَ الرَّجُلُ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کہتا ہے اور هَلَّلَ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہتا ہے اور سَبْحَلَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص سُبْحَانَ اللَّهِ کہتا ہے اور حَمْدَلَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص الْحَمْدُ لِلَّهِ کہتا ہے اور حَيْصَلَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ. کہتا ہے اور جَعْفَلَ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص جُعِلْتُ فِدَاكَ. کہتا ہے اور طَبْقَلَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص: أَطَالَ اللَّهُ بَقَاءَكَ کہتا ہے اور دَمْعَزَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص أَدَامَ اللَّهُ عِزَّكَ. کہتا ہے اور حَيْفَلَ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کہتا ہے اور الْحَيْصَلَةَ، اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ. کہتا ہے۔ (تفسیر قرطبی ج ۱ ص ۹۷)

ایک عجیب تحقیق: میرے استاذ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتح اللہ" میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے اور اللہ ہی دل میں ڈالنے والے ہیں، اس تحقیق کا

حاصل یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے انیس حروف ہیں اوراس انیس کے عدد میں وہ اسرار ہیں جو انسانی عقلوں کو حیران کر دیتے ہیں، پہلی امتوں میں انیس کے عدد کے اسرار ظاہر نہیں ہوئے تھے اور یہ بات حق ہے کہ قیامت تک قرآنی عجائبات ختم نہیں ہوں گے۔

استاذ محترم لکھتے ہیں کہ انیس کا عدد اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ قرآن کریم ایک معجزہ ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، یہ زائغین اور محرفین کی دست برد سے محفوظ ہے، تو تسمیہ اس لحاظ سے کہ اس کے حروف کی تعداد ۱۹ ہے اسرار ربانی اور معجزۂ صمدانی کو متضمن ہے، ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ کا لکھوایا جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ۱۹ کے عدد پر غور کیا جائے اور اشارہ ہے کہ قرآن تبدیلی سے محفوظ ہے اور دلیل ہے اس بات پر کہ ہر سورت اللہ کی طرف سے ہے، اس میں سے ایک حرف بھی تبدیل نہیں ہو گا، اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف دیکھتے۔

۱۹ کا عدد قرآن کریم میں ایک باریک اشارہ کرتا ہے، انسان دیکھتا ہے کہ یہ عدد ایک سے مرکب ہے جو تمام اعداد کی اساس ہے اوراوّل وترہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ وترہے اور وتر کو پسند کرتا ہے اوراس کے آخر میں ۹ کا عدد ہے، یہ بھی وتر ہے، ۹ کا عدد اصلی اعداد میں سے ہے، ۱۹ کا عدد تقسیم کو قبول نہیں کرتا، اس میں اسرار و رموز پنہاں ہیں جو اس سے پہلے زمانے میں چھپے ہوئے تھے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں سے کچھ آپ بیان کریں، تو میں کہتا ہوں، ان میں سے ایک لفظ اسم ہے، جو قرآن میں ۱۹ بار ثابت ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو ۱۹ کے عدد کی رعایت رکھنا پوری کتاب میں ایک مشکل کام تھا، کیونکہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ پوری کتاب میں اس عدد کی رعایت رکھتا، خاص کر کے اس وقت جب کہ وہ اُمّی ہو، اس کے پاس تصنیف اور تالیف کا فن نہ ہو اور کتاب پڑھی تک نہ ہو۔

اس میں سے ایک یہ ہے کہ رحمن نام قرآن میں ۵۷ بار ذکر کیا گیا ہے، ۵۷ کا عدد ۱۹ پر تقسیم ہو

تا ہے، ۱۹ ضرب ۳، مساوی ۵۷، کوئی انسان یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اس قدر ضخیم کتاب میں اس بات کی رعایت رکھے کہ مکرر استعمال ہونے والے عدد کی تقسیم یوں کرے، کسی صورت میں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ لفظ بسم قرآن میں تین مقامات پر ذکر کیا گیا ہے اور لفظ اسم ۱۹ جگہوں پر استعمال ہوا ہے، جب ۳ کو ۱۹ کے ساتھ ضرب دی گئی تو اس کا حاصل ۵۷ آیا اور اسم رحمن اتنی ہی تعداد میں قرآن میں آیا ہے۔ اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ قرآن میں اسم رحیم ۱۱۴ بار آیا ہے، جو کہ ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے، ۱۹ ضرب ۶ مساوی ۱۱۴۔

اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ بسم اللہ میں موجود لفظ اللہ قرآن کریم میں ۲۶۹۸ بار آیا ہے، یہ عدد بھی ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے، ۲۶۹۸: ۱۹، مساوی ۱۴۔ اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ قرآنی سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے، یہ عدد بھی ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے ۱۹ ضرب ۶، مساوی ۱۱۴۔

۱۹ کے عدد کا اس طرح انطباق کوئی اتفاقی امر نہیں ہے، کیونکہ اتفاق ایک یا دو بار ہوتا ہے اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا اور قرآن کریم میں ۱۹ کے عدد کا آنا ایک بار سے زائد ہے، معلوم ہوا کہ اس عدد کا اس طرح استعمال مؤلف اور متکلم کے ارادے سے ہے اور انسانی مؤلف اس پر قدرت نہیں رکھتا، تو یہ بات اس پر دلیل اور برھان ہے کہ قرآن کریم انسانوں کو پیدا کرنے والے کا کلام ہے، جو تحریف اور تبدیلی سے محفوظ ہے، اگر اس میں ایک حرف کی تبدیلی کی بھی گنجائش ہوتی تو ۱۹ کے عدد کا یوں استعمال نہ ہوتا اور اس عدد کا بسم اللہ الرحمن الرحیم کو متضمن ہونا یہ قرآن کریم کی صداقت و حقانیت پر مہر ربانی کا ثبت ہونا ہے۔

اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ خود بسم الرحمن الرحیم قرآن کریم میں ۱۱۴ بار آئی ہے اور ۱۱۴ قرآنی سورتوں کا عدد ہے، صرف ایک سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہے، مگر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سورۃ النمل میں اسے ذکر کیا گیا ہے، یوں بسم اللہ کی تعداد بھی ۱۱۴ ہوئی، ۱۱۴ بھی ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے، ۱۹ ضرب ۶ مساوی ۱۱۴۔

اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ حروف مقطعات کی تعداد ۱۴ ہے، جنہیں نورانی حروف (ا،ح، ر،س، ص،ط،ع،ق،ک،ل،م،ن،ھ،ی) کا نام دیا گیا ہے، حروف مقطعات ۲۹ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، ان حروف کے علاوہ باقی حروف کو ظلمانی حروف کا نام دیا گیا ہے، جس کی بعض نے صراحت بھی کی ہے، یہ حروف بھی ۱۴ ہیں، جب ان حروف کو ۲۹ کے ساتھ جمع کیا گیا تو حاصل ۵۷ نکلا، اس طرح ۲۹ جمع ۱۴ جمع ۱۴ مساوی ۵۷ اور یہ بات واضح ہے کہ ۵۷ کا عدد ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے، ۱۹ ضرب ۳، مساوی ۵۷۔

استاذ محترم شیخ موسیٰ روحانی بازی "رحمہ اللہ فتح اللہ" کے صفحہ ۴۹۲ پر لکھتے ہیں کہ ۱۹ کا عدد رب العالمین کے اس فرمان کی صداقت کی گواہی دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی مثل جنات اور انسان مل کر نہیں لاسکتے، اگرچہ یہ ایک دوسرے کے معاون و مدد گار ہی کیوں نہ بن جائیں، اس پر حضرت شیخ ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر آپ کہیں کہ یا اللہ اور اسم الجلالہ اور ۱۹ کا عدد کس طرح اعجاز قرآنی کے اسرار کا احاطہ کرتے ہیں؟ اور قرآن میں اس کا استعمال کیسے ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جو عقلوں کو حیران کر دیتی ہیں، ہم ان میں سے کچھ ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر وجہ ایسی ہے جسے اس امت سے پہلے کسی انسان اور جن نے چھوا تک نہیں ہے۔

حضرت الاستاذ اس کی پہلی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسم اللہ قرآن میں ۲۶۹۸ بار آیا ہے، ۹۸۰ بار مضموم، ۵۹۲ بار مفتوح اور ۱۱۲۶ بار مکسور۔ اور عدد ۲۶۹۸ اور عدد ۱۹ متداخل ہیں یعنی ان میں سے اقل عدد اکثر کو مٹا دیتا ہے، اس کے بار بار ساقط کرنے کے بعد، یعنی ۱۴۲ بار اسے ساقط کرنے کے بعد، اگر آپ چاہیں تو کہیں کہ اکثر عدد ۲۶۹۸ ہے جو سیدھا ۱۹ پر تقسیم ہوتا ہے، ۱۹ ضرب ۱۴۲، مساوی ۲۶۹۸، پھر حاصل یہ کہ ۱۴۲ کا عدد ۷۱ کا دگنا ہے اور ۷۱ کا عدد جلالہ کے اعداد میں سے ہے، اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ۱۴۲ کا عدد ۱۹ پر تقسیم ہو جاتا ہے، جیسے ۱۹ ضرب ۷، مساوی ۱۳۳ پھر اس میں ۹ کا عدد جمع کیا جائے جو کہ بسط کے بعد جلالہ کا عدد ہے، تو حاصل ۱۴۲ نکلے گا۔ حضرت الاستاذ نے ریاضی کے فارمولے کے تحت ثابت کیا ہے کہ قرآن کریم معجز کلام ہے، جسے مزید تفصیل دیکھنی ہو وہ فتح اللہ

کے صفحات ملاحظہ کرے، اگرچہ یہ کتاب آج نایاب ہے، حضرت الاستاذ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی ، پھر اس کے بعد اس کتاب کو اہل ذوق کی نگاہیں ترس گئیں۔

بسم اللہ کی "ب": بسم اللہ کی :ب: کا متعلق محذوف ہے ، پھر یہ محذوف اسم ہو گا یا فعل، دونوں ہوسکتے ہیں، یہ دونوں اس سے پہلے بھی ذکر ہوسکتے ہیں اور اس کے بعد بھی، یوں یہ چار اقسام ہوئیں ، ہاں جب یہ پہلے بھی ہو اور فعل بھی ہو تو تقدیر عبارت یوں ہو گی أَبْدَأُ بِاسْمِ اللهِ میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور اگر پہلے ہو اور اسم ہو تو تقدیر عبارت یوں ہو گی اِبْتِدَاءُ الْكَلَامِ بِاسْمِ اللهِ ، کلام کی ابتدا اللہ کے نام کے ساتھ اور جب بعد میں ہو اور فعل ہو تو پھر تقدیر عبارت یوں ہو گی بِاسْمِ اللهِ أَبْدَأُ، اللہ کے نام کے ساتھ میں ابتدا کرتا ہوں اور اگر بعد میں ہو اور اسم ہو تو تقدیر عبارت کی یوں ہو گی باسم اللہ ابتدائی اللہ کے نام کے ساتھ میری ابتدا ہے۔

یہاں متعلق کا پہلے اور بعد میں ہونا ثابت ہے، لیکن امام رازی رحمہ اللہ متعلق کو پہلے ذکر کرنے کو اولیٰ قرار دے کر بہت سے دلائل پیش کرتے ہیں، تقدیم پر آیت بِسْمِ اللهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسٰهَا (هود: ۴۱) پیش کرتے ہیں اور تاخیر پر آیت اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (الْعَلَقِ: ۱) پیش کرتے ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ متعلق کے مقدم ہونے کو بہتر قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں تقدیم میرے نزدیک بہتر ہے اس پر کئی وجوہ دلیل ہیں ، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ قدیم واجب الوجود ہے ، اس کا وجود اس کے غیر سے سابق ہے اور سابق بالذات تقدیم کا مستحق ہے، دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ (الْحَدِيدِ: ۳) فرمایا، جس میں اول کو پہلے ذکر فرمایا، اسی طرح ارشاد ہے لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ، (الرُّومِ: ۴) یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے امر کو قبل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری یہ کہ ذکر میں جو چیز پہلے ہوتی ہے اس کو عظیم سمجھا جاتا ہے، چوتھی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِيَّاكَ نَعْبُدُ یہاں فعل کو اسم کے بعد ذکر کیا ہے، تو ضروری ہے کہ بسم اللہ میں بھی اسی طرح ہو، پھر تقدیر عبارت کی یوں ہو گی بِاسْمِ اللهِ أَبْتَدِئُ، امام رازی رحمہ اللہ نے محققین کا ایک قول نقل کیا

ہے کہ انہوں نے جب بھی کسی چیز کو دیکھا تو انہیں اللہ سب سے پہلے نظر آیا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اس مقام پر ایک سوال اٹھایا ہے کہ فعل کو محذوف ماننا بہتر ہے یا اسم کو ؟ پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیا ہے کہ اسم کو حذف ماننا بہتر ہے، کیونکہ جب ہم بِسْمِ اللّٰهِ اِبْتِدَاءُ كُلِّ شَيْءٍ کہتے ہیں تو یہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ وہ اپنی ذات میں تمام حوادث کا مبدا ہے اور تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، کہنے والا کہے یا نہ کہے، ذکر کرنے والا اس بات کا ذکر کرے یا نہ کرے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ احتمال بہتر ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ بسم اللہ کی :ب: کا مصاحبت، استعانت اور تبرک تینوں معنی میں استعمال ہونے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے، جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لیے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف :ب: کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے، اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف باء رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی ہے باسم اللہ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے باء کو سین کے ساتھ ملا کر صورتاً اسم کا جزء بنا دیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اقرأ باسم ربک میں :ب: کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف باء کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۷۶، ۷۵)

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں ایک نحوی مسئلہ بھی ذکر کیا ہے کہ جر دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، یا تو حرف جار کے ساتھ یا اضافت کے ساتھ، جیسا کہ «بِاسْمِ» میں جر :ب: کی وجہ سے آئی ہے اور لفظ

اللّٰہِ میں جر اضافت کی وجہ سے آئی ہے اور لفظ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ پر جر اس لیے آئی ہے کہ یہ دونوں صفتیں ہیں لفظ اللہ کی، لفظ اللہ موصوف ہے توصفت موصوف کے تابع ہوتی ہے۔

ب کے معانی: ب: کئی معانی کے لیے آتی ہے، اس: ب: کو باء جر کہا جاتا ہے، یہ الصاق، استعانۃ، قسم، سبب، حال ظرفیت، نقل کے معنی میں استعمال ہوتی ہے،

الصاق کے دو معنی ہیں ایک حقیقی اور دوسرا مجازی، اس کا حقیقی معنی جیسے مَسَحْتُ بِرَأْسِی میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجازی معنی جیسے مَرَرْتُ بِزَیْدٍ میں زید کے پاس سے گزرا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ ملا ہوا ہونا۔

استعانت کا معنی جیسے ذَبَحْتُ بِالسِّکِّینِ میں نے چھری کی مدد سے ذبح کیا۔

تبرک یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

اور سببیت کے لیے جیسے فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِینَ هادُوا حَرَّمْنا پس ہم نے یہودیوں کے ظلم کے سبب حرام کیا۔

اور قسم کے لیے جیسے بِاللّٰہِ لَقَدْ قَامَ اللہ کی قسم وہ کھڑا ہوا۔

اور حال کے لیے جیسے جَاءَ زَیْدٌ بِثِیَابِهِ

اور ظرفیت کے لیے جیسے زَیْدٌ بِالْبَصْرَةِ

اور نقل کے لیے جیسے قُمْتُ بِزَیْدٍ

اور ب زائدہ تاکید کے لیے بھی آتی ہے جیسے شَرِبْنَ بِمَاءِ الْبَحْرِ

بدل کے لیے جیسے فَلَیْتَ لِی بِهِمْ قَوْمًا أَیْ بَدَلَهُمْ

اور مقابلے کے لیے جیسے اشْتَرَیْتُ الْفَرَسَ بِأَلْفٍ

اور مجاوزت کے لیے جیسے تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ أَیْ عَنِ الْغَمَامِ

اور استعلاء کے لیے جیسے مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ (بحر المحیط ۲۷/۱)

بسم اللہ میں ب استعانت اور مصاحبت کے معنی میں ہے۔ اس مقام پر: ب: الصاق، استعانت اور تبرک کے معنی میں استعمال ہو سکتی ہے، اگر الصاق و مصاحبت کے لیے ہو تو اس کا معنی ہے اللہ کے نام کے ساتھ اور اگر استعانت کے لیے ہو تو اس کا معنی یہ ہے اللہ کے نام کی مدد سے اور اگر تبرک کے لیے ہو تو اس کا معنی ہو گا، اللہ کے نام کی برکت سے۔

لفظ اسم: اسم اس لفظ کو کہا جاتا ہے جو ذوات میں سے کسی ذات پر دلالت کرے، جیسے حجر، خشب، زید یا معانی میں سے کسی معنی پر دلالت کرے، جیسے عِلم اور فرح۔ ابن سید کہتے ہیں کہ اسم وہ لفظ ہے جو جوہر اور عرض کے لیے بنایا گیا ہو۔ امام راغب کہتے ہیں اسم اسے کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی ذات اور اس کی صل معلوم کی جا سکے۔ بہت سے اہل زبان کا کہنا ہے کہ اسم السُّمُوّ، سے مشتق ہے، اس کی اصل سَمَوَ ہے، کیونکہ اس کی تصغیر سُمَیٌّ آتی ہے اور اس کی جمع أَسْمَاءٌ آتی ہے۔

اور سُمُوٌّ کا معنی ہے عُلُوٌّ یعنی بلندی، گویا کہ اسم اپنے مسمی پر بلند ہوتا ہے، کیونکہ یہ اس کا عنوان اور اس پر دلیل ہوتا ہے، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اسم سِمَۃٌ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے علامت، اس کا اصل وَسَمَ ہے، کچھ فلاسفہ نے لفظ اسم کے بارے میں بہت سی موشگافیاں کی ہیں جن کی ایک جھلک بڑی شرح وبسط کے ساتھ علامہ رازی نے اپنی تفسیر میں دکھائی ہے۔ حالانکہ اس میں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں اور نہ ہی پڑھنے والوں کو کسی الجھن میں الجھانا کوئی دانائی ہے۔

اسم کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسم وہ لفظ ہے جسے انسانی زبان بولے اور انسانی قلم لکھے ، جیسے الشمس، زید، مکہ۔ یہاں مسمی وہ ایک معروف و مشہور ستارہ ہے، یا ایک شخص معین ہے، یا وہ عظمت والا شہر ہے۔ کبھی کبھی اسم اپنے معنی کے اعتبار سے دور چلا جاتا ہے جب اس سے مراد جواہر اور اعراض لی جائیں۔

کچھ حضرات نے عجیب بات کہی ہے کہ اسم ہی مسمی ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے تفسیر منار میں لکھا ہے کہ لغت میں اسم مسمی کا غیر ہے، کچھ لوگوں نے اس قول کی نسبت علامہ سیبویہ کی طرف کی ہے، جو بے حقیقت اور بے سند بات ہے، علامہ سیویہ جیسا جلیل القدر عالم ایسا نہیں کہہ

سکتا، علامہ ابن القیم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مَا قَالَ نَحْوِيٌّ قَطُّ وَلَا عَرَبِيٌّ إِنَّ الِاسْمَ عَيْنُ الْمُسَمَّى، کسی نحوی یا کسی عربی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اسم عین مسمی ہے (بدائع الفوائد ج ا ص ۱۷)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کا معنی یہ ہے کہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرو اس کے نام: اعلیٰ: کو یاد کرتے ہوئے، اسی طرح سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ العظيم کا معنی ہے اس کی تسبیح بیان کرو اس کا نام "عظیم" پکارتے ہوئے (تفسیر المنار ج ا ص ۳۴)

علامہ رشید رضا اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں بعض کو جو اشتباہ پیدا ہوا اس کی وجہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے ذکر اور اپنی تسبیح کا حکم دیا ہے، کچھ آیات وہ ہیں جن میں اپنے نام کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ آیات میں اپنے نام کی تسبیح کرنے کا حکم دیا ہے، جیسے ارشاد ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل: ۸)

اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور اسی کی طرف متوجہ ہو سب سے کٹ کر۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الانسان: ۲۵)

اور اپنے رب کا نام یاد کرو صبح و شام۔

وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا (الحج: ۴۰)

مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت زیادہ لیا جاتا ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ (الانعام: ۱۱۸)

پس کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ (الانعام: ۱۱۹)

اور تمہیں کیا ہوا کہ تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ (الحج: ۳۶) پس اس (اونٹ کو نحر کرتے وقت) پر اللہ کا نام لو کھڑا کر کے۔ کچھ آیات ایسی ہیں جن میں فرمایا کہ اللہ کو یاد کرو، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الاحزاب: ۴۱، ۴۲) اے اہل ایمان! اللہ کو بہت

زیادہ یاد کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح وشام۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ (البقرہ: ۱۹۸) پس اللہ کو مشعر الحرام کے پاس یاد کرو اور ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں بتایا۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (البقرہ: ۲۰۰) پس اللہ کو یاد کرو جیسے یاد کرنا تمہارا اپنے آباؤ واجداد کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (سورۃ آل عمران ۱۹۱) فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ (النساء: ۱۰۳) پس جب تم نماز مکمل کر چکو تو اس کے بعد اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر یاد کرو۔

تسبیح کے بارے میں بھی کچھ آیات ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ (الاعراف: ۲۰۶) بے شک وہ لوگ (فرشتے) جو تیرے رب کے پاس ہیں اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، وہ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کے لیے سجدے کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں، یہاں تسبیح کی ضمیر رب کی طرف لوٹتی ہے، جیسے دوسری آیت میں اسم کی نسبت رب کی طرف ہے۔ ارشاد ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (الاعلیٰ: ۱) اپنے رب اعلیٰ کے نام کی تسبیح کرو۔

ایک آیت میں اسم سے پہلے حرف: ب: کا استعمال بھی ہوا ہے۔ جیسے سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (الواقعہ: ۷۴، ۹۶) پس تسبیح بیان کر اپنے عظیم رب کے نام کی اور اسی طرح ارشاد ہے سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) (الحدید: ۱) جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اللہ کے لیے تسبیح کرتا ہے۔ اسی طرح کئی مقامات پر ہے۔

کچھ آیات میں برکت کی نسبت اللہ کی طرف ہے اور کچھ میں برکت کی نسبت اللہ کے نام کی

طرف ہے، جیسے ارشاد ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ (المؤمنون: ۱۴) سو بڑی برکت اللہ کی۔ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (الفرقان: ۱) بڑی برکت ہے اس کی جس نے فیصلہ کن کتاب اتاری۔ اسی طرح ارشاد ہے تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ (الرحمٰن: ۷۸) تیرے رب کا نام برکت والا ہے۔

ان آیات کو دیکھ کر بعض حضرات نے یہ رائے قائم کرلی کہ اسم عینِ مسمی ہے، انہی آیات کو دیکھ کر انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ ذکر اللہ، ذکر اسم اللہ، اللہ کی ذات کی تسبیح اور اس کے نام کی تسبیح ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ اس کا نام تو اس کی عین ذات ہے۔

علامہ رشید رضا مصری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ یہ بات کہنا کہ ذکر اللہ، ذکر اسم اللہ، اللہ کی تسبیح اور اللہ کے نام کی تسبیح ایک چیز ہے یہ اس قول سے بہتر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ لفظ: اسم: زائد ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ ذِکر لغت میں نسیان (بھولنا) کی ضد ہے اور ذکر کا معنی ہے دل کا یاد کرنا اور ذکر یہ دل کی عبادت ہے، قرآن کریم میں ہے وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ (الکھف: ۲۴) اور جب تو بھول جائے تو اپنے رب کو یاد کر۔

اسی طرح ذِکر کا لفظ نطقِ لسانی (زبان سے بولنا) پر بھی بولا جاتا ہے، کیونکہ زبان کا ذکر دل کے ذکر کی راہنمائی کرتا ہے اور زبان اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرتی ہے، جیسے تمام چیزوں کے ناموں کا ذکر کرتی ہے، مسمیات کی ذوات کا ذکر نہیں کرتی، جیسے ایک انسان جب لفظ آگ (اسم) زبان سے نکالتا ہے تو آگ (مسمی) اس کی زبان پر نہیں گرتی کہ اسے جلادے، اسی طرح جب کوئی پیاسا لفظ پانی (اسم) زبان سے نکالتا ہے تو پانی (مسمی) اس کے منہ میں نہیں پڑتا، کہ اس کی پیاس ختم ہو، اسی طرح دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اس کی عظمت، اس کے جلال، اس کے جمال، اس کی نعمتوں کا ذکر کرنا ہوتا ہے اور اس بات کی صراحت اور وضاحت بھی فرمائی گئی ہے اور زبان کے ساتھ اس کا ذکر کرنا یہ اس کے اسماء الحسنیٰ کا ذکر کرنا ہے، اسی طرح حمد، شکر اور ثناء کی نسبت اس کی طرف کرنا ہے۔ اسی طرح اس کی تسبیح کرنا ہے، کہ دل اس اعتقاد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتا ہے کہ وہ کمال والا ہے اور اس بات کے اعتقاد کے ساتھ اس کی

تنزیہی بیان کرنا جو اس کے شایان شان نہیں ہے اور جب زبان تسبیح کرتی ہے تو اس کا نام ذکر کرتی ہے، اس وقت زبان لفظ: اسم ذکر نہیں کرتی۔

ابو داؤد، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں ایک روایت ہے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا اجْعَلُوْهَا فِي رُكُوْعِكُمْ اسے اپنے رکوع میں کر دو۔ اور جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے اپنے سجدوں میں رکھ دو۔ مطلب یہ کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ کو سجدوں میں پڑھو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اور سجدوں میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى پڑھتے تھے، معلوم ہوا کہ سُبْحَانَ اسْمَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اور سُبْحَانَ اِسْمَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى نہیں پڑھتے تھے (ترمذی)

اوپر نقل کی گئیں آیات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اسم اور ہے مسمی اور ہے، ہاں البتہ اسم کا ذکر کرنا بھی جائز ہے اور مسمی کا ذکر کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح تسبیح، تبارک، کہنا بھی جائز ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جاتی ہے اسی طرح اس کے نام کی تعظیم بھی کی جاتی ہے، اس لیے تو یہ حمد، شکر، ثناء، تقدیس کے ساتھ ملا کر ذکر کیے جاتے ہیں، اہل علم نے وضاحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی ارادتاً توہین کرنا کفر ہے، کیونکہ کسی مومن سے یہ حرکت صادر نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر المنار ج ا ص ۳۶، ۳۵)

علامہ رشید رضا رحمہ اللہ کی اس تحقیق کے بعد ایک دوسرا موقف بھی ہے جس میں اسم وہ مسمی ہی ہے اور اس کا عین ہے، اس پر قرآنی آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے، جیسے علامہ حسین بن مسعود بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل فی تفسیر القرآن المعروف تفسیر بغوی میں لکھتے ہیں

وَالِاسْمُ هُوَ الْمُسَمّٰى وَعَيْنُهُ وَذَاتُهُ (تفسیر بغوی ا ص ۵۰) اسم تو مسمی ہی ہے اور اس کا عین ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيٰى (۷ مَرْيَمَ) بے شک ہم آپ کو ایک لڑکے کی خوشخبری سناتے ہیں اس کا نام یَحْیٰی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نام پکارا اور فرمایا: يَا يَحْيٰى اے

یحیٰ ! اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا (۴۰-یُوسُفَ) تم اس کے علاوہ عبادت نہیں کرتے مگر کچھ نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں۔ یہاں اشخاص سے مراد معبود ہیں کیونکہ وہ ان مسمیات کی پوجا کرتے تھے۔

اسماء اللہ الحسنیٰ

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں والی روایت ذکر کرنے کے بعد اس سے استدلال کیا ہے کہ اسم اور ہے اور مسمیٰ اور ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِينَ اِسْمًا بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔

یہاں اسماء تو بہت سارے ہیں، مگر مسمی یعنی جس ذات کے نام ہیں وہ ایک ہی ہے جسے اللہ کہا جاتا ہے۔ پھر بسم اللہ اور تبارک اسم ربک والی آیات کا تقاضا ہے کہ اسم کی اضافت اللہ کی طرف ہو، حالانکہ کسی چیز کی اضافت اس کی ذات کی طرف یہ محال ہوتی ہے، (تفسیر کبیر ج ۱)

اسی طرح ہم بیان کرتے ہیں کہ اسماء عربی اور فارسی ہیں، ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ عربی نام ہے اور خدا فارسی نام ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات عربی اور فارسی ہونے سے پاک ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلِلّٰهِ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوهُ بِهَا (الْأَعْرَافِ: ۱۸۰) اللہ تعالیٰ کے لیے اچھے اچھے نام ہیں، اسے انہی ناموں سے پکارو۔ یہاں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کو اس کے ناموں سے پکاریں۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسم تو دعاء کا آلہ ہے اور جس سے دعا مانگی جارہی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہے معلوم ہوا جس کو پکارا جاتا ہے اور جس لفظ کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے ان دونوں میں مغائرت (یعنی وہ اور ہے اور یہ اور) ہے۔

اسماء کا مسمیات پر واقع ہونا: علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وہ اسماء جو اپنے مسمیات پر واقع ہوتے ہیں وہ نو ہیں، وہ نام جو ذات پر واقع ہو۔ وہ نام جو اپنی ذات کے اجزا میں سے کسی جزء پر واقع ہو، جیسا کہ ہم دیوار کے لیے کہتے ہیں کہ وہ جسم ہے اور جوہر ہے۔

وہ نام جو اپنی صفت حقیقی قائم بالذات کے لحاظ سے کسی چیز پر واقع ہو جیسے ہمارا کسی چیز کے لیے یہ کہنا کہ وہ اَسْوَد (سیاہ) اور اَبْیَض (سفید) حَارٌّ (گرم) اور بَارِدٌ (ٹھنڈی) ہے، کیونکہ سَوَادٌ (سیاہی) بَیَاضٌ (سفیدی) حَرَارَت (گرمی) اور بُرُوْدَت (ٹھنڈک) یہ حقیقی صفات ہیں جو قائم بالذات ہیں ان کا خارجی اشیاء کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ وہ نام جو کسی چیز پر صرف صفت اضافی کے لحاظ سے واقع ہو، جیسے کسی چیز کے لیے ہمارا کہنا کہ یہ معلوم، مفہوم، مذکور، مالک اور مملوک ہے۔

وہ نام جو کسی چیز پر حالت سلبیہ کے لحاظ سے واقع ہو، جیسے ہمارا کسی کو کہنا کہ وہ اعمیٰ (اندھا) اور فقیر ہے اور ہمارا کسی کو یہ کہنا کہ وہ آفات سے محفوظ ہے، خوف سے خالی ہے۔

وہ نام جو صفت حقیقی مع صفت اضافی کے لحاظ سے کسی چیز پر واقع ہو، جیسے ہمارا کسی چیز کے لیے یہ کہنا کہ وہ عالم (جاننے والا) اور قادر (قدرت والا) ہے، کیونکہ جمہور کے نزدیک علم ایک صفت حقیقی ہے اور اس کی اضافت معلومات اور قدرت کی طرف ہے جو کہ صفات حقیقی ہیں اور ان کی اضافت مقدورت کی طرف ہے۔

وہ نام جو صفت حقیقی مع صفت سلبیہ کے لحاظ سے کسی چیز پر واقع ہو، جیسے جیسے ہمارے قول قَادِرٌ لَا یَعْجَزُ عَنْ شَیْءٍ وَعَالِمٌ لَا یَجْهَلُ شَیْئًا قادر وہ ہے جو کسی چیز سے عاجز نہ ہو اور عالم وہ ہے جس سے کوئی چیز اوجھل نہ ہو۔

وہ نام جو صفت اضافی مع صفت سلبیہ کے لحاظ سے کسی چیز پر واقع ہو، جیسے لفظ اوّل، کہ اوّل دو چیزوں سے عبارت ہے ایک یہ کہ وہ اپنے غیر سے پہلے ہو اور وہ صفت اضافی ہو۔ دوسرا یہ کہ اس کا غیر اس سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ صفت سلبیہ ہے۔ جیسے اَلْقَیُّوْمُ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیوم وہ ہے جو قائم بنفسہ ہو اپنے غیر کو قوام دینے والا ہو، تو اس کا قیام بنفسہ یہ ہے کہ وہ اپنے غیر کا محتاج نہ ہو اور اپنے غیر کو قوام دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا غیر اس کا محتاج ہو، اس لیے الاوّل میں سلب ہے اور الثانی میں اضافت ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱)

وہ نام جو صفت حقیقی، اضافی اور سلبی کے مجموعہ کے لحاظ سے کسی چیز پر واقع ہو۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ان نو اقسام کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں کہ اسماء کی اقسام یہی ہیں، خواہ اللہ کا نام ہو یا کوئی اور، ہماری بیان کی ہوئی ان اقسام سے باہر نہیں ہے۔ تفسیر کبیر ج ۱)

لفظ اللہ جل جلالہ

لفظ "اللہ" اللہ کا خاص نام ہے جو ہمارا پروردگار اور رب ہے۔ اللہ اس ذات کا نام ہے جو واجب الوجود ہے، جس میں کمال کی تمام صفات پائی جاتی ہیں، وہ ہر قسم کے نقص، عیب، واہمہ اور شائبہ سے بھی پاک ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ لفظ اللہ اسم اعظم ہے اس لئے کہ تمام عمدہ صفتوں کے ساتھ یہی اسم موصوف ہوتا ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۲۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (سورۃ الحشر آیت ۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔ وہی اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جو بادشاہ ہے پاک ہے، سلامتی والا ہے، امن دینے والا ہے، محافظ ہے، غلبہ والا ہے، زبردست ہے، وہ بڑائی والا ہے، وہ ہر شرک سے اور شرک کی چیز سے پاک ہے۔ وہی اللہ پیدا کرنے والا، مادہ کو بنانے والا، صورت بخشنے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین اور اچھے اچھے نام ہیں، آسمان و زمین کی تمام چیزیں اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ وہ زبردست اور حکمتوں والا ہے۔

ان آیتوں میں تمام نام صفاتی ہیں، اور لفظ اللہ ہی کی صفت۔ دوسری جگہ فرمایا کہ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا (الْأَعْرَافِ: ۱۸۰) اللہ ہی کے لئے ہیں اچھے اور عمدہ عمدہ نام، پس اسے انہی

ناموں کے ساتھ تم پکارو۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے، قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى (الإسراء : ۱۱۰) آپ (ﷺ) فرما دیجیے: اللہ کو پکارو، یا رحمن کو پکارو جس نام سے پکارو، اس کے پیارے پیارے اور اچھے اچھے نام ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ (بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ ایک کم ایک سو جو انہیں یاد کر لے جنت میں داخل ہو گا۔

حدیث میں احصاء کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ہے یاد کرنا، محفوظ رکھنا، محدثین نے احصاء کے مفہوم میں کئی احتمالات ذکر کرتے ہیں، ایک تو احصاء کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس طرح شمار کرے کہ وہ مکمل ذکر کیے جائیں، مطلب یہ کہ صرف بعض ناموں پر اکتفانہ کرے، لیکن جب بھی ان ناموں سے دعا کرے تو مکمل ناموں کے ساتھ ذکر کرے اور ان تمام ناموں کے ساتھ اس کی تعریف و ثناء کرے۔

دوسرا احصاء کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح سے ان ناموں کا ذکر کرے کہ ان کے مقتضیٰ پر عمل کرے، جیسے اگر اَلرَّزَّاقُ پکارتا ہے تو اس کے عطائے رزق پر یقین و اعتماد بھی رکھے، اسی طرح باقی تمام نام ہیں۔ تیسرا احصاء کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی اور مفاہیم کا احاطہ کرے جیسے عرب کا ایک قول ہے فُلَانٌ ذُو حَصَاةٍ اس کا معنی ہے عقل والا۔ اس کے علاوہ احصاء کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ ان اسماء کی پہچان کرے کیونکہ کسی مومن کے علاوہ ان کی پہچان کوئی نہیں کر سکتا اور مومن کے بارے میں تو یہ بات طے ہے کہ وہ جنت میں جائے گا۔

ایک معنی یہ ہے کہ وہ ان ناموں کو درست اعتقاد کے ساتھ شمار کرے کیونکہ دہریہ خالق کا اعتراف نہیں کرتے، اسی طرح فلاسفہ قادر کی قدرت کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی تعظیم کے لیے ان ناموں کو شمار کرے۔ احصاء کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ ان پر عمل کرے، مثال کے طور پر جب وہ اللہ کا نام حکیم لے تو اس کے تمام احکامات کو تسلیم کرے

کیونکہ اس کے سارے احکام مقتضائے حکمت کے مطابق ہیں، جب القدوس پکارے تو اس بات کا استحضار کرے کہ اللہ تعالیٰ تمام عیبوں اور نقائص سے پاک ہے۔

احصاء کا ایک معنی یہ ہے کہ بعض ناموں جیسے رحیم اور کریم کے ذکر کے وقت ان صفات کو اپنائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت محبوب ہے کہ بندہ ان صفات کے ساتھ اپنے کو مزین کرے اور وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں جیسے جبار اور عظیم ان کے ذکر کے وقت بندے پر ضروری ہے کہ وہ ان کا اقرار کرے اور ان کی عظمت کے سامنے اپنے کو جھکا دے اور ان صفات کے ساتھ مزین ہونے کی کوشش نہ کرے، اور جن ناموں میں وعدوں کا معنی پایا جاتا ہے، وہاں تھوڑی دیر ہمیں ان وعدوں کے طمع میں ٹھہرنا چاہیے اور جن ناموں میں ڈراور وعید کا معنی پایا جاتا ہے، یہاں ہم اس کے ڈراور خشیت کے باعث کچھ دیر توقف کریں، حدیث شریف میں موجود لفظ احصاء کا یہ معنی ہے۔

جو شخص ان اسماء کو گنتا ہے اور زبان سے پڑھتا ہے مگر ان کے مقتضا پر عمل نہیں کرتا تو وہ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص قرآن کریم کو یاد کرتا ہے مگر اس میں جو کچھ موجود ہے اس پر عمل نہیں کرتا، نبی کریم ﷺ نے خوارج کے بارے میں فرمایا تھا کہ اِنَّهُم يَقرَؤُونَ الْقُرْآنَ وَلَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ (موطا امام مالک) وہ قرآن پڑھتے ہیں مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا (یعنی اس پر عمل نہیں کرتے)

یہاں کمال درجے کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس سے یہ مفہوم نہیں ہوتا ہے کہ عمل نہ کرنے والے کو پڑھنے اور شمار کرنے کا بھی ثواب نہیں ملتا، پڑھنے اور انہیں شمار کرنے کا ثواب تو اسے ملتا ہے، اگرچہ وہ گنہ گار ہی کیوں نہ ہو، جیسے ایک شخص قرآن کریم پڑھتا ہے تو اسے قرآن کریم پڑھنے کا تو ثواب ملتا ہے اگرچہ پڑھنے والا گنہ گار ہی کیوں نہ ہو۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اسے تلاوت کا ثواب ملتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احصاء کا معنی ہے ان ناموں کو یاد کرنا، علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے نص میں اس بات کے ثبوت کی وجہ سے اظہر قرار دیا ہے، امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب حدیث

کے بعض طرق میں احصاء کی بجائے حَفِظَهَا کے الفاظ ہیں تو اس سے یہی بات سمجھی گئی کہ اس سے مراد انہیں شمار کرنا ہے اور مکمل طور پر انہیں یاد کرنا ہے۔

بعض حضرات نے احصاء کا معنی یہ کیا ہے کہ انہیں قرآن میں تلاش کرے، ابن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اَحصَاهَا کا معنی ہے انہیں شمار کرے اور انہیں یاد کرے، یہ بات اس چیز کو بھی شامل ہے کہ ان ناموں پر ایمان بھی رکھے اور ان کی تعظیم بھی کرے، ان میں شوق وذوق کے اظہار کے ساتھ ان کے معانی کا لحاظ بھی کرے۔

علامہ اصیلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احصاء سے مراد انہیں صرف شمار کرنا نہیں ہے، کیونکہ انہیں شمار تو گنہ گار آدمی بھی کر سکتا ہے، بلکہ اس سے مراد ان پر عمل کرنا ہے۔ علامہ نُعَیم اصفہانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں موجود لفظ احصاء سے مراد اسماء کی تعداد نہیں ہے بلکہ ان پر عمل کرنا اور ان اسماء کے معانی کو سمجھنا ہے اور ان پر ایمان لانا مراد ہے۔

ابو عمر طلمنکی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسماء اللہ اور اس کی صفات کی پوری معرفت یہ ہے کہ ان کے ساتھ دعا کرنے والا اور انہیں یاد کرنے والا ان اسماء کے فوائد اور جن حقیقتوں پر یہ دلالت کرتے ہیں انہیں جانے اور جو ان کو نہیں جانتا وہ ان اسماء کا عالم نہیں ہے اور نہ ہی ان کا ذکر اسے فائدہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی وہ معانی اسے فائدہ دے سکتے ہیں جن پر یہ اسماء دلالت کرتے ہیں۔

ابو العباس بن معد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احصاء دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے، ایک یہ ہے کہ احصاء سے مراد ان اسماء کو کتاب اور سنت سے تلاش کرنا ہے، یہاں تک کہ انہیں ڈھونڈ نکالے اور دوسرا یہ کہ انہیں تلاش کرنے کے بعد یاد کرے، اس بات کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں حفظها کے الفاظ آئے ہیں۔ (فتح الباری)

بہر حال ان ناموں کو درست نیت کے ساتھ یاد کرے، ان کے معانی اور مفاہیم پر پوری توجہ دے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں امید رکھے کہ وہ ان ناموں کی برکت سے اسے جنت میں داخل کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کے چار ہزار نام

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی کے بارے میں مطلقاً فرمایا گیا ہے، حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اپنی اپنی بساط و تلاش کے مطابق ان اسمائے گرامی کو تلاش کیا ہے، پھر انہیں اپنی اپنی تفاسیر میں نقل فرمایا ہے، علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے چار ہزار اسمائے گرامی کے بارے میں ارشاد فرمایا

أَنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى أَرْبَعَةَ آلَافِ اسْمٍ: أَلْفٌ مِّنْهَا فِي الْقُرْآنِ وَالْأَخْبَارِ الصَّحِيْحَةِ وَأَلْفٌ مِّنْهَا فِي التَّوْرَاةِ، وَأَلْفٌ فِي الْإِنْجِيْلِ، وَأَلْفٌ فِي الزَّبُوْرِ وَيُقَالُ: أَلْفٌ آخَرُ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ، وَلَمْ يَصِلْ ذٰلِكَ الْأَلْفُ إِلَى عَالَمِ الْبَشَرِ. (تفسیر کبیر علامہ رازی ج ۱) اللہ تعالیٰ کے چار ہزار نام ہیں۔ ایک ہزار تو قرآن شریف اور صحیح احادیث میں ہیں اور ایک ہزار توراۃ میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار لوح محفوظ میں ہیں اور یہ ایک ہزار عالم بشریت تک نہیں پہنچے۔

اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے کسی اور کا نہیں: اللہ ایسا نام ہے جو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کا نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے، اس کی وجہ مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک عرب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا اشتقاق کیا ہے اس کا باب کیا ہے بلکہ نحویوں کی ایک بہت بڑی جماعت کا خیال ہے کہ یہ اسم جامد ہے اور اس کا کوئی اشتقاق ہے ہی نہیں، قرطبی رحمہ اللہ نے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا یہی مذہب نقل کیا ہے، جن میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ امام خطابی رحمہ اللہ امام غزالی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۲۳)

علامہ خلیل رحمہ اللہ اور سیبویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ أَنَّ الْأَلِفَ وَاللَّامَ فِيْهِ لَازِمَةٌ الف لام اس میں لازم ہے، امام خطابی رحمہ اللہ نے اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ أَلَا تَرَى أَنَّكَ تَقُوْلُ: يَا اللّٰهُ وَلَا تَقُوْلُ: يَا الرَّحْمٰنُ، فَلَوْلَا أَنَّهُ مِنْ أَصْلِ الْكَلِمَةِ لَمَا جَازَ إِدْخَالُ حَرْفِ النِّدَاءِ عَلَى الْأَلِفِ وَاللَّامِ {تفسیر ابن کثیر ۱/ ۱۲۳} کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ لوگ یا اللہ کہتے ہیں مگر

یاالرحمن نہیں کہتے ،اگر یہ الف لام اصل کلمہ میں سے نہ ہوتا توالف لام پر حرف ندا داخل کرنا جائز ہی نہ ہوتا، بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ مشتق ہے اور اس پر روبہ بن عجّاج کا ایک شعر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں

لِلّٰهِ دَرُّ الْغَانِيَاتِ الْمُدَّهِ ... سَبَّحْنَ وَاسْتَرْجَعْنَ مِنْ تَأَلُّهِي

جس میں مصدر التأله، کا بیان ہے جس کا ماضی مضارع أله يأله إلاهة وتألهًا، ہے جیسے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ويذرك وَإِلَاهَتَكَ پڑھتے تھے مراد اس سے عبادت ہے۔ یعنی اس کی عبادت کی جاتی ہے اور وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، بعض نے اس کے مشتق ہونے پر اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ آیت وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ} (الأنعام: ۳) یعنی وہ معبود ہے آسمانوں اور زمینوں میں۔ اور دوسری آیت میں ہے، وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ (الزخرف: ۸۴) یعنی وہی اللہ ہے معبود آسمانوں میں اور زمین میں۔

سیبویہ رحمہ اللہ خلیل رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ اصل میں یہ الہ تھا جیسے فعال پھر ہمزہ کے بدلے الف ولام لایا گیا جیسے "الناس: کہ اس کی اصل "اناس" ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس لفظ کی اصل الاہ ہے الف لام حرف تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے۔ سیبویہ کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے۔ عرب شاعروں کے شعروں میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ جیسے ایک شاعر نے کہا

لَاهِ ابْنُ عَمِّكَ لَا أَفْضَلْتَ فِي حَسَبٍ ... عَنِّي وَلَا أَنْتَ دَيَّانِي فَتَخْزُونِي

کسائی اور فرّا کہتے ہیں کہ اس کی اصل الالہ تھی ہمزہ کو حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے میں ادغام کیا جیسے کہ آیت لَكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّي (الكهف: ۳۸) میں لکن انا کا لکنا ہوا ہے۔ چنانچہ حسن کی قرأت میں لکن انا ہی ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اس کا اشتقاق ولہ سے ہے اور یہ لفظ تحیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور عربی زبان میں ولہ کا معنی ہے عقل کا چلے جانا، عربی محاورے میں یوں کہا جاتا ہے

رجل والہ، وامرأۃ ولھی، وماء مولہ: آدمی جس کی عقل جاتی رہے، عورت جس کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو، بچپن ہی میں مر جاتا ہو اور پانی صحرا میں چھوڑا ہوا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت جاننے کے لئے اھل عقل اور دانش حیران ہیں، اسی لئے ہو سکتا ہے کہ اللہ اسی سے مشتق ہو اور اس کی اصل ولاہ ہو۔ اور واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا جیسے وشاح اور وسادہ میں اشاح اور اسادہ کہتے ہیں۔ (ابن کثیر ۱/۱۲۳)

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کہا گیا ہے اَلْإِلٰهُ مُشْتَقٌّ مِنْ أَلَهْتُ إِلَى فُلَانٍ، أَيْ: سَكَنْتُ إِلَيْهِ، فَالْعُقُولُ لَا تَسْكُنُ إِلَّا إِلَى ذِكْرِهِ وَالْأَرْوَاحُ لَا تَعْرُجُ إِلَّا بِمَعْرِفَتِهِ (کبیر ۱/۱۴۵) یہ لفظ الھت الی فلان سے مشتق ہے جو کہ معنی میں "سکنت" کے ہے۔ یعنی میں نے فلاں سے سکون اور راحت حاصل کی۔ چونکہ عقل کا سکون صرف ذات باری تعالیٰ کے ذکر سے ہے اور روح کی حقیقی خوشی اس کی معرفت میں ہے اس لئے کہ علی الاطلاق کامل وہی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں اسی وجہ سے اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:۲۸) یعنی ایمانداروں کے دل صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لاہ یلوہ سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ چھپ جانے اور حجاب کرنے کے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الہ الفصیل سے ہے چونکہ بندے اسی کی طرف تضرع اور زاری سے جھکتے ہیں اسی کے دامن رحمت کا پلہ ہر حال میں تھامتے ہیں، اس لیے اسے اللہ کہا گیا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ عرب الہ الرجل یالہ اس وقت کہتے ہیں جب اچانک کسی امر سے کوئی گھبرا اٹھے اور دوسرا اسے پناہ دے اور بچالے چونکہ تمام مخلوق کو ہر مصیبت سے نجات دینے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے، اس لیے اس کو اللہ کہتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المومنون:۸۸) یعنی وہی بچاتا ہے اور اس کے مقابل میں کوئی نہیں بچایا جاتا۔

اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ

(النحل: ۵۳) تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں، وہی مطعم ہے یعنی کھانا کھلانے والی ذات حقیقی بھی اللہ ہی کی ہے جیسے ارشاد ربانی ہے وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (الأنعام: ۱۴) وہ کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا۔ وہی موجد ہے یعنی چیزوں کو عدم سے وجود میں لانا والی ذات وہی ہے، جیسے ارشاد فرماتا ہے، قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ [النساء: ۷۸] ہر چیز کا وجود اللہ کی طرف سے ہے۔

رئیس المفسرین امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الْمُخْتَارُ عِنْدَنَا أَنَّ هٰذَا اللَّفْظَ اسْمُ عَلَمٍ لِلّٰهِ تَعَالَى، وَأَنَّهُ لَيْسَ بِمُشْتَقٍّ الْبَتَّةَ، وَهُوَ قَوْلُ الْخَلِيْلِ وَسِيْبَوَيْهِ، وَقَوْلُ أَكْثَرِ الْأُصُولِيِّيْنَ وَالْفُقَهَاءِ، (تفسیر کبیر ج ۱) ہمارے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا اسم علم ہے، یہ یقینی طور پر مشتق نہیں ہے، خلیل اور سیبویہ اور اکثر اصولیوں اور فقہاء کا یہی قول ہے۔

اللہ عربی نام یا سریانی؟: لغت کے اعتبار سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ لفظ اللہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ یہ سریانی یا عبرانی زبان کا لفظ ہے، ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ عبرانی یا سریانی میں یوں کہا جاتا ہے إِلٰهَا رَحْمَانًا وَمُرْحِيَانًا، پھر جب اسے معرّب کیا گیا تو اللّٰهُ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ» بنا دیا گیا، امام رازی رحمہ اللہ نے اسے ناقابل فہم قرار دیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ دو زبانوں کا ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ لفظ اصل میں جس زبان کا ہے اس پر طعن اور تشنیع کی جائے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ نام ذکر کیا ہے، ارشاد ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (لقمان: ۲۵)

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (مریم: ۶۵) کیا تو اس جیسا نام کسی کا جانتا ہے۔

اس سے مراد لفظ اللہ ہے۔ اکثر نے تسلیم کیا ہے کہ لفظ اللہ عربی زبان کا لفظ ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا اسم علم ہے، انہوں نے ان مباحث میں گھسنے سے جان چھڑالی

ہے، لیکن جنہوں نے انکار کیا ہے ان کے دو قول ہیں، کوفی کہتے ہیں کہ اس کا اصل إِلَاہٌ ہے، الف اور لام اس پر تعظیم کے لیے داخل کیے گئے ہیں، یوں یہ لفظ اَلْإِلَاہُ، ہو گیا ہے۔ ہمزہ ثقل کی وجہ سے اور زبانوں پر کثرت سے جاری ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے، اب دو لام جمع ہو گئے تو پہلے کو ادغام کر دیا گیا، یوں اللہ ہو گیا۔ بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا اصل لاہَ ہے، انہوں نے اس کے ساتھ الف لام کو لاحق کیا تو اللہ ہو گیا۔

خصائص اسم اللہ

لفظ اللہ میں جو خصائص پائے جاتے ہیں وہ دوسرے ناموں میں نہیں ہیں، تفسیر کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ نے اس کی ایک مختصر سی جھلک پیش کی ہے، جب کہ میرے استاذ، غزالیٔ دوراں، ترمذیٔ وقت، فخر الاساتذہ، ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جو فتح اللہ بخصائص الاسم اللہ کے نام سے مشہور ہے، جو بڑے سائز کے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، عربی زبان میں ہے اور عرب وعجم میں اس جیسی کتاب ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھی ہے، گویا کہ اسم اللہ کی خوبیوں اور خصائص پر یہ ایک عجمی عالم دین کا مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا اور دائرۃ المعارف ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کے حوالے سے شیخ موسیٰ رحمہ اللہ نے اس کے کچھ خواص کا یوں ذکر کیا ہے۔

پہلی خصوصیت: جب لفظ: اللہ: کے الف کو حذف کیا جائے تو باقی حرف: للہ: رہ جاتا ہے، جو کہ اللہ سبحانہ کی ذات کے ساتھ ہی خاص ہے، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الْفَتْحِ: ۴) آسمانوں اور زمینوں کے لشکر اللہ ہی کے لیے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جل مجدہ ارشاد ہے ،وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الْمُنَافِقُونَ: ۷) آسمانوں اور زمینوں کے خزانے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ اگر اس لفظ سے لام اوّل کو حذف کر دیا جائے تو باقی «لَهُ» رہ جاتا ہے، جیسے قرآن میں ارشاد ہے، لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الزُّمَرِ: ۶۳) اسی کے لیے ہیں چابیاں آسمانوں اور زمینوں کی۔ اسی طرح

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (التَّغَابُنِ: ۱) اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریفیں ہیں۔ اگر اس لفظ کا دوسرا لام بھی حذف کر دیا جائے تو باقی ھو رہ جاتا ہے، یہ بھی اس ذات بزرگ وبرتر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے، قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (الْإِخْلَاصِ: ۱) فرما دیجیے! وہ اللہ ایک ہے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہے، هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (غَافِرٍ: ۶۵) وہی ذات زندہ ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں واؤ کو زائد قرار دیا ہے، جیسے تثنیہ اور جمع میں واؤ گر جاتی ہے اور یہ خصوصیت صرف اسم اللہ کی ہے، باقی ناموں کی نہیں ہے، جس طرح یہ خصوصیت لفظ اللہ کو لفظ کے اعتبار سے حاصل ہے، اسی طرح اس کے معنیٰ کو بھی حاصل ہے، جیسے ایک شخص اللہ تعالیٰ کو رحمن کے نام سے پکارتا ہے تو وہ اس ذات کو اس کی صفت رحمت کے ساتھ موصوف کرتا ہے، اسی طرح کوئی اسے قہار کے نام سے پکارتا ہے تو وہ اس کی صفت قہر کے ساتھ موصوف کرتا ہے، جو اس کے نام العلیم کے ساتھ پکارتا ہے تو وہ اسے اس کی صفت علم کے ساتھ موصوف کرتا ہے، اسی طرح جو اسے اس کے نام قادر کے ساتھ پکارتا ہے تو وہ اس کی صفت قدرت کے ساتھ اسے موصوف کرتا ہے، مگر جب انسان اسے لفظ اللہ کے ساتھ پکارتا ہے تو گویا اس نے اسے اس کی تمام صفات کے ساتھ پکارا ہے، کیونکہ الْإِلٰهَ اس وقت تک الہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان تمام صفات کے ساتھ موصوف نہ ہو، تو معلوم ہوا کہ لفظ اللہ کو وہ خصوصیت حاصل ہے جو باقی ناموں کو حاصل نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت: کلمہ شہادت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُولُ اللّٰهِ کو یہ شان حاصل ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کافر کفر سے اسلام کی طرف آتا ہے اور کفر سے اسلام کی طرف پلٹنے کی صفت صرف اسی نام سے حاصل ہو سکتی ہے، اگر کوئی کافر مسلمان ہونا چاہتا ہے تو وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا الرَّحْمٰن، اسی طرح لَا اِلٰهَ اِلَّا الرَّحِيم، اسی طرح لَا اِلٰهَ اِلَّا المَلِكُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا القُدُّوسُ، وغیرہ پڑھ کر مسلمان ہونا چاہے تو وہ کفر سے نکل نہیں سکتا اور اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا، مگر جب اس نے أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہا تو دائرہ کفر سے نکل آیا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا، تو یہ بات اس

پر دلالت کرتی ہے کہ اس نام کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ کسی اور نام کو حاصل نہیں ہے۔

اسم اللہ سارے ناموں کا سردار: میرے استاذ، شیخ موسیٰ روحانی بازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ اسماء الحسنیٰ کا سردار ہے، یا مطلق تمام ناموں کا سردار ہے، جب تمام ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان میں سب سے پہلے اسی نام کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی لیے بسم اللہ میں بھی پہلے اسی نام کا ذکر ہے، اسی طرح الحمد شریف میں بھی پہلے اسم اللہ کا ذکر ہے، اللہ علم ذات ہے بسم اللہ میں اسم کی اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے، اسی طرح حمد میں اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے لفظ اللہ اس ذات حقیقی کے علاوہ کسی کا نام نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اللہ کامل اور اکمل سردار ہے۔

اسم اللہ سید الاسماء الحسنیٰ ہے اور تمام ناموں کا سردار ہے، جیسے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے سردار ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرات انبیاء کے بعد تمام لوگوں کے سردار ہیں، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ عربوں کے سردار ہیں، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تمام امانت داروں کے سردار ہیں، حضرت عمر اوامر میں سختی کرنے والے تمام لوگوں کے سردار ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تمام حیاداروں کے سردار ہیں، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تمام ججوں کے سردار ہیں اور حضرت ابی بن کعب تمام قاریوں کے سردار ہیں، حضرت فاطمہ تمام جنتی عورتوں کے سردار ہیں، حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ تمام شہیدوں کے سردار ہیں۔ (فتح اللہ ص ۳۹۳)

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں علامہ ابو الفرج علی بن ابراہیم بن احمد حلبی رحمہ اللہ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هَبَطَ عَلَيَّ جِبْرِيْلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّ لِكُلِّ شَيءٍ سَيِّدٌ، فَسَيِّدُ الْبَشَرِ آدَمُ وَأَنْتَ سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَسَيِّدُ الرُّوْمِ صُهَيْبٌ، وَسَيِّدُ فَارِسَ سَلْمَانُ، وَسَيِّدُ الْحَبَشِ بِلَالٌ، وَسَيِّدُ الشَّجَرِ السِّدْرُ، وَسَيِّدُ الطَّيْرِ النَّسْرُ (حلبیہ ج ۱ ص ۳۶)

جبریل میرے پاس آئے، کہنے لگے، اے محمد! ہر چیز کا ایک سردار ہے، انسانوں کے سردار آدم ہیں اولاد آدم کے سردار آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، رومیوں کے سردار صہیب ہیں، ایرانیوں کے سردار سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں،

حبشیوں کے سردار بلال حبشی رضی اللہ عنہ ہیں، درختوں کا سردار بیری کا درخت ہے، پرندوں کا سردار باز ہے۔

بحر العلوم میں مزید یوں ذکر کیا گیا ہے۔ وَسَيِّدُ الْمَلَآئِكَةِ إِسْرَافِيْلُ، وَسَيِّدُ الشُّهَدَآءِ هَابِيْلُ، وَسَيِّدُ الْجِبَالِ جَبَلُ مُوسىٰ، وَسَيِّدُ الْأَنْعَامِ الثَّوْرُ، وَسَيِّدُ الْوُحُوْشِ الْفِيْلُ، وَسَيِّدُ السِّبَاعِ الْأَسَدُ زَادَ بَعْضُهُمْ وَسَيِّدُ الشُّهُوْرِ رَمَضَانُ، وَسَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، وَسَيِّدُ الْكَلَامِ الْعَرَبِيَّةُ، وَسَيِّدُ الْعَرَبِيَّةِ الْقُرْآنُ، وَسَيِّدُ الْقُرْآنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ (بحر العلوم بحوالہ سیرت حلبیہ ج ا ص ۱۳۷) فرشتوں کے سردار حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں، شہداء کے سردار ھابیل ہیں، پہاڑوں کا سردار جبل موسیٰ ہے، جانوروں کا سردار بیل ہے، وحشی جانوروں کا سردار ہاتھی، درندوں کا سردار شیر ہے، بعض نے یہ اضافہ کیا ہے کہ مہینوں کا سردار رمضان ہے، دنوں کا سردار جمعہ ہے، کلاموں کی سردار عربی زبان ہے، عربی زبان کا سردار قرآن کریم ہے، قرآن کریم کی سردار سورۃ البقرہ ہے۔

بحر العلوم کی بیان کردہ تفصیل میں کچھ تأمل ہے۔ کیونکہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الحبائک فی اخبار الملائک میں طبرانی کی روایت نقل کی ہے جس میں حضرت جبریل کو افضل الملائک قرار دیا گیا ہے علامہ سیوطی رحمہ اللہ ایسی روایات لائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جبریل ہی تمام ملائکہ کے سردار ہیں، کیونکہ وہ اللہ کا پیغام حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس وحی کی صورت میں لاتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں قرب ملا، جب کہ اسرافیل کی ڈیوٹی تو صرف قیامت کے روز صور پھونکنا ہے، جس قدر ذمہ داریاں جبریل علیہ السلام کو دی گئیں کسی اور کو نہیں دی گئیں۔ اسی طرح ہابیل کو شہداء کا سردار کہنا بھی محل نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر حمزہ کو شہداء کا سردار قرار دیا ہے۔

اللہ کی حقیقت کوئی نہیں پاسکا: علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وَاعْلَمْ أَنَّ الْخَلْقَ قِسْمَانِ: وَاصِلُوْنَ إِلَىٰ سَاحِلِ بَحْرِ مَعْرِفَتِهِ، وَمَحْرُوْمُوْنَ، فَالْمَحْرُوْمُوْنَ قَدْ بَقُوْا فِي ظُلُمَاتِ الْحَيْرَةِ وَتِيهِ الْجَهَالَةِ فَكَأَنَّهُمْ فَقَدُوْا عُقُوْلَهُمْ وَأَرْوَاحَهُمْ، وَأَمَّا الْوَاجِدُوْنَ فَقَدْ وَصَلُوْا إِلَىٰ عَرْصَةِ النُّوْرِ وَفُسْحَةِ الْكِبْرِيَاءِ وَالْجَلَالِ، فَتَاهُوْا فِي مَيَادِيْنِ الصَّمَدِيَّةِ، وَبَادُوْا فِي عَرْصَةِ الْفَرْدَانِيَّةِ، فَثَبَتَ أَنَّ الْخَلْقَ كُلَّهُمْ وَالِهُوْنَ فِي مَعْرِفَتِهِ، فَلَا جَرَمَ كَانَ

الْإِلٰهُ الْحَقُّ لِلْخَلْقِ هُوَ هُوَ، وَبِعِبَارَةٍ أُخْرٰى وَهِيَ أَنَّ الْأَرْوَاحَ الْبَشَرِيَّةَ تَسَابَقَتْ فِي مَيَادِيْنِ التَّوْحِيْدِ وَالتَّمْجِيْدِ فَبَعْضُهَا تَخَلَّفَتْ وَبَعْضُهَا سَبَقَتْ فَالَّتِي تَخَلَّفَتْ بَقِيَتْ فِي ظُلُمَاتِ الْغُبَارِ وَالَّتِي سَبَقَتْ وَصَلَتْ إِلٰى عَالَمِ الْأَنْوَارِ، فَالْأَوَّلُوْنَ بَادُوْا فِي أَوْدِيَةِ الظُّلُمَاتِ، وَالْآخَرُوْنَ طَاشُوْا فِي أَنْوَارِ عَالَمِ الْكَرَامَاتِ

مخلوق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معرفت الٰہی کے سمندر کے کنارے پر پہنچ گئی، دوسری وہ جو اس سے محروم ہیں جو حیرت کے اندھیروں میں اور جہالت کی پر خار وادیوں میں پڑے ہیں وہ تو اپنی عقلوں اور اپنی روحانی قوتوں کو کھو بیٹھے ہیں لیکن جو ساحل معرفت پر پہنچ چکے ہیں وہ نورانیت کے وسیع باغوں میں جا ٹھہرے، جو کبریائی اور جلال کی وسعت کا اندازہ کر چکے ہیں وہ بھی یہاں تک پہنچ کر حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔

غرض ساری مخلوق اس کی پوری معرفت سے عاجز اور سرگشتہ و حیران ہے۔ پس یقیناً مخلوق کا سچا معبود وہی ہے، دوسرے انداز میں یوں کہہ لیجیے کہ انسانی ارواح توحید اور تمجید کے میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتی ہیں، ان میں سے بعض آگے بڑھ جاتی ہیں اور بعض پیچھے رہ جاتی ہیں، اس دوڑ میں جو پیچھے رہ جاتی ہیں وہ گرد و غبار کے اندھیروں میں رہ جاتی ہیں اور جو آگے بڑھ جاتی ہیں وہ روشنیوں کے جہان میں پہنچ جاتی ہیں، پہلے والی روحیں اندھیری وادیوں میں سرگرداں رہتی ہیں اور دوسری روحوں کی کرامات کے جہان میں عقلیں گم ہو جاتی ہیں۔ (تفسیر کبیر ۱:۴۶)

ان معانی کی بناء پر اس پاک ذات کا نام اللہ ہے، ساری مخلوق اس کی محتاج ہے، اس کے سامنے جھکنے والی اور اس کی تلاش کرنے والی ہے، اس حقیقت کی وجہ سے اسے اللہ کہتے ہیں، جیسا کہ خلیل کا قول ہے عرب کے محاورے میں ہر اونچی اور بلند چیز کو "لاہ" کہتے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تب بھی وہ کہتے ہیں لاھتِ الشمس چونکہ پروردگار عالم بھی سب سے بلند و بالا ہے اس لیے اس کو اللہ کہتے ہیں۔ اور الہ کے معنی عبادت کرنے اور تالہ کے معنی حکم برداری اور قربانی کے ہیں اور ربِّ عالم کی عبادت کی جاتی ہے اور اس کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں۔

اسم اعظم

اسماء اللہ الحسنیٰ کے تذکرے میں یہ بحث بھی ہوتی رہی ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی نام کو کسی نام پر فضیلت دی جاسکتی ہے ؟ کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے بعض ناموں کو بعض پر فضیلت دینے سے انکار کیا ہے اور بعض نے کچھ اسماء کو اسم اعظم کہا ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے تمام نام اسم اعظم کے ساتھ موصوف ہوسکتے ہیں، ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا کہ اعظمیت کا ذکر ذکر جن احادیث میں آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس نام کے ساتھ دعا مانگنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد پڑھنے والے کو ثواب کا زیادہ ملنا ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اسم اعظم سے مراد اللہ تعالیٰ کا ہر وہ نام ہے جس کے ساتھ بندہ پوری توجہ کے ساتھ دعا مانگتا ہے، ایسی توجہ کہ اس دوران اس کے خیال میں کسی غیر کا تصور تک نہ ہو، جب اس طرح بندہ دعا مانگے تو اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، بعض یہ کہتے ہیں کہ اسم اعظم اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے مخلوق میں سے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی۔

مختلف روایات میں راویان حدیث نے مختلف ناموں کو اسم اعظم کہا ہے، فتح الباری میں مختلف اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ اسم اعظم :ھو: ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے بعض اہل کشف سے نقل کیا ہے اور اسی کو دلیل بنایا ہے کہ جو شخص کسی بڑے آدمی سے بات کرے تو اس کے سامنے وہ یوں نہیں کہتا کہ أَنْتَ قُلْتَ كَذَا تو نے ایسا کہا بلکہ وہ اس کے ادب کا خیال کرتے ہوئے هُوَ يَقُولُ کہتا ہے۔

لفظ اللہ اسم اعظم ہے، کیونکہ یہ ایسا نام ہے جو اس کے غیر کے لیے نہیں بولا جاتا۔ اسم اعظم اللہ الرحمن الرحیم ہے، اس کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کر رہے تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِاسْمِكَ الطَّاهِرِ الطَّيِّبِ الْمُبَارَكِ الْأَحَبِّ إِلَيْكَ، الَّذِي إِذَا دُعِيتَ بِهِ أَجَبْتَ، وَإِذَا سُئِلْتَ بِهِ أَعْطَيْتَ، وَإِذَا اسْتُرْحِمْتَ بِهِ رَحِمْتَ، وَإِذَا اسْتُفْرِجَتَ بِهِ فَرَّجْتَ قَالَتْ: وَقَالَ ذَاتَ يَوْمٍ: يَا عَائِشَةُ هَلْ عَلِمْتِ أَنَّ اللهَ قَدْ دَلَّنِي عَلَى الِاسْمِ الَّذِي

إِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ؟ قَالَتْ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي فَعَلِّمْنِيهِ، قَالَ: إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي لَكِ يَا عَائِشَةُ، قَالَتْ: فَتَنَحَّيْتُ وَجَلَسْتُ سَاعَةً، ثُمَّ قُمْتُ فَقَبَّلْتُ رَأْسَهُ، ثُمَّ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ عَلِّمْنِيهِ، قَالَ: إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي لَكِ يَا عَائِشَةُ أَنْ أُعَلِّمَكِ، إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي لَكِ أَنْ تَسْأَلِي بِهِ شَيْئًا مِنَ الدُّنْيَا، قَالَتْ: فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ، ثُمَّ صَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ قُلْتُ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَدْعُوكَ اللهَ، وَأَدْعُوكَ الرَّحْمٰنَ، وَأَدْعُوكَ الْبَرَّ الرَّحِيمَ، وَأَدْعُوكَ بِأَسْمَائِكَ الْحُسْنَى كُلِّهَا، مَا عَلِمْتُ مِنْهَا، وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، أَنْ تَغْفِرَ لِي وَتَرْحَمَنِي، قَالَتْ: فَاسْتَضْحَكَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّهُ لَفِي الْأَسْمَاءِ الَّتِي دَعَوْتِ بِهَا (ابن ماجہ)

اے میرے اللہ! میں تجھ سے تیرے پاکیزہ، مبارک، تجھے سب سے زیادہ محبوب نام کے ساتھ سوال کرتا ہوں، وہ نام کہ جب اس کے ذریعے تجھ سے دعا کی جائے تو تُو قبول کرتا ہے اور جب تجھ سے اس نام کے ذریعے سوال کیا جائے تو تُو دیتا ہے اور جب تجھ سے اس نام کے ساتھ رحم کی درخواست کی جائے تو تُو رحم کرتا ہے اور جب اس کے ذریعے تجھ سے مشکل کشائی کا سوال کیا جائے تو تو مشکل کو کھول دیتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! کیا تو جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ایک نام پر راہنمائی کی ہے کہ جب اس کے ساتھ اسے پکارا جائے تو وہ دعا قبول کرتا ہے؟ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں مجھے بھی سکھایئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! وہ تیرے لیے مناسب نہیں ہے، فرماتی ہیں کہ میں وہاں سے ہٹ گئی اور کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر میں اٹھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کا بوسہ لیا، پھر میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے وہ نام سکھایئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! وہ تیرے لیے مناسب نہیں ہے کہ میں تجھے سکھاؤں، تیرے لیے مناسب نہیں ہے کہ تو اس کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز مانگے، فرماتی ہیں کہ پھر میں اٹھی، میں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر میں نے کہا: اے میرے اللہ! میں تجھے اللہ پکارتی ہوں، میں تجھے رحمن پکارتی ہوں، میں تجھے برّ الرحیم پکارتی ہوں، میں تجھے تیرے سارے اچھے اچھے ناموں سے پکارتی ہوں، ان میں سے جو میں جانتی ہوں اور جو میں نہیں

جانتی، یہ کہ تو مجھے معاف کر دے اور مجھ پر رحم کر، فرماتی ہیں کہ اس پر آپ ﷺ ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ وہ ان ناموں میں موجود ہے جن کے ساتھ تو دعا مانگتی ہے۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اسم اعظم ہے، جیسا ترمذی میں حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسم اعظم ان دو آیات میں ہے، وہ آیات یہ ہیں، وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اور تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے وہ رحمن اور رحیم ہے۔ اور سورۃ آل عمران کے شروع کی آیت اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (ترمذی)

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اسم اعظم ہے، ابن ماجہ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اسم اعظم تین سورتوں میں ہے، سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران اور سورۃ طٰہٰ میں، راوی کہتے ہیں کہ میں نے تلاش کیا تو مجھے یہی دو نام معلوم ہوئے، امام رازی رحمہ اللہ نے اسے مضبوط قرار دیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ یہ دونوں نام عظمت اور ربوبیت کی صفات پر دلالت کرتے ہیں، ان کے علاوہ کوئی اس پر ان دو کی طرح دلالت نہیں کرتا۔ اَلْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ذُوْ الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یہ اسم اعظم ہے، مسند احمد، مستدرک حاکم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ نام ہیں، ابن حبان نے اسے درست قرار دیا۔

بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ذُوْ الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اسم اعظم ہے، مسند ابو یعلیٰ میں سری بن یحی نے طے قبیلے کے ایک آدمی سے روایت کی ہے اور اس کی تعریف کی ہے، اس نے کہا كُنْتُ أَسْأَلُ اللّٰهَ أَنْ يُرِيَنِي الِاسْمَ الْأَعْظَمَ فَأُرِيْتُهُ مَكْتُوْبًا فِي الْكَوَاكِبِ فِي السَّمَاءِ (فتح الباری) میں اللہ سے سوال کرتا تھا کہ وہ مجھے اسم اعظم دکھائے، چنانچہ مجھے آسمانی ستاروں میں وہ لکھا ہوا دکھایا گیا ذُوْ الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اسم اعظم ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ترمذی میں روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو یاذا الجلال والاکرام کہتے ہوئے سنا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سے مانگ تیری دعا قبول کی جائے گی۔

امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ تمام ان معتبر صفات پر مشتمل ہے جو الوہیت پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ جلال میں تمام اسلوب کی طرف اشارہ ہے جب کہ اکرام میں تمام اضافات کی طرف اشارہ ہے۔

اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ یہ اسم اعظم ہے، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حِبّان اور حاکم میں حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے لحاظ سے اسے تمام روایات میں راجح قرار دیا ہے۔

رَبِّ رَبِّ رَبِّ اسم اعظم ہے، حاکم نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسْمُ اللّٰهِ الْأَكْبَرُ رَبِّ رَبِّ کے الفاظ نقل کیے ہیں، ابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ جب بندہ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَبَّيْكَ عَبْدِي سَلْ تُعْطَ میرے بندے میں حاضر ہوں، مانگ تجھے دیا جائے گا۔ یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طریقوں سے ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا اسم اعظم ہے، نسائی اور حاکم نے حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ جو بھی مسلمان بندہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کریں گے۔

حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ اللہ مجھے اسم اعظم سکھادے، پھر انہیں خواب میں یہ کلمات دکھائے گئے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ اسماء الحسنیٰ میں اسم اعظم پوشیدہ ہے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دعا کے بعد فرمایا تھا کہ اے عائشہ! جن ناموں کے ساتھ تو نے دعا مانگی ہے، اسم اعظم انہی میں سے ایک ہے۔ کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ اسم اعظم ہے، جیسے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۱، ۲۲۵)

علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ نے روایات سے ثابت شدہ اسم اعظم کا تذکرہ اپنی نظم نونیہ میں یوں کیا،

وَلِأَجْلِ ذَا جَاءَ الْحَدِيْثُ بِأَنَّهُ ... فِي آيَةِ الْكُرْسِي وَذِي عِمْرَانَ
اسْمُ الْإِلٰهِ الْأَعْظَمِ اشْتَمَلَا عَلَى ... اسْمِ الْحَيِّ وَالْقَيُّوْمِ مُقْتَرِنَانِ
فَالْكُلُّ مَرْجِعُهَا إِلَى الِاسْمَيْنِ يَدْ ... رِي ذَاكَ ذُو بَصَرٍ بِهٰذَا الشَّانِ.

(لوامع الانوار البہیہ ج ا ص ۳۶، الکافیہ الشافیہ، ص ۳۷)

اسی لیے تو حدیث میں آیا ہے کہ آیۃ الکرسی اور آل عمران میں اللہ کا اسم اعظم موجود ہے، اسی طرح حی اور قیوم دو نام جڑے ہوئے ہیں، پس سب ناموں کا مرجع یہی دو نام ہیں، آنکھوں والا انہی دو ناموں کو اسم اعظم سمجھتا ہے

اسم اعظم کو مخفی رکھنے کی وجوہات

اسم اعظم کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نام کی عظمت کے باعث عقلوں سے اسے پوشیدہ رکھا ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الدر المنظم میں اس کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح لیلۃ القدر اور صلوٰۃ الوسطیٰ کو پوشیدہ رکھا ہے اسی طرح اسم اعظم کو بھی پوشیدہ رکھا ہے، علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب روض الانف میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر یوں کوئی کہے کہ یہ قرآن میں کہاں ہے؟ تو اسے یہ کہا جائے گا کہ جس طرح جمعہ میں ایک ساعت کو مخفی رکھا گیا ہے، رمضان میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا گیا ہے، تا کہ لوگ صرف اسی گھڑی یا اسی رات پر بھروسہ نہ کر لیں، اسی طرح اسم اعظم کو بھی مخفی رکھا گیا ہے۔

میرے استاذ، شیخ موسیٰ روحانی رحمہ اللہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب فتح اللہ میں لکھتے ہیں کہ کشف اور الہام کے علاوہ کوئی بھی اسم اعظم کو نہیں جان سکتا اور نہ ہی کسی امانت دار، اخلاق اللہ سے متصف، زاہد فی الدنیا کے علاوہ کسی کو علم ہو سکتا ہے، جس کا ہم اور غم صرف اور صرف آخرت کی زندگی ہے، تا کہ وہ اسے دنیائے فانی کے لیے استعمال نہ کرے، یوں پھر وہ کہیں دونوں جہانوں کی سعادتوں سے محروم نہ ہو جائے، اسی لیے علماء اولیاء اسم اعظم کا علم رکھنے کے باوجود اپنے ساتھیوں سے اسے مخفی

رکھتے تھے اور وہ سوائے خوف خدا رکھنے والوں کے کسی کو اس کی اطلاع تک نہیں ہونے دیتے تھے، جیسے حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ نے اپنے بعض خواص اور خدام کی طرف سے اس میں خیانت کرنے کی وجہ سے اسم اعظم کسی کو بھی بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ نے روض الریاحین کے حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک فقیر ایک بزرگ کے پاس آیا، جو اسم اعظم جانتا تھا، فقیر نے ان سے کہا: کہ مجھے اسم اعظم کے بارے میں بتائیں، انہوں نے اس سے پوچھا: کیا تیرے اندر اس کی اھلیت ہے؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے اسے کہا: کہ تو شہر کے دروازے کی طرف چلا جا اور وہاں جا کر بیٹھ، وہاں جو بات بھی پیش آئے مجھے اس سے آگاہ کرنا، وہ فقیر ان کے حکم پر چلا گیا جہاں جانے کا انہوں نے اسے حکم دیا تھا، وہاں اس نے شیخ حطاب کو دیکھا جو اپنے گدھے پر لکڑیاں لادے آرہا تھا، سپاہی کا اس کے ساتھ معاملہ بن گیا، جس نے لکڑی سے اس کی پٹائی کر دی، پھر یہ فقیر غم کا مارا بزرگ کے پاس واپس آیا اور اسے سارا قصہ کہہ سنایا، بزرگ نے اس سے پوچھا: اگر تو اسم اعظم جانتا تو تُو اس سپاہی کے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ اس فقیر نے کہا کہ میں اس کی ہلاکت کی بد دعا کرتا، بزرگ نے اسے فرمایا: کہ یہی شیخ حطاب تھا جس نے مجھے اسم اعظم سکھایا تھا۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اسم اعظم کی وہ آدمی صلاحیت رکھتا ہے جو ان صفات سے متصف ہو، یعنی صبر حلم، مخلوق کے ساتھ مہربانی اور تمام عمدہ صفات جن سے برگزیدہ لوگ متصف ہوتے ہیں۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ نے کتاب الاذکیا میں ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ اسم اعظم جانتے تھے، یوسف بن حسین رحمۃ اللہ مصر میں ان کے پاس گئے اور ان کی ایک سال خدمت کی، پھر انہوں نے ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کو کہا کہ اے میرے استاذ! میں نے سال بھر آپ کی خدمت کی ہے، آپ کے ذمہ میرا حق ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اسم اعظم جانتے ہیں، آپ مجھے جانتے ہیں اور میرے سوا کوئی ایسا نہیں کہ آپ اسے یہ بتائیں، میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتادیں، ذوالنون نے

ان کی یہ بات سن لی، خاموش ہو گئے اور انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔

گویا انہوں نے انہیں اسم اعظم بتانے کا اشارہ کر دیا، اس کے بعد چھ ماہ تک ان سے رسم وراہ نہ رہی، پھر ایک دن ذوالنون مصری نے برتن نکالا جس کا منہ رومال کے ساتھ بند تھا، ان دنوں ذوالنون مصری جیزہ میں قیام پذیر تھے، یوسف حسین کو فرمانے لگے کہ جانتے ہو فسطاط میں ہمارا ایک دوست رہتا ہے، انہوں نے کہا کہ جی ہاں! ذوالنون نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ یہ برتن ان تک پہنچا آؤ، یوسف حسین نے یہ برتن لیا اور ایک لمبے سفر پر روانہ ہوئے۔

سارے راستے میں اس برتن کے بارے میں فکر رہی کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے، کہ ذوالنون مصری جیسے عظیم آدمی نے آخر اس برتن میں کیا چیز روانہ کی ہے، انہیں صبر نہیں آسکا، ابھی انہوں نے پل عبور نہیں کیا تھا کہ اس برتن کے اوپر بندھا ہوا رومال کھول ڈالا، برتن کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں ایک چوہا تھا، جو نکل کر بھاگ گیا، یوسف غصے میں لال پیلے واپس ذوالنون مصری رحمۃ اللہ کے پاس آئے، انہیں آکر کہنے لگے کہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ نے میرے ساتھ مذاق کیا، میرے جیسے آدمی کو چوہا دے کر بھیجا، اسی غصے میں لوٹ آئے، جب ذوالنون مصری رحمۃ اللہ نے ان کے چہرہ کا اڑا ہوا رنگ دیکھا تو انہیں کہنے لگے، اے بے وقوف! ہم تو اس چوہے کے ذریعے تمہاری امانت داری دیکھ رہے تھے، مگر تم نے تو ہمارے ساتھ خیانت کی ہے، کیا ہم تجھے اسم اعظم کی امانت سپرد کر دیں؟ خبر دار ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ۔ (تاریخ بغداد ج ۱۶ ص ۴۶۲)

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ نے فتح اللہ میں ساٹھ سے زیادہ اقوال ذکر کیے ہیں، جن میں اسم اعظم کا ذکر کیا گیا ہے اور پچاس سے زائد صفحات پر اسم اعظم کی بحث کی ہے، فتح اللہ کے ایک سو ایک نمبر باب میں اسم اعظم کا ذکر کرتے ہوئے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ نے اشارہ کیا کہ اسم اعظم پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جسے اس کتاب کے آخری باب میں شامل کر دیا ہے اور فتح اللہ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس موضوع پر آج تک کسی نے مستقل کتاب نہیں لکھی ہے۔

جھاڑ پھونک میں استعمال ہونے والے نام

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جھاڑ پھونک میں استعمال ہونے والے ناموں کی تاثیر کا ذکر کرنے سے پہلے ایک عجیب اور لطیف بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہم طلسمات وعزائم کی کتابوں میں ایسے اذکاراورایسے منتر دیکھتے ہیں جو غیر معلوم ہوتے ہیں منتروں کا تو مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، جیسے غیر معلوم الفاظ کی کتابت بھی غیر معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتابت الفاظ کی طرف راہنمائی کرتی ہے اوراس میں بھی کوئی شک نہیں کہ الفاظ صورت ذہنی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، مگران تعویذوں، منتروں میں توکسی چیز کی طرف بالکل ہی راہنمائی نہیں ہوتی، اس لیے ان میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

اگر ان سے کسی چیز کی طرف راہنمائی ہوتواس کی پھر دوصورتیں ہیں، یاتووہ راہنمائی اللہ کی صفات، تعریف اور کبریائی کی طرف ہوگی یاکسی اور چیز کی طرف ہوگی، اگران کی راہنمائی اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف ہوتوپھر یہ مفید نہیں ہے، کیونکہ غیر اللہ کاذکر ترغیب اور ترھیب دونوں اعتبار سے مفید نہیں ہے، اس کے علاوہ اب یہی بات رہ جاتی ہے کہ یوں کہاجائے کہ ان کی راہنمائی اللہ کے ذکر، مدح اور ثناء کی صفات کی طرف ہو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ذکر اللہ کی اقسام مضبوط ہیں توپھران پر زیادتی ممکن نہیں ہے، اس لیے ان کلمات کی بہترین حالتیں یہ ہیں کہ یہ کلمات بھی انہی دعاؤں کی جنس سے ہوں، ہاں زبان اور لغت کے لحاظ سے جو اختلافات پڑگئے ہیں وہ قلیل الاثر ہیں، توضروری ہے کہ یہ معلوم اذکار ان مجہول اذکار پر زیادہ اثر انداز ہوں۔

لیکن کہنے والے کویوں کہنے دیجیے کہ اکثر مخلوق کے نفوس ناقص اور قاصر ہیں، جب وہ ان معلوم اذکار کو پڑھتے ہیں اوران کے ظواہر کو سمجھ لیتے ہیں اوران کے نفوس مضبوط، روشن، الٰہیہ نہیں ہوتے توالٰہیات سے وہ قوی نہیں ہوتے اور ان کے نفوس ان جسمانیات سے جدا بھی نہیں ہوتے، اس لیے ان کے نفوس میں تاثیری قوت اور قدرت حاصل نہیں ہوتی۔

بہر حال جب وہ ان مجہول الفاظ کو پڑھ لیتے ہیں اوران میں سے کوئی چیز سمجھتے نہیں تو پھر انہیں وہم پڑتے ہیں، یہ عالی کلمات ان نفوس پر خوف، گھبراہٹ مسلط کر دیتے ہیں، اس وجہ سے انہیں عالم جسم سے الگ ہونے اور عالم قدس کی طرف توجہ کی ایک قسم حاصل ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے ان کے نفوس کو تاثیر پر مزید قوت اور قدرت حاصل ہو جاتی ہے، امام رازی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ میں نے ان مجہول منتروں سے پایا ہے۔

اس تمہید کے بعد علامہ رازی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ مخلوق اوراسماء اللہ کے درمیان عجیب مناسبات ہیں ان مناسبات کالحاظ رکھنے والے عامل کو یقیناً ذکر سے فائدہ ملتا ہے، اس باب کی شرح میں کلام ایک عقلی مقدمہ پر مبنی ہے اوروہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک انسانی نفوس ناطقہ جوہر اور ماہیت کے لحاظ سے مختلف ہیں، ان میں بعض الٰہیہ، روشن، آزاد اور شریف ہیں اوران میں سے بعض سُفلی، ظلمانی، حقیر، خسیس اوران میں بعض رحیم، عظیم الرحمۃ، بعض ان میں سخت، بعض ان میں ان جسمانیات سے تھوڑی محبت اور میلان رکھنے والے ہیں، بعض ان میں ریاست کے ساتھ محبت رکھنے اوراس پر تسلط رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، جن لوگوں نے مخلوق کے حالات کالحاظ رکھا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ معاملہ اس طرح ہے جیسے ہم نے لکھ دیا ہے، ہم ان احوال کو نفوس کے جواہر کے لیے لازمی خیال کرتے ہیں اورہر وہ شخص جس نے ان احوال کی رعایت کی اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے لیے ارادے، ناپسندیدگی، ترغیب اورترھیب کا ایک متعین منہج ہے اورایک واضح راستہ ہے۔

ریاضت، مجاہدہ نفوس کے احوال اصلیہ اور مناہج طبعیہ کو تبدیل نہیں کرسکتے، ہاں ریاضیت کی تاثیر ان اخلاق میں اضافہ کرسکتی ہے، مگر انسان پر مسلط نہیں ہوسکتی، ہاں اگر یہ کسی دوسری صفت میں بدل جائے تو یہ محال ہے، اسی کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا: اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ انسان کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: اَلْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ، روحیں (ایسی ہیں جیسے) ایک دوسرے کے ساتھ جمی ہوئی فوجیں ہیں۔ یعنی انسانوں کی روحیں ایک خاص ربط اور مناسبت رکھتی ہیں، جو روحیں ایک

دوسرے سے موافقت رکھتی ہیں وہ قریب ہو جاتی ہیں اور جو اختلاف رکھتی ہیں وہ الگ ہو جاتی ہیں۔

جب آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی تو پھر ہمیں کہنے دیں، کہ جنسیت ضم کی علت ہے، پس اسماء اللہ میں سے ہر نام ایک معین معنی پر دال ہے، ہر نفس پر یہ معنی غالب ہے، اس نفس کی اس نام کے ساتھ سخت مناسبت ہو گی، جب اس نے اس نام کے ذکر پر ہمیشگی کی تو اس سے جلد نفع اٹھائے گا، میں نے شیخ ابو نجیب بغدادی سہروردی کو سنا، وہ اپنے مرید کو جس قدر مصلحت سمجھتے تھے ایک یا دو بار اربعین پڑھنے کا حکم دیتے تھے، پھر اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام پڑھا کرتے تھے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے تھے، جب اس کے چہرے پر اس پڑھنے کا اثر نہ دیکھتے تو اسے کہتے کہ بازار کی طرف چلا جا اور وہاں دنیوی کام میں مشغول ہو جا، کیونکہ تو اس راستے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اور اگر اسم خاص کو سنتے وقت اس کے چہرے پر تاثر دیکھتے تو اسے اس ذکر پر ہمیشگی کی تلقین کرتے، میں یہ کہتا ہوں کہ یہ معقول بات ہے، اس لیے کہ جب نفوس مختلف ہیں تو ہر ایک ان میں سے ایک مخصوص حالت کے مناسب ہے، جب یہ نفس اس حالت کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے جو اس کے مناسب ہے تو پھر اس کا قوت سے فعل کی طرف نکلنا سہل اور آسان ہو گا۔ (تفسیر کبیر جلد اول)

علاج وسوسہ: امام رازی رحمہ اللہ نے ایک عجیب لطیفہ ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرید نے بہت زیادہ وسوسوں کی شکایت کی تو استاذ نے اس کے جواب میں فرمایا:

كُنْتُ حَدَّادًا عَشْرَ سِنِيْنَ، وَقَصَّارًا عَشَرَةً أُخْرَى، وَبَوَّابًا عَشَرَةً ثَالِثَةً، فَقَالُوْا: مَا رَأَيْنَاكَ فَعَلْتَ ذٰلِكَ، قَالَ: فَعَلْتُ وَلٰكِنَّكُمْ مَا رَأَيْتُمْ، أَمَا عَرَفْتُمْ أَنَّ الْقَلْبَ كَالْحَدِيْدِ؟ فَكُنْتُ كَالْحَدَّادِ أُلَيِّنُهُ بِنَارِ الْخَوْفِ عَشْرَ سِنِيْنَ، ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ شَرَعْتُ فِي غَسْلِهِ عَنِ الْأَوْضَارِ وَالْأَقْذَارِ عَشْرَ سِنِيْنَ، ثُمَّ بَعْدَ هٰذِهِ الْأَحْوَالِ جَلَسْتُ عَلَى بَابِ حُجْرَةِ الْقَلْبِ عَشَرَةً أُخْرَى سَالًّا سَيْفَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَلَمْ أَزَلْ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْهُ حُبُّ غَيْرِ اللّٰهِ، وَلَمْ أَزَلْ حَتّٰى يَدْخُلَ فِيهِ حُبُّ اللّٰهِ تَعَالَى، فَلَمَّا خَلَتْ عَرْصَةُ الْقَلْبِ عَنْ غَيْرِ اللّٰهِ تَعَالَى وَقَوِيَتْ فِيهِ مَحَبَّةُ اللّٰهِ سَقَطَتْ مِنْ بِحَارِ عَالَمِ الْجَلَالِ قَطْرَةٌ مِنَ النُّوْرِ فَغَرِقَ

الْقَلْبُ فِي تِلْكَ الْقَطْرَةِ، وَفَنِيَ عَنِ الْكُلِّ، وَلَمْ يَبْقَ فِيهِ إِلَّا مَحْضُ سِرِّ «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ (تفسیر کبیر ج ۱)

میں دس سال لوہار رہا، دوسرے دس سال میں دھوبی رہا، تیسرے دس سال میں چوکیدار رہا، مریدوں نے کہا کہ ہم نے تو آپ کو یہ کام کرتے نہیں دیکھا، استاذ نے کہا: میں نے یہ کام کیے ہیں مگر تم نے نہیں دیکھا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ دل لوہے کی طرح ہے؟ تو میں لوہار کی طرح تھا، میں دس سال دل کو خوف کی آگ سے نرم کرتا رہا، پھر دس سال میں اسے گندگیوں اور میلوں سے دھوتا رہا، پھر ان حالات کے بعد دس سال میں کمرۂ دل کے دروازے پر لا الہ الا اللہ کی بے نیام تلوار لے کر بیٹھ گیا، میں اس وقت تک اس طرح بیٹھا رہا جب تک اس سے غیر اللہ کی محبت نکل نہیں گئی، اس وقت تک میں نے اس طرح کیا جب تک اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں داخل ہوئی جب دل غیر اللہ سے خالی ہو گیا، اللہ کی محبت اس میں مضبوط ہو گئی، تو عالم جلال کے سمندر سے ایک قطرۂ نور اس میں ٹپکا، پھر دل اس قطرہ میں ڈوب گیا اور سب فنا ہو گیا اور اس میں صرف لا الہ الا اللہ کا راز ہی باقی رہا۔

لطائف اور فوائد

مفسر قرآن، علامہ فخر الدین امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں کچھ فوائد و لطائف بیان فرمائے ہیں۔

پہلا فائدہ: مقروض آدمی کی عادت یہ ہے کہ جب وہ قرض دینے والے کو دور سے دیکھتا ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے، اللہ کریم فرماتے ہیں، اے میرے بندو! تم اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے میرے مقروض ہو، لیکن تم مجھ سے بھاگو مت، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ فَفِرُّوْا إِلَى اللهِ (الذّٰرِیَات: ۵۰) تم اللہ کی طرف بھاگو۔ فَإِنِّي أَنَا الَّذِي أَقْضِي دُيُونَكُمْ وَأَغْفِرُ ذُنُوبَكُمْ، پس بے شک میں ہی وہ ہوں جو تمہارے قرض اتاروں گا اور تمہارے گناہ معاف کروں گا اور یہ بات بھی ہے کہ بادشاہ اپنے دروازوں کو فقیروں پر بند کر دیتے ہیں اور مالداروں پر بند نہیں کرتے، جب کہ میں اس کے برعکس کرتا ہوں۔

دوسرا فائدہ: رحمت کائنات، فخر دو عالم، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى مِائَةَ

رَحْمَةٍ أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَّاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ فَبِهَا يَتَعَاطَفُونَ وَيَتَرَاحَمُونَ، وَ أَخَّرَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، (تفسیر کبیر للرازی)

بے شک اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک رحمت اس نے جنوں، انسانوں، پرندوں، چوپاؤں، کیڑوں مکوڑوں کے لیے اتاری، اس کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نرمی کا اظہار کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ رحم والا معاملہ کرتے ہیں اور باقی ننانوے رحمتیں وہ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم کرے گا۔ (تفسیر کبیر علامہ رازی ج ا ص ۱۴۸)

امام رازی رحمۃ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھانے کے لیے فرمائی ہے، ورنہ اس کے دریائے رحمت تو نہ ختم ہونے والے ہیں، اس صورت میں کسی معین حد کے ساتھ اس کو محدود کرنا سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تیسرا فائدہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن گناہگاروں کو فرمائیں گے، هَلْ أَحْبَبْتُمْ لِقَائِي؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ يَا رَبِّ، فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: وَلِمَ؟ فَيَقُولُونَ: رَجَوْنَا عَفْوَكَ وَفَضْلَكَ، فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: إِنِّي قَدْ أَوْجَبْتُ لَكُمْ مَغْفِرَتِي.

کیا تم میرے ساتھ ملاقات کو پسند کرتے ہو؟ گناہگار بندے کہیں گے، ہاں، اے ہمارے رب! اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، تم میرے ساتھ ملاقات کرنے کو کیوں پسند کرتے ہو؟ گناہگار بندے کہیں گے، ہمیں تجھ سے معافی کی امید ہے اور تجھ سے تیرے فضل کی امید ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، پکی بات یہ ہے کہ میری مغفرت تمہارے لیے ضروری ہو گئی ہے۔

چوتھا فائدہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَنْشُرُ عَلَى بَعْضِ عِبَادِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ سِجِلًّا كُلُّ وَّاحِدٍ مِنْهَا مِثْلُ مَدِّ الْبَصَرِ فَيَقُوْلُ لَهُ: هَلْ تُنْكِرُ مِنْ هٰذَا شَيْئًا؟ هَلْ ظَلَمَكَ الْكِرَامُ الْكَاتِبُونَ؟ فَيَقُولُ: لَا يَا رَبِّ، فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: فَهَلْ كَانَ لَكَ عُذْرٌ فِي عَمَلِ هٰذِهِ الذُّنُوبِ؟ فَيَقُولُ:

لَا يَا رَبِّ، فَيَضَعُ ذَلِكَ الْعَبْدُ قَلْبَهُ عَلَى النَّارِ فَيَقُولُ اللّٰهُ تَعَالَى: إِنَّ لَكَ عِنْدِي حَسَنَةً وَإِنَّهُ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ، ثُمَّ يُخْرِجُ بِطَاقَةً فِيهَا

بے شک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بعض بندوں پر ناوے رجسٹر پھیلا دیں گے ، ہر ایک رجسٹر ان میں سے تاحد نگاہ ہو گا، اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں گے، کیا تو اس میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا تجھ پر کراماً کاتبین نے کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا، اے میرے رب! نہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ کیا تجھے ان گناہوں میں سے کسی میں کوئی عذر پیش کرنا ہے؟ وہ کہے گا، اے میرے رب! نہیں، پھر وہ بندہ اپنے دل کو آگ پر رکھ دے گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میرے پاس تیری ایک نیکی ہے، آج تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا، پھر وہ ایک کارڈ نکالے گا، جس پر یہ لکھا ہوا ہو گا۔

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ فَيَقُولُ الْعَبْدُ: يَا رَبِّ، كَيْفَ تَقَعُ هٰذِهِ الْبِطَاقَةُ فِي مُقَابَلَةِ هَذِهِ السِّجِلَّاتِ؟ فَتُوضَعُ الْبِطَاقَةُ فِي كِفَّةٍ وَالسِّجِلَّاتُ فِي كِفَّةٍ أُخْرَى، فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ وَلَا يَثْقُلُ مَعَ ذِكْرِ اللّٰهِ شَيْءٌ.

میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، بندہ کہے گا، اے میرے رب! یہ کارڈ ان بڑے بڑے رجسٹروں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ پھر اس کارڈ کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور ان رجسٹروں کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا، رجسٹروں والا پلڑا کمزور پڑ جائے گا جب کہ کارڈ والا پلڑا بھاری ہو جائے گا، اللہ کے ذکر کے مقابلے میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔

پانچواں فائدہ: ایک غزوہ میں ایک عورت اپنے بچے کو ابنی ابنی (میرے بیٹے، میرے بیٹے) کہہ کر پیار کر رہی تھی، اسے اپنے سینے سے لگاتی اور اپنے ساتھ چمٹاتی تھی، سخت گرمی کی شدت میں اسے گرمی سے بچاتی تھی، اس کے بے پناہ پیار کو دیکھ کر حضرات صحابہ کرام رو پڑے، جب آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے پاس ٹھہر گئے، انہوں نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دے دی، آپ

ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس عورت کی اپنے بیٹے کے ساتھ رحمت اور مہربانی کی وجہ سے تعجب کرتے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تم سب پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر یہ عورت اپنے بیٹے کے ساتھ پیار کرتی ہے۔

اَلرَّحمٰن اور اَلرَّحِیمُ

الرحمن الرحیم یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں، دونوں میں مبالغہ ہے، الرحمن میں الرحیم سے زیادہ مبالغہ ہے، علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی ان معنوں سے متفق ہیں ، بعض سلف کی تفسیروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ان معنوں پر مبنی حضرت عیسیٰ رحمہ اللہ کا قول بھی ہے، کہ رحمن سے مراد دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد آخرت میں رحم کرنے والا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمن مشتق نہیں ہے اگر یہ اس طرح ہوتا تو مرحوم کے ساتھ ملتا۔ حالانکہ قرآن میں بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْماً آیا ہے۔ مبرد کہتے ہیں رحمن عبرانی نام ہے عربی نہیں۔

مفسر قرآن علامہ قرطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس لفظ کے مشتق ہونے کی دلیل ترمذی کی صحیح حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ أَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا اِسْمًا مِنِ اِسْمِي فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهُ (ترمذی بحوالہ تفسیر کبی رعلامہ فخر الدین رازی) میں رحمن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے نام میں سے ہی اس کا نام مشتق کیا۔ اس کے ملانے والے کو میں ملاؤں گا اور اس کے توڑنے والے کو کاٹ دوں گا۔ اس صریح حدیث کے ہوتے ہوئے مخالفت اور انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہا کفار عرب کا اس نام سے انکار کرنا یہ محض ان کی جہالت کی وجہ سے تھا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "رحمن اور رحیم کا ایک ہی معنی ہے جیسے ندمان اور ندیم۔ دونوں کا ایک ہی معنی ہے، ابوعبید رحمہ اللہ کا بھی یہی خیال ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فعلان فعیل کی طرح نہیں، فعلان میں مبالغہ ضروری ہوتا ہے جیسے غضبان اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں، جو بہت ہی غصہ

والا ہو اور فعیل صرف فاعل اور صرف مفعول کے لئے بھی آتا ہے، جو مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔

حضرت ابو علی فارسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "رحمن عام اسم ہے جو ہر قسم کی رحمتوں کو شامل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، رحیم باعتبار مومنوں کے ہے قرآن کریم میں ایک آیت ہے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب) مومنون کے ساتھ رحیم ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، هُمَا اِسمَانِ رَقِيقَان، أَحَدُهُمَا أَرَقُّ مِنَ الآخَر، یہ دونوں نام رحمت ورحم والے ہیں، ایک میں دوسرے سے زیادہ رحمت ورحم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں لفظ ارق ہے اس کے معنی خطابی وغیرہ ارفق کرتے ہیں جیسے کہ حدیث میں ہے کہ إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفقَ فِي الأَمرِ كُله وَإِنَّه يُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى العُنْفِ اللہ تعالیٰ رفیق یعنی شفیق اور مہربانی والا ہے وہ ہر کام میں نرمی اور آسانی کو پسند کرتا ہے وہ دوسروں پر نرمی اور آسانی کرنے والے پر وہ نعمتیں مرحمت فرماتا ہے جو سختی کرنے والے پر عطا نہیں فرماتا۔ {بخاري}

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ الرَّحمٰنُ إِذَا سُئِلَ أَعطَى، وَالرَّحِيمُ إِذَا لَمْ يُسأَل يَغضَب، رحمن اسے کہتے ہیں کہ جب اس سے جو مانگا جائے عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ جب اس سے نہ مانگا جائے وہ غضبناک ہو۔

ترمذی شریف کی روایت میں حضرت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کا ارشاد پاک ہے، مَن لَّم يَسأَلِ اللهَ يَغضَبْ عَلَيهِ، جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔

بعض شاعروں کا قول ہے۔

لَا تَطلُبَنَّ بَنِي آدَمَ حَاجَةً ... وَسَلِ الَّذِي أَبْوَابُه لَا تُغلَقُ

اَللّٰهُ يَغْضَبُ اِنْ تَرَكْتَ سُوَالَهُ وَبَنِيْ اٰدَمَ حِيْنَ يُسْأَلُ يَغْضَبُ

بنی آدم سے اپنی حاجتیں تلاش نہ کر، اس سے مانگ جس کے دروازے بند نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے اور بنی آدم سے مانگو تو وہ بگڑتے ہیں۔ {تفسیر الطبری (۱/۲۴۹)}

حضرت علامہ عزرمی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رحمن کے معنی تمام مخلوق پر رحم کرنے والا اور رحیم کے معنی مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے قرآن کریم میں صفت رحمن کے ساتھ استواء علی العرش کا ذکر فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ (الفرقان: ۵۹) اسی طرح دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طه: ۵) میں استویٰ کے ساتھ رحمن کا لفظ ذکر کیا، تاکہ تمام مخلوق کو یہ لفظ اپنے عام رحم وکرم کے معنی سے شامل ہو سکے اس لئے کہ عرش تمام مخلوق کو محیط ہے، جس طرح اس کی رحمت تمام مخلوق کو محیط ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ اور مومنوں کے ذکر کے ساتھ لفظ رحیم فرمایا وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب:۴۳) معلوم ہوا کہ رحمن میں مبالغہ بہ نسبت رحیم کے بہت زیادہ ہے۔ لیکن حدیث کی ایک دعا میں يَا رَحْمٰنَ الدُّنيَا وَالاٰخِرَةِ وَرَحِيمَهُمَا بھی آیا ہے۔ رحمن یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں۔

جیسے کہ قرآن کریم میں اللہ جل شانہ کا فرمان ہے کہ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى، اللہ کو پکارو یا رحمن کو جس نام سے چاہو اسے پکارو اس کے بہت اچھے اچھے نام ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ، ان سے پوچھ لو تجھ سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے تھے کیا انہوں نے رحمن کے سوا کسی کو معبود کہا تھا کہ ان کی عبادت کی جائے۔ (سورۃ الزخرف ۴۵)

جب مسیلمہ کذاب نے بڑھ چڑھ کر دعوے شروع کئے اور اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھا تو پروردگار نے اسے اس طرح رسوا اور برباد کیا، کہ وہ جھوٹ اور کذب کی علامت مشہور ہو گیا۔ آج اسے مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے اور ہر جھوٹے دعویدار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہر دیہاتی اور شہری ہر کچے پکے گھر والا اسے بخوبی جانتا ہے {تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۲۶}

بعض کہتے ہیں کہ رحیم میں رحمن سے زیادہ مبالغہ ہے اس لئے کہ اس لفظ کے ساتھ اگلے لفظ

کی تاکید کی گئی ہے اور تاکید بہ نسبت اس کے کہ جس کی تاکید کی جائے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تاکید ہے ہی نہیں بلکہ یہ توصفت ہے اور صفت میں یہ قاعدہ نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا اس نام میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں، سب سے پہلے اس کی صفت رحمن بیان کی گئی اور یہ نام رکھنا بھی دوسروں کو ممنوع ہے جیسے فرمادیا کہ اللہ کو یا رحمن کو پکارو جس نام سے چاہو پکارو اس کے لئے اسماء حسنیٰ بہت سارے ہیں۔ مسیلمہ نے بدترین جرأت کی لیکن برباد ہوا اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا اس کی کسی کے دل میں نہ آئی۔ رحیم کے وصف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی موصوف کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (سورۃ التوبہ آیت ۱۲۸)(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف انکو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں۔ (اور) مومنوں پر نہایت شفقت کرنیوالے (اور) مہربان ہیں۔ (التوبہ ۱۲۸) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو رؤف بھی فرمایا اور رحیم بھی قرار دیا۔

اسی طرح اپنے بعض ایسے ناموں سے دوسروں کو بھی اس نے نوازا ہے۔ جیسے آیت إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (الإنسان: ۲) ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمیع اور بصیر کہا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام تو ایسے ہیں کہ دوسروں پر بھی ہم معنی ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ نہیں ہو سکتا جیسے اللہ اور رحمن، خالق اور رزاق وغیرہ، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا نام اللہ پھر اس کی صفت رحمن سے ذکر کی ہے۔ اس لئے کہ رحیم کی نسبت یہ زیادہ خاص ہے اور زیادہ مشہور ہے، قاعدہ ہے کہ پہلے سب سے زیادہ بزرگ نام لیا جاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے سب سے زیادہ خاص نام لیا گیا پھر اس سے کم، پھر اس سے کم، اگر کہا جائے کہ جب رحمن میں

رحیم سے زیادہ مبالغہ موجود ہے پھر اسی پر اکتفا کیوں نہ کیا گیا؟ تو اس کے جواب میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ کافروں نے رحمن کا نام بھی غیروں کا رکھ لیا تھا اس لئے رحیم کا لفظ بھی ساتھ لگایا گیا تا کہ کسی قسم کا وہم ہی نہ رہے۔ رحمن و رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب رحمن سے واقف ہی نہ تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاسراء ۱۱۰) نازل فرما کر ان کی تردید کی۔

حدیبیہ والے سال جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھو تو کفار نے کہا تھا کہ ہم رحمن اور رحیم کو نہیں جانتے۔ { بخاري} بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم رحمن یمامہ کو جانتے ہیں کسی اور رحمن کو نہیں جانتے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ارشاد ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کے سامنے سجدہ کرو تو وہ حیران ہو کر جواب دیتے ہیں کہ رحمن کون ہے؟ جسے ہم تیرے قول کی وجہ سے سجدہ کریں۔ (سورۃ الفرقان ۶۰)

درحقیقت یہ بدکار لوگ صرف عناد، تکبر، سرکشی اور دشمنی کی بنا پر رحمن کا انکار کرتے تھے نہ کہ وہ اس نام سے ناآشنا تھے، اس لئے کہ جاہلیت کے زمانے کے پرانے اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام رحمن موجود ہے جو انہی کے سلامہ اور دوسرے شعرا کے اشعار میں ملاحظہ ہو۔

أَلا ضَرَبَتْ تِلْكَ الْفَتَاةُ هَجِينَهَا أَلا قَضَبَ الرَّحْمٰنُ رَبِّي يَمِينَهَا

سلامہ بن جندب الطهوي نے کہا تھا

عَجِلْتُمْ عَلَيْنَا عَجْلَتَيْنَا عَلَيْكُمُ ...وَمَا يَشَأُ الرَّحْمٰنُ يَعْقِدْ وَيُطْلِقُ

رحمن جسے چاہتا ہے باندھتا ہے اور چھوڑتا ہے۔ {تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۴۲)}

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رحمن فعلان کے وزن پر رحمت سے ماخوذ ہے اور کلام عرب سے ہے، وہ اللہ رفیق اور رقیق ہے جس پر رحم کرنا چاہے اور جس سے غصے ہو اس سے

بہت دور اور اس پر بہت سخت گیر بھی ہے اسی طرح اس کے تمام نام ہیں۔ (تفسیر ابن جریر}

حسن فرماتے ہیں رحمن کا نام دوسروں کے لئے ممنوع ہے، اسی طرح انہوں نے فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ: اِسْمٌ لَا يَسْتَطِيْعُ النَّاسُ أَنْ يَّنتَحِلُوْهُ، تُسَمّٰى بِهٖ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى، کہ رحمن خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے لوگ اس نام پر کوئی حق نہیں رکھتے۔

نکات

پہلا نکتہ: حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام بیمار ہوگئے، ان کے پیٹ میں درد شدید ہو گیا، تو اللہ کی بارگاہ میں شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے جنگل کی سبز بوٹی کی طرف راہنمائی کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس میں سے کھایا تو اللہ تعالیٰ کے امر سے ٹھیک ہوگئے، پھر دوسرے وقت میں یہ بیماری دوبارہ لوٹ آئی، اب کی بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بوٹی کھائی تو بیماری اور زیادہ ہوگئی اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، يَا رَبِّ، أَكَلْتُهُ أَوَّلًا فَانْتَفَعْتُ بِهٖ، وَأَكَلْتُهُ ثَانِيًا فَازْدَادَ مَرَضِي، اے میرے رب! میں نے پہلے یہ گھاس کھائی تو اس سے مجھے فائدہ ہوا اور جب دوسری بار میں نے یہ گھاس کھائی تو میری بیماری بڑھ گئی

اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِأَنَّكَ فِي الْمَرَّةِ الْأُوْلٰى ذَهَبْتَ مِنِّي إِلَى الْكَلَاءِ فَحَصَلَ فِيْهِ الشِّفَاءُ، وَفِي الْمَرَّةِ الثَّانِيَةِ ذَهَبْتَ مِنْكَ إِلَى الْكَلَاءِ فَازْدَادَ الْمَرَضُ، أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الدُّنْيَا كُلَّهَا سُمٌّ قَاتِلٌ وَتِرْيَاقُهَا اسْمِي؟ (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۵۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی بار تو میری طرف سے بوٹی کی طرف گیا تھا، اس لیے اس میں شفاء آئی تھی اب دوسری بار تو اپنی طرف سے بوٹی کی طرف گیا، اس لیے بیماری بڑھ گئی ہے، کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ دنیا ساری کی ساری زہر ہے اور اس کا تریاق میرا نام ہے۔

دوسرا نکتہ: حضرت رابعہ بصریہ نے رات تہجد اور نماز میں گزار دی، صبح کا وقت ہوا تو سو گئیں، ایک چور ان کے گھر میں داخل ہو گیا اور ان کے کپڑے لے کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا، مگر اسے دروازے کا راستہ نہیں مل رہا تھا، جب اس نے ان کے کپڑے رکھ دیے تو دروازے کا راستہ مل گیا، یہ حرکت اس نے تین بار کی، اسے گھر کے ایک گوشے سے آواز آئی، ضَعِ الْقُمَاشَ وَاخْرُجْ

فَإِنْ نَامَ الْحَبِيبُ فَالسُّلْطَانُ يَقْظَانُ. گھر کا سامان رکھ دے اور نکل جا، اگر دوست سو گیا ہے تو نگران جاگ رہا ہے۔

تیسرا نکتہ: عارفین میں سے ایک بکریاں چرا رہا تھا، اتنے میں بکریوں کے ریوڑ پر بھیڑیے آگئے، مگر انہوں نے اس کی بکریوں کو نقصان نہیں پہنچایا، قریب سے ایک آدمی گزرا اور اس نے اسے آواز دی، مَتَى اصْطَلَحَ الذِّئْبُ وَالْغَنَمُ؟ فَقَالَ الرَّاعِي: مِنْ حِيْنِ اصْطَلَحَ الرَّاعِي مَعَ اللهِ تَعَالَى. بھیڑیے اور بکری میں کب سے اتفاق ہو گیا ہے؟ چرواہے نے کہا: جب سے چرواہے نے اللہ کے ساتھ اتفاق کر لیا ہے۔

چوتھا نکتہ: بسم اللہ کا معنی ہے، میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں، تخفیف کے لیے شروع کرتا ہوں کا لفظ ساقط ہوا، جب آپ بسم اللہ کہیں تو گویا آپ یوں کہہ رہے ہیں میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں، یہ اس بات پر خبر دار کرنا ہے کہ بندے نے جس کام کی ابتدا کی تو اس کام کا مدار آسانی کرنا، تخفیف کرنا اور چشم پوشی کرنا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی کلمہ میں اس بات کو ذکر کر دیا ہے، جو چشم پوشی اور احسان کی طرف راہنمائی ہے۔

پانچواں نکتہ: فرعون نے الوہیت (خدائی) کا دعویٰ کرنے سے پہلے ایک محل بنایا اور حکم دے دیا کہ اس کے بیرونی دروازے پر بسم اللہ لکھ دی جائے، جب اس نے الوہیت کا دعوی کیا تو موسیٰ نے اس کی طرف پیغام بھیجا اور اسے بلوا بھیجا، مگر اس میں ہدایت کا کوئی اثر نہیں دیکھا تو عرض کرنے لگے، اے میرے اللہ! میں اسے کتنی دعوت دوں؟ میں تو اس میں کوئی خیر نہیں دیکھ رہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَا مُوسَى، لَعَلَّكَ تُرِيْدُ إِهْلَاكَهُ، أَنْتَ تَنْظُرُ إِلَى كُفْرِهِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى مَا كَتَبَهُ عَلَى بَابِهِ، اے موسیٰ! شاید تو اس کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اس کے کفر کی طرف دیکھ رہا ہے جب کہ میں اس چیز کی طرف دیکھ رہا ہوں جو اس نے اپنے محل کے دروازے پر لکھوائی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے یہ کلمہ بیرونی دروازے پر لکھا، وہ ہلاکت سے محفوظ رہا، اگرچہ وہ کافر تھا اور جس شخص نے اپنی ابتدائی عمر سے آخری عمر تک اس کو اپنے دل کے سیاہ نقطے کے

پاس لکھا اس کا کیا حال ہو گا؟

دروازے پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا تھا اس لیے اس کی طرف موسیٰ کو بھیجا کہ وہ ایمان لے آئے اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچ جائے، مگر اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جانے والے رسول کی بات ماننے سے انکار کر دیا، الٹا اس نے ان کے ساتھ استہزا اور مذاق شروع کر دیا، جس پر ایک وہ وقت بھی آن پہنچا جس میں اسے غرقاب کیا گیا اور اسے نشان عبرت بنایا گیا تھا۔

چھٹا نکتہ: جب اللہ تعالیٰ نے اپنا نام رحمان اور رحیم رکھا ہے تو وہ کیسے رحم نہیں کرے گا؟ یہ بات منقول ہے کہ ایک سوالی ایک اونچے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا، پھر اس نے سوال کیا تو اسے تھوڑا سا دیا گیا، دوسرے دن وہ ایک کلہاڑا لے کر آیا اور دروازے کو خراب کرنا شروع کر دیا، اس سے پوچھا گیا کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہ کام اس لیے کر رہا ہوں تاکہ دروازہ عطیہ کے مناسب ہو جائے یا عطیہ دروازے کے مناسب ہو جائے، (یعنی اتنا اونچا اور عالی شان دروازہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے اندر رہنے والا بڑا مالدار ہے، مگر اس نے اتنی تھوڑی مقدار میں عطیہ دیا، اب جب دروازہ ٹوٹ جائے گا تو کسی کو یہ گمان ہی نہیں ہو گا کہ اس کے اندر رہنے والا مالدار ہے، یہی سمجھا جائے گا کہ یہ غریب، مسکین آدمی ہے اس لیے اس کا یہ معمولی سا عطیہ اس کے شایان شان سمجھا جائے گا)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں إِلٰهَنَا إِنَّ بِحَارَ الرَّحْمَةِ بِالنِّسْبَةِ إِلَى رَحْمَتِكَ أَقَلُّ مِنَ الذَّرَّةِ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْعَرْشِ، فَكَمَا أَلْقَيْتَ فِي أَوَّلِ كِتَابِكَ عَلَى عِبَادِكَ صِفَةَ رَحْمَتِكَ فَلَا تَجْعَلْنَا مَحْرُومِينَ عَنْ رَحْمَتِكَ وَفَضْلِكَ. اے ہمارے پروردگار! بے شک رحمت کے دریا تیری رحمت کی بنسبت ایک ذرّہ سے بھی کم ہیں، تیرے عرش کی بنسبت، پس جیسے تو نے اپنی کتاب کے شروع میں اپنے بندوں پر صفت رحمت ڈالی ہے، ہمیں اپنی رحمت اور اپنے فضل سے محروم نہ کرنا

ساتواں نکتہ: بسم اللہ میں لفظ: اللہ: قہر، قدرت اور بلندی کی طرف اشارہ ہے، اس کے بعد الرحمن اور الرحیم ذکر فرمایا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے قہر سے زیادہ کامل اور

بہت زیادہ ہے۔

آٹھواں نکتہ: بہت دفعہ اتفاق ہوا ہے کہ بادشاہ کے غلام جب کوئی گھوڑا، خچر، گدھا وغیرہ خریدتے ہیں تو اس پر بادشاہ کی کوئی نشانی لگا دیتے ہیں، تاکہ دشمن اس میں نظریں نہ جمائیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں إِنَّ لِطَاعَتِكَ عَدُوًّا وَهُوَ الشَّيْطَانُ فَإِذَا شَرَعْتَ فِي عَمَلٍ فَاجْعَلْ عَلَيْهِ سِمَتِي، وَقُلْ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، حَتَّى لَا يَطْمَعَ الْعَدُوُّ فِيهَا. تیری اطاعت کے لیے ایک دشمن ہے، جسے شیطان کہا جاتا ہے، جب بھی تو کسی کام کو شروع کرے تو اس پر میری نشانی ڈال دیا کر اور یہ کہہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، ایسا کرے گا تو اس میں پھر کوئی دشمن طمع کی نظر نہیں رکھے گا

نواں نکتہ: تو اپنے کو اللہ کے ذکر کے ساتھ ملا کر رکھ، یہاں تک کہ دونوں جہاں میں جدا نہ ہونے پائے، آپ ﷺ نے اپنی مہر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تاکہ وہ اس میں لا الہ الا اللہ لکھوائیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو نقاش کے سپرد کیا اور کہا کہ وہ اس میں، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ لکھے، نقاش نے اس میں یہی لکھا، مگر جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ مہر لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو اس مہر میں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ، لکھا ہوا تھا۔

آپ ﷺ نے پوچھا: يَا أَبَا بَكْرٍ، مَا هٰذِهِ الزَّوَائِدُ؟ اے ابو بکر! یہ اضافہ کیا ہے؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا يَا رَسُولَ اللهِ مَا رَضِيتُ أَنْ أُفَرِّقَ اسْمَكَ عَنِ اسْمِ اللهِ وَأَمَّا الْبَاقِي فَمَا قُلْتُهُ، یارسول اللہ! میں نے اللہ کے نام سے آپ کے نام کو جدا کرنا پسند نہیں کیا، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ میں نے اسے نہیں کہا تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شرمندہ ہو گئے، اتنے میں حضرت جبریل امین تشریف لائے اور کہا يَا رَسُولَ اللهِ أَمَّا اسْمُ أَبِي بَكْرٍ فَكَتَبْتُهُ أَنَا لِأَنَّهُ مَا رَضِيَ أَنْ يُفَرِّقَ اسْمَكَ عَنِ اسْمِ اللهِ فَمَا رَضِيَ اللهُ أَنْ يُفَرِّقَ اسْمَهُ عَنِ اسْمِكَ، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۳)

یارسول اللہ! ابو بکر کا نام تو میں نے لکھا ہے، کیونکہ ابو بکر نے آپ ﷺ کے نام کو اللہ تعالیٰ کے نام سے

جداہونا پسند نہیں کیا، تو اللہ تعالیٰ بھی ابو بکر کے نام کو آپ ﷺ کے نام سے الگ کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے نام کو اللہ کے نام سے الگ نہ کرکے یہ سعادت حاصل کی تو اس شخص کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے الگ نہیں ہوتا؟

دسواں نکتہ: حضرت سیدنا نوح علیہ السلام جب کشتی میں سوار ہوئے تو کہا، بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (هُوْدٍ ۴۱) اللہ کے نام کے ساتھ اس کا جاری ہونا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ اس نصف کلمہ کی وجہ سے انہوں نے نجات پائی، جو شخص ساری عمر اس کلمہ پر ہمیشگی کرے گا وہ کیونکر نجات سے محروم ہو جائے گا؟ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے دنیا اور آخرت کی سلطنت حاصل کی تو صرف اپنے اس فرمان کی وجہ سے جس میں انہوں نے کہا تھا اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ [النَّمْلِ: ۳۰) بے شک یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے (اور بے شک وہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے) تو امید رکھنی چاہیے کہ جب بندہ یہ کہے گا تو وہ دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں کامیاب ہو جائے گا۔

گیارہواں نکتہ: امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں ایک باریک سوال اٹھا کر اس کا جواب بھی دیا ہے، سوال یہ اٹھایا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ سلیمان نے اللہ تعالیٰ کے نام سے اپنے نام کو پہلے کیوں ذکر کیا؟ تو اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے۔

پہلی وجہ: بلقیس نے جب یہ خط اپنے تکیے پر رکھا ہوا دیکھا حالانکہ اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور ہدہد پرندہ بھی دیوار کے ایک کنارے پر کھڑا تھا، تو وہ سمجھ گئی کہ یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے، اس نے وہ خط لیا اور کہنے لگی، اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ، یہ سلیمان کی طرف سے ہے، جب اس نے خط کھولا اور بسم اللہ الرحمن الرحیم دیکھی تو کہنے لگی وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، تو انہ من سلیمان کا جملہ بلقیس کا ہے نہ کہ سلیمان علیہ السلام کا۔

دوسری وجہ: ہو سکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے عنوان میں انہ من سلیمان لکھا ہو اور خط کے اندر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھی ہو، جیسے عام لکھاریوں کی عادت ہوتی ہے، جب بلقیس نے خط کا عنوان پڑھا تو یوں کہا: انہ من سلیمان اور جب اس نے خط کھول کر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، پڑھی تو کہنے لگی کہ یہ تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

تیسری وجہ: بلقیس ایک کافرہ عورت تھی، سلیمان علیہ السلام کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ خط دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو گالی نہ دینے لگے اس لیے انہوں نے اپنا نام پہلے لکھا تاکہ اگر گالی دے تو انہیں دے، اللہ تعالیٰ کو نہ دے، گویا حضرت سلیمان نے اللہ رب العزت کے پاک نام کا دفاع کیا، ایک خطرے کے پیش نظر ایسی حکمت عملی اختیار کی جس سے اللہ کے نام کا تقدس اور عزت محفوظ رہے۔

بارہواں نکتہ: بسم اللہ کی ب: بِرّ کے لفظ سے مشتق ہے اور بِرّ کا لفظ بار سے ہے، یعنی اہل ایمان پر احسان کرنے والا، دنیا اور آخرت کی انواع واقسام کی کرامات کے ساتھ اور اس کی بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ انہیں قیامت کے دن اپنی زیارت کا اعزاز بخشے گا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک شخص کا ایک پڑوسی تھا، جو مذہباً یہودی تھا اور وہ بیمار ہو گیا، اس نے کہا: کہ میں اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس گیا،

میں نے اس سے کہا: أَسْلِمْ، تو مسلمان ہو جا،

اس نے مجھے کہا: عَلَى مَاذَا؟ کیوں؟

میں نے اسے کہا: مِنْ خَوْفِ النَّارِ دوزخ کے خوف کی وجہ سے،

اس نے مجھے کہا: لَا أُبَالِي بِهَا، مجھے دوزخ کی کوئی پرواہ نہیں ہے،

میں نے اسے کہا: لِلْفَوْزِ بِالْجَنَّةِ، جنت کے ساتھ کامیابی کی وجہ سے مسلمان ہو جا،

اس نے مجھے کہا: لَا أُرِيْدُهَا، مجھے جنت نہیں چاہیے،

میں نے اس سے پوچھا: فَمَاذَا تُرِيْدُ؟ تجھے کیا چیز چاہیے؟

اس نے مجھے کہا: عَلَى أَنْ يُرِيَنِي وَجْهَهُ الْكَرِيْمَ،

مجھے صرف یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنا دیدار کروادے،
میں نے اسے کہا: أَسْلِمْ عَلَى أَنْ تَجِدَ هٰذَا الْمَطْلُوْبَ تو اس مطلوب کو پانے کے لیے مسلمان ہو جا
اس نے مجھے کہا: اُكْتُبْ بِهٰذَا خَطًّا، مجھے یہ بات لکھ کر دو،
میں نے یہ بات اسے لکھ کر دے دی، چنانچہ اس پر وہ مسلمان ہو گیا اور وہ اسی لمحے فوت ہو گیا، ہم نے اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اسے دفن کر دیا، فَرَأَيْتُهُ فِي النَّوْمِ كَأَنَّهُ يَتَبَخْتَرُ میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں اٹھکیلیاں کر رہا تھا،

میں نے اس سے پوچھا کہ: مَا فَعَلَ بِكَ رَبُّكَ؟ اے شمعون! تیرے ساتھ تیرے رب نے کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا: غَفَرَ لِي، وَقَالَ لِي: أَسْلَمْتَ شَوْقاً إِلَيَّ اللہ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور یہ فرمایا کہ تو میرے دیدار کے شوق میں مسلمان ہوا تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۴)

بسم اللہ کی: سین: اللہ تعالیٰ کے نام سمیع سے مشتق ہے، يَسْمَعُ دُعَاءَ الْخَلْقِ مِنَ الْعَرْشِ إِلَى مَا تَحْتَ الثَّرَى جو عرش سے فرش تک مخلوق کی دعا سنتا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ ایک منافق کے ساتھ مکہ سے طائف کی طرف گئے، جب دونوں ایک ویرانے میں پہنچے تو منافق نے انہیں کہا کہ ہم دونوں اس پہاڑی میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں آرام کرتے ہیں، چنانچہ وہ دونوں اس پہاڑی میں داخل ہو گئے، حضرت زید بن حارثہ سو گئے، منافق نے انہیں باندھ دیا اور انہیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا، زید نے اس سے پوچھا: لِمَ تَقْتُلُنِي؟ تو مجھے کیوں قتل کرے گا؟ منافق نے کہا: لِأَنَّ مُحَمَّدًا يُحِبُّكَ وَأَنَا أُبْغِضُهُ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں اُن سے بغض رکھتا ہوں۔

حضرت زید نے اللہ کی بارگاہ میں التجا کی، يَا رَحْمٰنُ أَغِثْنِي، اے رحمن میری مدد کر، اس دعا اور التجا کے بعد منافق نے ایک آواز سنی، کہ تیری بربادی، تو اسے قتل نہ کر، چنانچہ وہ اس ویران پہاڑی سے نکلا اور دیکھا، مگر اسے کوئی دکھائی نہیں دیا، وہ واپس گیا اور اس نے انہیں قتل کرنے کا

ارادہ کرلیا، اب اس نے ایک چیخنے والے کی آواز سنی جو پہلے والے کی آواز سے بہت زیادہ قریب سنائی دے رہی تھی، کہ اسے قتل نہ کر، اب کی بار بھی اس نے دیکھا تو کسی کو نہیں پایا، اب تیسری بار واپس گیا اور انہیں قتل کرنے کا ارادہ کرلیا، اب اسے اس سے بھی قریب میں ایک آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا کہ اسے قتل نہ کر، اب کی بار وہ باہر نکلا تو اسے اک گھڑ سوار دکھائی دیا، جس کے پاس ایک نیزہ تھا، اس گھڑ سوار نے اسے نیزہ مار کر قتل کرڈالا، اس کے بعد وہ اس ویران پہاڑی میں گیا اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو کھولا اور ان سے پوچھا:

أَمَا تَعْرِفُنِي؟ أَنَا جِبْرِيْلُ حِيْنَ دَعَوْتَ كُنْتُ فِي السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: (أَدْرِكْ عَبْدِيَ) ، وَفِي الثَّانِيَةِ كُنْتُ فِي السَّمَاءِ الدُّنْيَا، وَفِي الثَّالِثَةِ بَلَغْتُ إِلَى الْمُنَافِقِ. کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ میں جبریل ہوں، جب تو نے دعا کی تھی تو میں ساتویں آسمان پر تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (أَدْرِكْ عَبْدِيَ) میرے بندے کو پالے۔ دوسری بار میں آسمان دنیا پر تھا اور تیسری بار میں اس منافق تک پہنچ گیا تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۴)

بسم اللہ کی: میم: بسم اللہ شریف میں جو میم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ أَنَّ مِنَ الْعَرْشِ إِلَى مَا تَحْتَ الثَّرَى مُلْكَهُ وَمِلْكَهُ، عرش سے تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے وہ اس کی سلطنت ہے اور اس کے قبضے میں ہے، اس موقع پر امام رازی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ سدی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک بار حضرت سلیمان رحمہ اللہ بن داؤد رحمہ اللہ کے زمانے میں لوگ قحط کا شکار ہوگئے، سلیمان علیہ السلام کے پاس آکر کہنے لگے۔

يَا نَبِيَّ اللهِ، لَوْ خَرَجْتَ بِالنَّاسِ إِلَى الِاسْتِسْقَاءِ، اے نبی اللہ! اگر آپ لوگوں کو نماز استسقاء کے لیے نکالیں تو بہتر ہوگا، چنانچہ وہ لوگ نماز استسقاء کے لیے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چیونٹی اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑی، اپنے ہاتھ پھیلائے یہ دعا مانگ رہی تھی۔ اَللّٰهُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ، وَلَا غِنَى لِي عَنْ فَضْلِكَ، اے اللہ! بے شک ہم تیری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں، تیرے فضل سے ہم مستغنی نہیں ہیں۔ فَصَبَّ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِمُ الْمَطَرَ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش نازل فرمائی

حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں سے کہا، اِرْجِعُوْا فَقَدِ اسْتُجِيْبَ لَكُمْ بِدُعَاءِ غَيْرِكُمْ، تم واپس چلے جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمہارے علاوہ مخلوق کی دعا قبول کرلی ہے۔

بسم اللہ میں لفظ: اللہ

بسم اللہ میں موجود لفظ اللہ کے بارے میں علامہ رازی رحمہ اللہ ایک ایمان افروز بات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فَاعْلَمُوْا أَيُّهَا النَّاسُ أَنِّي أَقُوْلُ طُوْلَ حَيَاتِي اللهَ، فَإِذَا مِتُّ أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا سُئِلْتُ فِي الْقَبْرِ أَقُوْلُ اللهُ، وَإِذَا جِئْتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا أَخَذْتُ الْكِتَابَ أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا وُزِنَتْ أَعْمَالِي أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا جُزْتُ الصِّرَاطَ أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا دَخَلْتُ الْجَنَّةَ أَقُوْلُ اللهُ وَإِذَا رَأَيْتُ اللهَ قُلْتُ اللهُ اے لوگو! میں اپنی پوری زندگی اللہ اللہ کرتا رہوں گا، جب میں مروں گا تو اللہ اللہ کہوں گا، جب مجھ سے قبر میں سوال کیا جائے گا تو میں اس کے جواب میں اللہ اللہ کہوں گا، جب میں قیامت کے دن محشر کے میدان میں آؤں گا تو اللہ اللہ کہوں گا، جب میں نامۂ اعمال ہاتھ میں لوں گا تو اللہ اللہ کہوں گا، جب میرے اعمال کا وزن کیا جائے گا تو میں اللہ اللہ کہوں گا، جب میں پل صراط سے گزروں گا تو اللہ اللہ کہوں گا، اور جب میں جنت میں داخل ہوں گا تو اللہ اللہ کہوں گا، اور جب میں اللہ کو دیکھوں گا تو کہوں گا، اللہ اللہ۔

تیرہواں نکتہ: بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے تین نام ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ قرآن کریم میں مُخَاطبین کی تین قسمیں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ، وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ، وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ (فَاطِرٍ: ۳۲) پس ان میں سے کچھ اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے ہیں اور کچھ اعتدال والے اور کچھ نیکیوں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: أَنَا اللهُ لِلسَّابِقِيْنَ، الرَّحْمٰنُ لِلْمُقْتَصِدِيْنَ، الرَّحِيْمُ لِلظَّالِمِيْنَ، میں آگے بڑھنے والوں کا اللہ ہوں، میں اعتدال والوں کا رحمن ہوں، میں ظالموں کا رحیم ہوں۔ اسی طرح اللہ وہ ہے جو عطاء کرتا ہے، رحمن وہ ہے جو دوستوں کی لغزشوں کو درگزر کرتا ہے،

رحیم وہ ہے جو ظلم وجور سے در گزر کرتا ہے اوراس کی کمال مہربانی یہ ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں أَعْلَمُ مِنْكَ مَا لَوْ عَلِمَهُ أَبَوَاكَ لَفَارَقَاكَ، وَلَوْ عَلِمَتْهُ الْمَرْأَةُ لَجَفَتْكَ، وَلَوْ عَلِمَتْهُ الْأَمَةُ لَأَقْدَمَتْ عَلَى الْفِرَارِ مِنْكَ، وَلَوْ عَلِمَهُ الْجَارُ لَسَعَى فِي تَخْرِيبِ الدَّارِ، وَأَنَا أَعْلَمُ كُلَّ ذٰلِكَ وَأَسْتُرُهُ بِكَرَمِي لِتَعْلَمَ أَنِّي إِلٰهٌ كَرِيمٌ. (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۵۴) میں تیری وہ باتیں بھی جانتا ہوں اگر وہ باتیں تیرے والدین کو معلوم ہو جائیں تو وہ تجھے جدا کر دیں اور اگر انہیں عورت جان لے تو تیری پٹائی کرے اور اگر انہیں لونڈی جان لے تو تجھ سے بھاگنے کا اقدام کرے، اگر انہیں پڑوسی جان لے تو گھر کو تباہ کرنے کی کوشش کرے، میں ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود اپنے لطف وکرم سے ان کو چھپاتا ہوں، تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں کریم معبود ہوں۔

چودھواں نکتہ: اللہ تعالیٰ کی ولایت ثابت ہوگئی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا (الْبَقَرَةِ: ۲۵۶) اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا دوست ہے۔ اور رحمن اپنی محبت کو واجب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مَرْيَمَ: ۹۶) بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، عنقریب رحمن انہیں محبت دے گا۔ اور رحیم اپنی رحمت کو ایمان والوں کے لیے ضروری ٹھہراتا ہے، ارشاد ہے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْماً (الْأَحْزَابِ: ۴۳) وہ ایمان والوں کے ساتھ نہایت مہربان ہے۔

پندرھواں نکتہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ رَفَعَ قِرْطَاسًا مِنَ الْأَرْضِ فِيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ إِجْلَالًا لِلّٰهِ تَعَالَى كُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ، وَخُفِّفَ عَنْ وَالِدَيْهِ وَإِنْ كَانَا مُشْرِكَيْنِ، جس نے زمین سے بسم اللہ الرحمن الرحیم والا کاغذ اٹھایا اللہ تعالیٰ کے نام کی بزرگی کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں صدیقین میں لکھا جاتا ہے، اس کے والدین مشرک ہی کیوں نہ ہوں ان سے عذاب کی اس وجہ سے تخفیف ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ، إِذَا

تَوَضَّأْتَ فَقُلْ: بِسْمِ اللّٰهِ فَإِنَّ حَفَظَتَكَ لَا تَبْرَحُ أَنْ تَكْتُبَ لَكَ الْحَسَنَاتِ حَتّٰى تَفْرَغَ، وَإِذَا غَشِيتَ أَهْلَكَ فَقُلْ: بِسْمِ اللّٰهِ، فَإِنَّ حَفَظَتَكَ يَكْتُبُوْنَ لَكَ الْحَسَنَاتُ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْهَا اے ابوہریرہ! جب تو وضو کرے تو بسم اللہ کہہ، پس بے شک فرشتے برابر تیری نیکیاں لکھتے رہیں گے یہاں تک کہ تو وضو سے فارغ ہو اور جب تو اپنے گھر والوں کے پاس آئے تو تُو کہہ بسم اللہ ، پس بے شک فرشتے تیرے لیے نیکیاں لکھتے رہیں گے جب تک تو وہاں سے نکلے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سَتْرُ مَا بَيْنَ أَعْيُنِ الْجِنِ وَالْعَوْرَاتِ بَنِي آدَمَ إِذَا نَزَعُوْا ثِيَابَهُمْ أَنْ يَقُوْلُوْا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، جب بنی آدم اپنے کپڑے اتارتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم کہیں تو جنات کی آنکھوں اور بنی آدم کی شرم گاہوں کے درمیان یہ پڑھنا پردہ بن جاتا ہے۔ اس میں ایک اشارہ ہے کہ جب یہ نام انسان اور اس کے دشمن جنات کے درمیان پردہ بن جاتا ہے تو پھر آخرت میں اس کے اور زبانیہ فرشتوں کے درمیان پردہ کیوں نہیں بن جائے گا؟

سولھواں نکتہ: قیصر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مجھے سر میں درد ہے، جو ٹھیک نہیں ہو رہا، اس لیے آپ کوئی دوا بھیجیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک ٹوپی بھیجی، جب وہ اسے اپنے سر پر رکھتا تو آرام آجاتا اور جب وہ اسے اتارتا تو پھر سے درد شروع ہو جاتا، اسے یہ بات عجیب لگی تو اس نے ٹوپی کی تلاش شروع کر دی، اس ٹوپی میں سے اسے ایک کاغذ ملا، جس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہوئی تھی، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کے پاک نام میں کس قدر برکت ہے اور اللہ ہی شفا دینے والا ہے۔

سترہواں نکتہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ تَوَضَّأَ وَلَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالٰى كَانَ طُهُوْرًا لِتِلْكَ الْأَعْضَاءِ، وَمَنْ تَوَضَّأَ وَذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالٰى كَانَ طُهُوْرًا لِّجَمِيْعِ بَدَنِهِ، جس شخص نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا تو یہ اس کے ان اعضاء کے لیے پاکی ہے جسے اس نے دھویا ہے اور جس نے وضو کیا اور اللہ کا نام لیا تو یہ اس کے سارے جسم کی طہارت ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب

اس نے وضو کے لیے بسم اللہ پڑھی تو یہ اس کے سارے جسم کے لیے پاکیزگی ہوئی، تو جب بندہ صدق دل اور مصمم ارادے کے ساتھ اللہ کا ذکر کرے تو یہ اولی ہے کہ اس کا دل کفر اور بدعت سے پاک ہو جائے۔

اٹھارہواں نکتہ: کچھ لوگوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ اسلام کے دعویدار ہیں، ہمیں آپ کوئی نشانی بتائیں تاکہ ہم بھی مسلمان ہو جائیں، اس پر حضرت خالد بن ولید نے فرمایا: اِئْتُوْنِي بِالسُّمِّ الْقَاتِلِ، فَأُتِيَ بِطَاسٍ مِنَ السُّمِّ، فَأَخَذَهَا بِيَدِهِ وَقَالَ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَأَكَلَ الْكُلَّ وَقَامَ سَالِمًا بِإِذْنِ اللهِ تَعَالَى، فَقَالَ الْمَجُوْسُ هٰذَا دِيْنُ حَقٍّ، میرے پاس زہر قاتل لاؤ، چنانچہ کافی مقدار میں انہیں زہر دیا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: بسم اللہ الرحمن الرحیم اور سارے کا سارا زہر کھا گئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے، یہ منظر دیکھ کر مجوس پکار اٹھے کہ هَذَا دِيْنُ حَقٍّ یہ دین سچا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۵)

انیسواں نکتہ: حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر کے پاس سے گزرے تو عذاب کے فرشتوں کو دیکھا جو ایک میت کو عذاب دے رہے تھے، جب آپ اپنے کام سے واپس لوٹے تو رحمت کے فرشتوں کو دیکھا، جن کے پاس نور کی طشتریاں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس بات پر تعجب ہوا، پھر انہوں نے نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی

يَا عِيْسٰى، كَانَ هٰذَا الْعَبْدُ عَاصِيًا وَمُذْ مَاتَ كَانَ مَحْبُوْسًا فِي عَذَابِي، وَكَانَ قَدْ تَرَكَ امْرَأَةً حُبْلٰى فَوَلَدَتْ وَلَدًا وَرَبَّتْهُ حَتّٰى كَبِرَ، فَسَلَّمَتْهُ إِلَى الْكُتَّابِ فَلَقَّنَهُ الْمُعَلِّمُ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، فَاسْتَحْيَيْتُ مِنْ عَبْدِي أَنْ أُعَذِّبَهُ بِنَارِي فِي بَطْنِ الْأَرْضِ وَوَلَدُهُ يَذْكُرُ اسْمِي عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ.

اے عیسیٰ! یہ بندہ گناہگار تھا اور جب سے مرا ہے میرے عذاب میں گرفتار تھا اور جب یہ مرا اس وقت اس کی بیوی حاملہ تھی، اس نے ایک بیٹا جنم دیا اور اس نے اس کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ

بڑا ہو گیا، پھر اس نے اسے درس گاہ میں بھیجا، استاذ نے اسے بسم اللہ الرحمن الرحیم سکھائی، تو اس وجہ سے مجھے اپنے بندے سے حیا آتی ہے کہ میں اسے زمین کے اندر اپنی آگ کا عذاب دوں درانحالیکہ اس کا بیٹا زمین کے اوپر میرا ذکر کرتا ہے۔

بیسواں نکتہ: بڑی عارفات میں سے ایک بزرگ خاتون عَمرَہ فرغانیہ سے سوال کیا گیا کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ جُنبی اور حائض دونوں کو تلاوت قرآن سے منع کیا گیا ہے؟ مگر بسم اللہ سے منع نہیں کیا گیا، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا: لِأَنَّ التَّسْمِيَةَ ذِكْرُ اسْمِ الْحَبِيْبِ وَالْحَبِيْبُ لَا يَمْنَعُ مِنْ ذِكْرِ الْحَبِيْبِ، اس کی وجہ یہ ہے کہ تسمیہ اسم حبیب کا ذکر ہے اور دوست دوست کے ذکر سے روکا نہیں کرتا۔

اکیسواں نکتہ: بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کا نام رحیم بھی مذکور ہے، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ هُوَ تَعَالٰى رَحِيْمٌ بِهِمْ فِي سِتَّةِ مَوَاضِعَ فِي الْقَبْرِ وَحَشَرَاتِهِ، وَالْقِيَامَةِ وَظُلُمَاتِهِ، وَالْمِيزَانِ وَدَرَجَاتِهِ، وَقِرَأَةِ الْكِتَابِ وَفَزَعَاتِهِ، وَالصِّرَاطِ وَمَخَافَاتِهِ وَالنَّارِ وَدَرَكَاتِهِ، وہ چھ مقامات پر اپنے بندوں پر رحیم ہے، قبر میں اور اس کے کیڑے مکوڑوں میں، قیامت میں اور اس کے اندھیروں میں، میزان میں اور اس کے درجات میں، تلاوت کتاب اور اس کے ڈراوؤں میں، پل صراط میں اور اس کی خوفناکیوں میں، دوزخ میں اور اس کے درکات میں۔

بائیسوا ں نکتہ: ایک اللہ والے نے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی اور وصیت کی کہ اسے اس کے کفن میں رکھا جائے، اس سے پوچھا گیا کہ اس میں تجھے کیا فائدہ ہو گا؟ اس نے کہا: میں قیامت کے دن کہوں گا، إِلٰهِي بَعَثْتَ كِتَابًا وَجَعَلْتَ عُنْوَانَهُ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، فَعَامِلْنِي بِعُنْوَانِ كِتَابِكَ. اے میرے پروردگار! تو نے ایک کتاب بھیجی تھی، جس کے سر فہرست بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا پس میرے ساتھ اپنی کتاب کے سرنامہ کے مطابق معاملہ فرما۔

تئیسواں نکتہ: کہا گیا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے انیس حروف ہیں اور اس میں دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ زبانیہ فرشتے بھی انیس ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان انیس حروف میں سے ہر ایک کے

بدلے میں ایک ایک فرشتے کو دور کر دیں گے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کے چوبیس گھنٹے کو پیدا فرمایا، پھر ان میں پانچ ساعات میں پانچ نمازیں فرض کیں، باقی انیس گھنٹے بچے ان میں ہونے والے گناہوں کا کفارہ یہ انیس حروف ہیں۔

چوبیسواں نکتہ: سورۃ التوبہ کے احکامات قتال پر مشتمل ہیں، اس لیے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے، اسی طرح سُنَّت عمل یہ ہے کہ ذبح کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہا جائے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ کہا جائے، کیونکہ قتل و قتال کے وقت اللہ تعالیٰ کے نام رحمٰن اور رحیم کا ذکر مناسب نہیں ہے، جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو فرض نمازوں میں سترہ بار یہ کلمہ ادا کرنے کی توفیق دی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قتل و قتال کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ اسے مہربانی، فضل اور احسان کے لیے پیدا کیا ہے۔

☆☆☆

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ① الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ② مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ③ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ④ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ⑥ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ⑦ (الفاتحہ)

شروع اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ① جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے ② جو روز جزا کا مالک ہے ③ (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ④ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطاء فرما ⑤ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا ہے ⑥ نہ کہ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ اُن کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں ⑦

الحمد للہ: عربی زبان میں اچھی تعریف کرنے کو "حمد" کہا جاتا ہے، یعنی کسی کی اچھی اور عمدہ صفات بیان کرنے پر حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اگر کسی کی بری صفات ذکر کی جائیں تو اسے حمد نہیں کہا جائے گا، عربی زبان میں تعریف وستائش کے لیے تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ایک حمد، دوسرا مدح اور تیسرا شکر۔

مدح زندہ اور مردہ کی ہوتی ہے، ایک شخص کسی انتہائی خوبصورت موتی کو دیکھ کر اس کی مدح کرتا ہے، یا یاقوت کی خوبصورتی کا ذکر کرتا ہے، تو یہ مدح ہے، اس پر لفظ حمد کا استعمال نہیں کیا جاسکتا، اس سے معلوم ہوا کہ مدح کا لفظ عام ہے، اسی طرح مدح کبھی احسان سے پہلے ہوتی ہے اور کبھی احسان کے بعد ہوتی ہے، لیکن حمد تو صرف احسان کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح مدح کبھی ممنوع بھی ہوتی ہے،

جیسے نبی کریم ﷺ نے مدّاحین کے منہ میں مٹی ڈالنے کا ارشاد فرمایا: اِحْثُوا التُّرَابَ فِي وُجُوهِ الْمَدَّاحِينَ (تفسیر کبیر للرازی ج ۱) تعریفیں کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔

مدح ممنوع بھی ہوتی ہے، جس مدح سے منع کیا گیا اور جس کی مذمت کی گئی ہے وہ مدح ہے جسے ہم چاپلوسی کہتے ہیں، جسے ہم خوشامد کہتے ہیں، جسے ہم کاسہ لیسی کہتے ہیں جھوٹی تعریفیں اور خوشامد کرنے سے مقصود مطلب براری ہوتی ہے، جبکہ حمد کرنے کا تو مطلق حکم دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: مَنْ لَّمْ يَحْمَدِ النَّاسَ لَمْ يَحْمَدِ اللّٰهَ جو لوگوں کی تعریف نہیں کرتا اس نے اللہ کی تعریف نہیں کی، مراد شکریہ ادا کرنا ہے۔

معلوم ہوا کہ مدح ایسی عبارت سے کی جاتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فضائل کی اقسام میں سے کسی قسم کے ساتھ خاص ہے، جب کہ حمد وہ قول ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کسی خاص فضیلت کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ فضیلت انعام اور احسان ہے، معلوم ہوا کہ مدح عام اور حمد خاص ہے۔

حمد اور شکر کے درمیان فرق یہ ہے کہ حمد عام ہے چاہے یہ انعام آپ تک پہنچے یا آپ کے علاوہ کسی اور کو پہنچے، جب کہ شکر اس انعام کے ساتھ خاص ہے جو آپ تک پہنچے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اس سے معلوم ہوا کہ مدح زندہ اور غیر زندہ دونوں کے لیے ہو سکتی ہے اور فاعل مختار کے لیے اور اس کے علاوہ کے لیے بھی، اگر کسی نے یوں کہا کہ مدح اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے فاعل مختار ہونے پر دلالت نہیں کر سکتا لیکن جب الحمد للہ کہا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے فاعل مختار ہونے پر دلالت کرے گا۔ جب کوئی الحمد للہ کہے تو یہ اس بات پر دلالت ہو گی کہ کہنے والا اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ عالم کا معبود موجب بالذات نہیں ہے، جیسے فلاسفہ کا عقیدہ ہے، بلکہ وہ فاعل مختار ہے، اسی طرح الحمد للہ کا جملہ شکر للہ کے جملے سے بہتر ہے۔ کیونکہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان تمام انعامات کے سبب سے ہے جو اس سے صادر ہوتے اور اس کے غیر تک پہنچتے ہیں لیکن شکر للہ اس انعام کے سبب سے تعریف ہے جو اس کہنے

والے تک پہنچا ہے، تو اس لحاظ سے اس میں شک نہیں ہے کہ الحمدللہ کے ساتھ تعریف کرنا شکر للہ کے ساتھ تعریف کرنے سے بہتر ہے، گویا بندہ یوں کہتا ہے

سَوَآءٌ أَعْطَيْتَنِي أَوْ لَمْ تُعْطِنِي فَإِنْعَامُكَ وَاصِلٌ إِلٰى كُلِّ الْعَالَمِيْنَ، وَأَنْتَ مُسْتَحِقٌّ لِلْحَمْدِ الْعَظِيْمِ. تو مجھے دے یا نہ دے، مگر تیرا انعام تو کل جہان کو پہنچنے والا ہے اور تو بڑی حمد کا مستحق ہے، بعض کہتے ہیں کہ الحمد بلاؤں کو دور کرنے پر کہی جاتی ہے جب کہ شکر نعمتوں کے ملنے پر کیا جاتا ہے۔

حمد کی تعریف: شیخ نعمت اللہ بن محمود رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی تفسیر میں حمد کی تعریف کے ذیل میں لکھتے ہیں

اَلْحَمْدُ وَالثَّنَآءُ الشَّامِلُ لِجَمِيْعِ الاَثْنِيَةِ وَالْمَحَامِدِ الصَّادِرَةِ عَنْ اَلْسِنَةِ ذَرَائِرِ الْكَائِنَاتِ اَلْمُتَوَجِّهَةُ نَحْوَ مُبْدِعِهَا طَوْعًا اَلْمُعْتَرِفَةُ بِشُكْرِ مُنْعِمِهَا حَالًا وَّمَقَالًا اَزَلًا وَّاَبَدًا ثَابِتَةً مُّخْتَصَّةً لِلّٰهِ اَى لِلذَّاتِ الْمُسْتَجْمِعُ لِجَمِيْعِ الأَسْمَاءِ وَالصِّفَاتِ الْمُظْهِرَةُ الْمُرَبِيَّةُ لِلْعَوالِمِ وَمَا فِيْهَا بِأَسْرِهَا رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلَوْلَا تَرْبِيَتُهُ إِيَّاهَا وَإِمْدَادُهُ لَهَا طَرْفَةً لَفَنِيَ الْعَالَمُ دَفْعَةً

حمد اور ثناء تمام ثناؤں اور محامد کو شامل ہے، جو کائنات کے ذروں کی زبانوں سے صادر ہوئی ہے، جو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف خوشی سے متوجہ ہیں، جو اپنے منعم کے شکر کا اعتراف کرتی ہیں، زبان حال سے، زبان قال سے، ازل سے لے کر ابد تک جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت اور خاص ہیں، یعنی وہ ذات جو تمام ناموں، تمام صفات جو جہانوں کے لیے اور تمام تر جو اس کی تخلیق کا شاہکار ہیں کی مظہر اور مربی ہیں کی جامع ہے، جو جہانوں کا پروردگار ہے اور اگر اس کی ان کو ایک لمحہ بھی پرورش اور امداد نہ ملتی تو یہ جہان یک لخت ہی ختم ہو جاتا۔ (الفواتح الالٰہیہ والمفاتح الغیبیہ ج ا ص ۱۸)

الحمد للہ، احمد اللہ کہنے سے زیادہ بلیغ: اللہ تعالیٰ نے الحمد للہ کہنے کا ارشاد فرمایا، احمد اللہ یعنی واحد متکلم

کے صیغہ کے ساتھ تعریف کرنے کا ارشاد نہیں فرمایا، اس پر امام رازی رحمۃ اللہ نے کئی وجوہات بیان کی ہیں، اگر احمد اللہ فرماتے تو اس سے یہ بات سمجھی جاتی کہ کہنے والا اس کی حمد کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن جب الحمدللہ فرمایا تو اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ ذات حمد کرنے والوں اور شکر کرنے والوں سے پہلے ہی محمود ہے، یہ لوگ اس کی حمد کریں یا نہ کریں، اس کا شکر کریں یا نہ کریں وہ ذات تو ازل سے ابد تک اپنی حمد قدیم اور اپنے کلام قدیم کے ساتھ محمود ہے۔

الحمدللہ کا مطلب یہ ہے کہ حمد اور ثناء یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس کی ملک ہے، وہ ذات عالی اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کی کثرت اور انواع کے باعث مستحق حمد ہے، الحمدللہ کا معنی یہ ہے کہ حمد اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس کی ذات اس کی مستحق ہے، اگر اس کی جگہ احمد اللہ کہتے تو یہ جملہ اس پر دلالت نہ کرتا کہ اس کی ذات حمد کی مستحق ہے، معلوم ہوا کہ وہ لفظ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ذات مستحق حمد ہے زیادہ بہتر ہے اس لفظ سے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک شخص اس کی حمد کر رہا ہے۔

اگر احمد اللہ فرماتے تو اس سے بھی حمد ہو جاتی مگر وہ حمد نہ ہوتی جو اس کے شایان شان ہے جب اس نے کہا الحمدللہ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا وہ یوں کہہ رہا ہے میں کون ہوتا ہوں اس کی تعریف کرنے والا؟ وہ تو تمام حمد کرنے والوں کی حمد سے محمود ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ جب آپ سے سوال کیا جائے کہ کیا فلاں کی آپ پر کوئی نعمت ہے؟ تو اس کے جواب میں آپ کہیں کہ جی ہاں! اس میں آپ نے اس کی تعریف کی ہے مگر یہ

تعریف کمزور درجے کی ہے، اگر آپ اس کے جواب میں یوں کہیں بلکہ اس کی نعمتیں تو تمام مخلوقات پر ہیں تو یہ تعریف اعلیٰ درجے کی تعریفات میں سے ہے۔

حمد نام ہے دل کی صفت کا اور یہ اس بات کا عقیدہ رکھنا ہے کہ محمود فاضل، منعم، تعظیم اور بزرگی کے مستحق ہے، جب انسان احمد اللہ کے ساتھ لفظ ادا کرے حالانکہ اس کا دل تعظیم کے معنی سے غافل ہو، جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور بزرگی کے لائق ہے تو وہ شخص جھوٹا ہے، کیونکہ وہ اپنی طر

ف سے خبر دے رہا ہے کہ وہ حمد کرنے والا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، لیکن جب اس نے الحمدللہ کہا تو چاہے وہ تعظیم کے معنی سے غافل ہو یا آگاہ ہو وہ سچا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حمد اللہ کا حق اور اس کی ملکیت ہے اور یہ معنی تو انسان اس کی تعظیم کے معنی سے غافل ہو یا غافل نہ ہو پھر بھی پایا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ الحمدللہ کہنا یہ احمد اللہ کہنے سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کی مثال لا الہ الا اللہ ہے کہ اس میں جھوٹ داخل نہیں ہوتا، بخلاف اس کے کہ ایک آدمی یوں کہے کہ اشھد ان لا الہ الا اللہ، کیونکہ کبھی وہ اپنے اس قول میں جھوٹا ہوتا ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو جھٹلاتے ہوئے فرمایا وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ (الْمُنَافِقُوْنَ: ۱) تفسیر کبیر للرازی ۱) اسی راز کے باعث ہی تو اذان میں اشھد کہنے کا حکم دیا گیا، پھر آخر میں لا الہ الا اللہ پر ختم کی گئی۔

الحمدللہ کے لام کا معنی: الحمدللہ میں لام کے معنی میں کئی احتمالات ہیں، یہ لام اختصاص کے لیے ہے، لام تملیک کے لیے ہے، قدرت اور استیلاء کے لیے ہے، الحمدللہ میں لام ان تینوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے، اگر یہ لام اختصاص کے لیے ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حمد اسی کے لائق ہے، اس کے غایت جلال، کثرت فضل اور احسان کی وجہ سے اور اگر یہ لام تملیک کے لیے ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کل کا مالک ہے، اگر اس کو استیلاء اور قدرت کے معنی پر محمول کیا جائے تو حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ حق ہے، کیونکہ وہ واجب لذاتہ ہے اور اس کے علاوہ ممکن لذاتہ ہیں، تو جو ذات واجب لذاتہ ہے وہ ممکن لذاتہ پر غالب ہے، تو الحمدللہ کا معنی یہ ہوا کہ حمد اسی کے لائق ہے اور اس معنی میں ہے کہ حمد اس کی ملک ہے، وہ حمد کا مالک ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ وہ سب پر غالب ہے اور سب سے بلند ہے

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حمد پر الف لام ہے، یہ استغراق کے لیے بھی ہو سکتا ہے، جنس کے لیے بھی، پس الحمدللہ کے معنی یہ ہوئے کہ حمد وثناء میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ سب اللہ کے لیے ہے، کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے سب اسی سے ہے اور اسی میں ہے اور اگر حسن موجود ہے تو نگاہ عشق کیوں نہ ہو اور اگر

محمودیت جلوہ افروز ہے تو زبانِ حمد وستائش کیوں خاموش رہے؟(ام الکتاب)

آٹھ حروف اور جنت کے آٹھ دروازے: علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے الحمدللہ میں ایک باریک نکتہ نکالا ہے، کہ الحمدللہ کے آٹھ حروف ہیں اور جنت کے دروازے بھی آٹھ ہیں، تو جس شخص نے ان آٹھ حروف کو دل کی صفائی کے ساتھ پڑھا تو وہ جنت کے آٹھ دروازوں کا حقدار ہو جائے گا۔ (مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر ج ۱)

منعم حقیقی اللہ ہی ہے: جس طرح الحمدللہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی محمود نہیں ہے، اسی طرح عقل بھی اس پر دال ہے کہ اللہ کے سوا کوئی محمود نہیں ہے، اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ منعم کے دل میں انعام کا داعیہ پیدا نہ کرتا تو وہ انعام نہ کرتا، معلوم ہوا کہ حقیقی منعم تو اللہ ہی ہوا، جس نے انعام کا داعیہ پیدا کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو بھی کسی دوسرے پر انعام کرتا ہے تو وہ اس انعام کے بدلے کچھ نہ کچھ لیتا ہے، یا تو ثواب، یا تعریف وستائش یا حق کی وصولی، یا بخیلانہ اخلاق سے نفس کو چھٹکارا دلانا، تو معاوضے کا طلب گار منعِم نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ درحقیقت حمد وستائش کا مستحق بھی نہیں ہو سکتا، مگر اللہ تعالیٰ تو اپنی ذات میں کامل ہے اور جو ہستی اپنی ذات میں کامل ہو وہ کمال کی طلب گار نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے تحصیل حاصل لازم آتا، حالانکہ تحصیل حاصل محال ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطایا تو جُود محض اور احسان محض ہیں، تو یقیناً وہی مستحق حمد ہے، تو اس سے ثابت ہو گیا کہ حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تمام موجودہ نعمتیں ممکن الوجود ہیں اور ہر وہ چیز جو ممکن الوجود ہو وہ ایجاد حق کے ساتھ ہی وجود میں آسکتی ہے، یا ابتداً یا بالواسطہ، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے، اس پر قرآن کریم کی آیت بطور ثبوت وتاکید کے موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (النَّحْلِ: ۵۳) تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی

طرف سے ہے۔ تو حمد کا مطلب یہی ہے کہ تعریف وستائش انعام پر ہی ہو سکتی ہے، جب یہ بات طے ہے کہ انعام اللہ ہی کی طرف سے ہے تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ حمد کا مستحق بھی اللہ ہی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ نعمت تین امور کے باعث کامل بنتی ہے، ایک یہ کہ وہ نفع بخش ہو اور کسی چیز کا نفع بخش ہونا اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ زندہ ہو اور ادراک رکھنے والی ہو اور کسی چیز کا زندہ ہونا اور مُدرِک ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجود دینے کے بغیر ہو نہیں سکتا، دوسرا یہ کہ منفعت اس وقت تک کامل نعمت نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ نقصان اور غم کے شائبوں سے خالی نہ ہو اور منافعوں کا نقصانات کے شائبوں سے خالی ہونا تو اللہ ہی کی طرف سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ منفعت اس وقت تک نعمت کاملہ نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ختم ہونے کے خوف سے محفوظ نہ ہو اور کسی نعمت کے ختم ہونے کا خوف اگر دور ہو سکتا ہے تو اللہ ہی کر سکتا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو معلوم ہوا کہ کامل نعمت اللہ ہی کی طرف سے حاصل ہو سکتی ہے، جس میں یہ تمام باتیں پائی جائیں، اس لیے ضروری ہو گیا کہ حمد کا مستحق اللہ ہی ہو، تو ان دلائل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ الحمدللہ ہی کہنا درست ہے۔

تحمید کی فضیلت: رحمت کائنات حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا أَنْعَمَ اللهُ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً فَيَقُولُ الْعَبْدُ الْحَمْدُ للهِ فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: «أُنْظُرُوا إِلَى عَبْدِي أَعْطَيْتُهُ مَا لَا قَدَرَ لَهُ فَأَعْطَانِي مَا لَا قِيمَةَ لَهُ (تفسیر کبیر ج ۱)

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر کسی نعمت کا انعام کرتے ہیں، پھر بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے بندے کو دیکھو، میں نے اسے وہ دیا جس کا اسے اندازہ نہیں تھا اور اس نے مجھے وہ دیا جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر انعام کرتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ بھوکا ہے تو اسے کھلاتے ہیں، وہ پیاسا ہے تو اسے پلاتے ہیں، اگر وہ ننگا ہے تو اسے پہناتے ہیں، جب بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ حمد جو حمد کرنے والے کرتے ہیں وہ اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ حمد جو حمد کرنے والے نہیں کرتے مگر عقلاً اس کا وجود میں داخل ہونا ممکن ہے تو وہ

بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس میں تمام تعریف کرنے والوں کی تعریفیں داخل ہیں، جو ملائکہ عرش، ملائکہ کرسی اور آسمان کی رہنے والی مخلوق کرتی ہے، وہ تعریفیں جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نے کیں، تمام اولیاءء اور علماء نے کیں، تمام مخلوقات نے کیں، ان سب کی پکار کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تعریف وستائش سے ہوئی اوران کی پکار کی انتہاء رب العالمین کی تعریف و ستائش پہ ہوئی اور ہوگی ۔جیسے سورت یونس کی آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (یُونُس) پھر تمام تعریفات اور ستائشات ختم ہونے والی ہیں، مگر الحمدللہ رب العالمین ایسی تعریف و ستائش ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اُنْظُرُوْا إِلٰى عَبْدِي قَدْ أَعْطَيْتُهُ نِعْمَةً وَاحِدَةً لَا قَدْرَ لَهَا فَأَعْطَانِي مِنَ الشُّكْرِ مَا لَا حَدَّ لَهُ وَلَا نِهَايَةَ لَهُ، میرے بندے کو دیکھو کہ میں نے اسے ایک نعمت دی ہے جس کا اسے اندازہ نہیں تھا، اس نے مجھے شکر دیا جس کی کوئی حد اور کوئی انتہاء نہیں ہے۔(تفسیر کبیر ج ۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِذَا قَالَ الْعَبْدُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ قَالَ صَدَقَ عَبْدِي الْحَمْدُ لِي، جب بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بندہ سچ کہتا ہے کہ حمد میرے ہی لیے ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا، بے شک اللہ تعالیٰ بندے سے خوش ہوتے ہیں کہ وہ کوئی لقمہ کھاتا ہے تو اس پر اس کی تعریف کرتا ہے یا کوئی گھونٹ پانی پیتا ہے تو اس پر اس کی تعریف کرتا ہے۔(مسلم شریف)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَا مِنْ نِعْمَةٍ إِلَّا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ أَفْضَلُ مِنْهَا الحمدللہ ہر نعمت سے افضل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَوْ أَنَّ الدُّنْيَا كُلَّهَا بِحَذَافِيرِهَا بِيَدِ رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي ثُمَّ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ لَكَانَتِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ أَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ (نوادرالاصول حکیم ترمذی بحوالہ الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور) اگر دنیا تمام ترسازوسامان کے ساتھ میری امت کے ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو پھر وہ کہے الحمدللہ تو یہ الحمدللہ اس سے بہتر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اپنے تمام تراسباب ووسائل، اپنے تمام ترسازوسامان کے ساتھ ایک فانی اور ختم ہونے والی چیز ہے، جب کہ کلمہ باقی رہنے والا ہے، بلکہ باقیات الصالحات میں سے ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَّخَيْرٌ أَمَلًا (مریم: ۷۶) دنیا بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور یہ کلمہ بھی اللہ کی دین ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا دے کر مال دار کردیا اور کلمہ دے کر اسے آخرت میں شرف یاب کردیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ

أَنَّ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِ اللّٰهِ قَالَ يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيمِ سُلْطَانِكَ فَعَضَلَتْ بِالْمَلَكَيْنِ فَلَمْ يَدْرِيَا كَيْفَ يَكْتُبَانِهَا فَصَعِدَا إِلَى السَّمَاءِ وَقَالَا يَا رَبَّنَا إِنَّ عَبْدَكَ قَدْ قَالَ مَقَالَةً لَا نَدْرِي كَيْفَ نَكْتُبُهَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا قَالَ عَبْدُهُ مَاذَا قَالَ عَبْدِي قَالَا يَا رَبِّ إِنَّهُ قَدْ قَالَ يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيمِ سُلْطَانِكَ فَقَالَ اللّٰهُ لَهُمَا اكْتُبَاهَا كَمَا قَالَ عَبْدِي حَتَّى يَلْقَانِي فَأَجْزِيَهُ بِهَا (ابن ماجہ)

بے شک اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے نے کہا: اے میرے رب! تیرے لیے حمد جیسے تیری بڑی ذات اور تیری بڑی بادشاہی تقاضا کرے، یہ بات فرشتوں کے لیے مشکل ہوگئی انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اسے کیسے لکھیں؟ پھر وہ فرشتے آسمان کی طرف گئے اور عرض کرنے لگے، اے

ہمارے پروردگار! تیرے بندے نے ایسی بات کہی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم اسے کیسے لکھیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے بندے نے کیا کہا؟ میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتوں نے کہا: اے پروردگار! اس نے کہا: اے میرے رب! تیرے لیے حمد جیسے تیری بڑی شان اور بڑی بادشاہی تقاضا کرے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں فرشتوں سے فرمایا: جیسا میرے بندے نے کہا ہے تم دونوں ایسے ہی لکھ لو، جب وہ میرے ساتھ ملاقات کرے گا تو میں اسے اس کا بدلہ دوں گا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ أَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (مسلم) پاکیزگی آدھا ایمان ہے اور الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ اور الحمد للہ دونوں میزان کو بھر دیتے ہیں، یا آسمان اور زمین کے درمیانی خلاء کو بھر دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: {اَلْحَمْدُ لله} كَلِمَةُ الشُّكْرِ إِذَا قَالَ العَبْدُ {الْحَمْدُ لله} قَالَ الله شَكَرَنِي عَبْدِي، الحمد للہ کلمۂ شکر ہے، جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا ہے۔ (الدر المنثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: {اَلْحَمْدُ} هُوَ الشُّكْرُ وَالِاسْتِحْذَاءُ لِلّٰهِ وَالْإِقْرَارُ بِنِعَمِهِ وَهِدَايَتِهِ وَابْتِدَائِهِ وَغَيْرُ ذٰلِكَ، حمد وہ شکر ادا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے قطع تعلق کرنا ہے، اس کی نعمت، اس کی ہدایت اور اس کی ابتدا کا اقرار کرنا ہے (الدر المنثور بالتفسیر الماثور ج ۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم سُبْحَانَ اللّٰهِ اور لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کو تو جانتے ہیں مگر یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کیا ہے؟ تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: كَلِمَةٌ رَضِيَهَا اللّٰهُ لِنَفْسِهِ وَأَحَبُّ أَنْ تُقَالَ (الدر المنثور بالتفسیر الماثور ج ۱ ص ۳۰) یہ ایسا کلمہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ اسے کہا جائے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ الحمدللہ یہ اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے، حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ یہ رِدَاءُ الرَّحْمٰن ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی چادر ہے۔

حضرت عبدالرحمن الجبائی رحمہ اللہ نے فرمایا، اَلصَّلَاۃُ شُکْرٌ وَالصِّیَامُ شُکْرٌ وَکُلُّ خَیْرٍ تَفْعَلُہٗ لِلّٰہِ شُکْرٌ وَأَفْضَلُ الشُّکْرِ {الْحَمْدُ} نماز شکر ادا کرنا ہے، روزہ شکر ادا کرنا ہے اور ہر وہ نیکی جو تو اللہ کے لیے کرتا ہے وہ شکر ہے اور بہترین شکر وہ الحمد ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور بہترین دعا الحمدللہ ہے (نسائی) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلتَّوْحِیْدُ ثَمَنُ الْجَنَّۃِ وَ {الْحَمْدُ لِلّٰہِ} ثَمَنُ کُلِّ قِطْعَۃٍ (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۰) توحید جنت کی قیمت ہے اور الحمدللہ ہر ٹکڑے کی قیمت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کُلُّ أَمْرِ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَأُ فِیْہِ بِحَمْدِ اللّٰہِ فَھُوَ أَقْطَعُ، ہر ذی شان کام جو اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ دم بریدہ ہوتا ہے۔

ادب المفرد میں حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِذَا عَطِسَ أَحَدُکُم فَقَالَ {الْحَمْدُ لِلّٰہِ} قَالَ الْمَلَکُ: رَبِّ الْعَالَمِیْنَ فَإِذَا قَالَ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ قَالَ الْمَلَکُ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ، جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اس پر الحمدللہ کہے، تو فرشتہ کہتا ہے رب العالمین، پھر جب بندہ رب العالمین کہتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے یرحمک اللہ (اللہ تجھ پر رحم کرے)

بخاری رحمہ اللہ نے ادب میں، ابن سنی رحمہ اللہ اور ابو نعیم رحمہ اللہ نے طب نبوی میں حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مَنْ قَالَ عِنْدَ کُلِّ عَطْسَۃٍ سَمِعَھَا {الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ} عَلٰی کُلِّ حَالٍ مَا کَانَ لَمْ یَجِدْ وَجَعَ الضِّرْسِ وَالْأُذُنِ أَبَدًا (الدر المنثور ج ۱ ص ۳۰) جو شخص ہر چھینک پر الحمدللہ رب العالمین علی کل حال کہے سنے تو اسے داڑھ اور کان میں

تکلیف نہیں ہو گی۔

حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ بَادَرَ الْعَاطِسَ بِالْحَمْدِ لَمْ يَضُرُّهُ شَيْءٌ مِنْ دَاءِ الْبَطْنِ (تفسیر الدر المنثور) جس نے چھینک مارنے والے کی چھینک پر الحمد للہ کہنے میں جلدی کی تو اسے پیٹ کی کوئی بیماری نقصان نہیں دے گی۔ (الدر المنثور)

حکیم ترمذی رحمۃ اللہ نے حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی کی کہ إِنْ عَطَسَ عَاطِسٌ مِنْ وَرَاءِ سَبْعَةِ أَبْحُرٍ فَاذْكُرْنِي (الدر المنثور ج ۲) اگر چھینکنے والا سات سمندر پار سے بھی چھینکے تو مجھے یاد کرو۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لوگوں میں سے ایک سریہ روانہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی اَللّٰهُمَّ لَكَ عَلَيَّ إِنْ رَدَدْتَهُمْ سَالِمِينَ أَنْ أَشْكُرَكَ حَقَّ شُكْرِكَ، اے میرے اللہ! میرا تجھ سے عہد و پیمان ہے کہ اگر تو نے ان لوگوں کو صحیح وسالم واپس کیا تو میں تیرا اس طرح شکر ادا کروں گا جیسے شکر کرنے کا حق ہے۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ وہ لوگ صحیح وسالم واپس آ گئے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: {الْحَمْدُ لِلّٰهِ} عَلَى سَابِغِ نِعَمِ اللّٰهِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَلَمْ تَقُلْ إِنْ رَدَّهُمُ اللّٰهُ أَنْ أَشْكُرَهُ حَقَّ شُكْرِهِ فَقَالَ أَوَ لَمْ أَفْعَلْ، تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کامل نعمتوں پر، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اگر اللہ ان کو واپس لوٹا دے تو میں اس کا اس طرح شکر ادا کروں گا جس طرح شکر ادا کرنے کا حق ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ کیا میں نے ایسا نہیں کیا ہے؟

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے ایک لشکر روانہ کیا اور یہ فرمایا: إِنْ سَلَّمَهُمُ اللّٰهُ وَأَغْنَاهُمْ فَإِنَّ لِلّٰهِ عَلَيَّ فِي ذٰلِكَ شُكْرًا، فَلَمْ يَلْبَثُوا أَنْ غَنِمُوا وَسَلِمُوا، فَقَالَ بَعْضُ أَصْحَابِهِ، سَمِعْنَاكَ تَقُولُ: إِنْ سَلَّمَهُمُ اللّٰهُ وَأَغْنَاهُمْ فَإِنَّ لِلّٰهِ عَلَيَّ فِي ذٰلِكَ شُكْرًا؟ قَالَ ﷺ: قَدْ فَعَلْتُ، قُلْتُ: اَللّٰهُمَّ شُكْرًا، وَلَكَ

الْفَضْلُ وَالْمَنُّ فَضْلًا (کتاب الشکر ابن ابی الدنیا)

اگر اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی اور غنیمت عطاء کی تو میرا اللہ سے وعدہ ہے کہ میں شکر ادا کروں گا، کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ انہیں غنیمت بھی ملی اور وہ محفوظ بھی رہے، اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے کہا: کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا اور انہیں غنیمت دی تو اس پر میرا اللہ سے وعدہ ہے کہ میں شکر کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے، میں نے کہا: اے اللہ! تیرا شکر ہے اور تیرا بہت زیادہ فضل واحسان ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے طبرانی کے حوالے سے حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدعاء نامی اونٹنی ایک دفعہ چوری ہوگئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَئِنْ رَدَّهَا اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيَّ لَأَشْكُرَنَّ رَبِّي، فَلَمَّا رُدَّتْ قَالَ ﷺ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، فَانْتَظَرُوا: هَلْ يُحْدِثُ صَوْمًا أَوْ صَلَاةً؟ فَظَنُّوا أَنَّهُ نَسِيَ، فَقَالُوا لَهُ، فَقَالَ ﷺ: أَلَمْ أَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ؟!

اگر اللہ تعالیٰ اسے لوٹادے تو میرا اللہ سے وعدہ ہے کہ میں اپنے رب کا ضرور بہ ضرور شکر کروں گا، جب وہ واپس آگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحمدللہ کہا، صحابہ کرام انتظار کررہے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی روزہ رکھیں گے یا نماز ادا کریں گے، ان کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول گئے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے الحمدللہ نہیں کہا؟ (روح المعانی ۱/۷۳)

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میرے باپ کی خچر گم ہوگئی، تو انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے واپس لائے تو میں اس کی ایسی تعریف وستائش کروں گا وہ اسے پسند آئے گی، پھر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ان کی خچر اپنی کاٹھی اور لگام سمیت آگئی، پھر وہ اس پر بیٹھے، جب اس کی پشت پر سیدھے ہوئے تو آسمان کی طرف اپنا سر اٹھا کر کہا، الحمدللہ، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، اس بارے میں انہیں کہا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں نے کوئی چیز چھوڑ دی ہے یا کوئی چیز باقی رکھی ہے؟ میں نے تو تمام تر حمد اللہ ہی کے لیے کردی ہے

(الحلیہ ابو نعیم، بیہقی)

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ} ذِکْرٌ وَشُکْرٌ وَلَیْسَ شَیْءٌ یَکُوْنُ ذِکْرًا وَشُکْرًا غَیْرُہٗ (بیہقی) الحمد للہ ذکر اور شکر ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز ذکر اور شکر نہیں ہو سکتی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا قَالَ: سُبْحَانَ اللّٰہِ فَهِیَ صَلَاۃُ الْخَلَائِقِ وَإِذَا قَالَ {الْحَمْدُ لِلّٰہِ} فَهِیَ کَلِمَۃُ الشُّکْرِ الَّتِی لَمْ یَشْکُرْ عَبْدٌ قَطُّ حَتّٰی یَقُوْلَهَا وَ إِذَا قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ فَهِیَ کَلِمَۃُ الإِخْلَاصِ الَّتِی لَمْ یَقْبَلِ اللّٰہُ مِنْ عَبْدٍ قَطُّ عَمَلًا حَتّٰی یَقُوْلَهَا وَإِذَا قَالَ: اَللّٰہُ أَکْبَرُ مَلأَ مَابَیْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَالَ: لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ قَالَ اللّٰہُ: أَسْلِمْ وَاسْتَسْلَمَ (ابن ابی الدنیا، الحلیہ ابو نعیم)

بے شک بندے نے جب سبحان اللہ کہا تو یہ مخلوق کی نماز ہے اور جب الحمد للہ کہا تو یہ کلمہ شکر ہے، ایسا کلمہ کہ بندہ اس کے کہے بغیر کبھی بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کر سکتا اور جب اس نے لا الہ الا اللہ کہا تو یہ کلمۂ اخلاص ہے، یہ ایسا کلمہ ہے کہ اسے کہے بغیر اللہ تعالیٰ کسی بندے کے عمل کو قبول نہیں کرتے اور جب اس نے کہا: اللہ اکبر تو اس نے آسمان اور زمین کے درمیان خلاء کو بھر دیا اور جب اس نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، محفوظ ہو جا، تو وہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

الحمد کے ساتھ وابستہ یادیں

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَلِمَۃُ کُلِّ شَاکِرٍ، (تفسیر قرطبی ج ۱) الحمد للہ ہر شکر گزار کا کلمہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب چھینک آئی تو انہوں نے الحمد للہ کہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو فرمایا، یوں کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (سورۃ المؤمنون ۲۸) تمام کامل تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں ظلم کرنے والی قوم سے نجات دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ (سورۃ ابراہیم ۳۹) تمام کامل تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ دونوں نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ النمل ۱۵) تمام کامل تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر ہمیں فضیلت عطاء فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا (سورۃ الاسراء ۱۱۱) آپ فرمادیجیے! تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

حضرت جبریل امین نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا، قُلْ يَا مُحَمَّدُ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (تفسیر طبری ج۱ص ۱۳۵) فرمادیجیے! اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام کامل تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔

اھل جنت جنت میں یوں نغمہ سرائی کریں گے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (سورۃ فاطر ۳۴) تمام کامل تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم دور کیا۔ پھر جنت والوں کی آخری نغمہ سرائی یوں ہوگی، وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (سورۃ یونس ۱۰) اوران کی آخری پکاریوں ہوگی، تمام کامل تعریفیں جہانوں کے پروردگار کے لیے ہیں۔

حمد میں موجود تین حروف: الحمد کے بارے میں تفسیر قرطبی میں حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ذکر کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں، مَنْ حَمِدَهُ بِصِفَاتِهِ كَمَا وَصَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ حَمِدَ، لِاَنَّ الْحَمْدَ حَاءٌ وَمِيْمٌ وَدَالٌ، فَالْحَاءُ مِنَ الْوَحْدَانِيَّةِ، وَالْمِيْمُ مِنَ الْمُلْكِ، وَالدَّالُ مِنَ الدَّيْمُوْمِيَّةِ، فَمَنْ عَرَفَهُ بِالْوَحْدَانِيَّةِ وَالدَّيْمُوْمِيَّةِ وَالْمُلْكِ فَقَدْ عَرَفَهُ، وَهٰذَا هُوَ حَقِيْقَةُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (ج۱ص ۱۳۴) جس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کی صفات کے ساتھ کی جیسے اس نے اپنی تعریف خود کی ہے تو اس نے واقعی اللہ کی تعریف کی ہے، کیونکہ الحمد میں تین حروف آئے ہیں، حاء، میم

اور دال، حاء وحدانیت سے ہے، میم ملک سے ہے اور دال دیمومیت سے ہے، جس نے اللہ کو اس کی وحدانیت، دیمومیت اور مُلک کے ساتھ پہچانا تو اس نے یقیناً اسے پہچان لیا اور یہی الحمدللہ کی حقیقت ہے۔ (دیمومیت سے مراد دوام اور ہمیشگی ہے)

اللہ کی کاریگری

اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ کسی چیز کا وجود اس کے نہ ہونے سے بہتر ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر موجود زندہ اپنے عدم کو ناپسند کرتا ہے، اگر وجود عدم سے بہتر نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا، جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کے ایجاد کرنے سے ہوا ہے، اس کے فضل واحسان اور اس کے جُود و کرم سے ہوا ہے، تو معلوم ہوا کہ وجود ایک نعمت ہے۔

عالم ارواح، عالم اجسام، علویات اور سُفلیات میں موجود چیزوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمت، رحمت اور احسان ہے اور احسان، نعمت اور رحمت یہ تمام چیزیں حمد اور شکر کو واجب کرنے والی ہیں، جب بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ تعریف ان نعمتوں پر کر رہا ہوں جو اس نے میرے اوپر کی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تعریف میں ان نعمتوں پر کر رہا ہوں جو اس سے صادر ہوئی ہیں۔

تو اللہ کی تمام مخلوقات پر اس کے انعامات کی بارش ہوتی ہے، جب بندہ الحمدللہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے لیے تمام تعریفیں ہیں اس کے ان انعامات پر جو اس نے اپنی تمام مخلوقات پر کیے ہیں اور ہر اس مخلوق پر جو اس نے پیدا کی ہے، خواہ وہ نور سے ہو، ظلمت سے ہو، سکون سے ہو، حرکت سے ہو، عرش سے ہو، کرسی سے ہو، جنات سے ہو، انسان سے ہو، ذات سے ہو، صفت سے ہو، جسم سے ہو، عرض سے ہو، ابد تک، زمانہ بھر تک ہو، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تمام تعریفوں کی مستحق وہی ذات ہے، اس میں کوئی دوسرا شریک اور ساجھی نہیں ہے۔

تسبیح سے تحمید مقدم ہونے کی وجہ: تسبیح میں سبحان اللہ پہلے اور الحمدللہ بعد میں آتا ہے، مگر یہاں الحمدللہ سے کلام کی ابتدا ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تحمید تسبیح پر دلالت تضمنی کے طور پر

دلالت کرتی ہے، تسبیح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور اپنی صفات کے اندر نقص، عیب اور آفات سے پاک ہے اور تحمید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ذات مخلوق کی محسن ہے، ان پر انعام کرنے والی ہے اور ان پر مہربان ہے، تسبیح میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تام ہے جب کہ تحمید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ فوق التمام ہے، اس وجہ سے یہاں تحمید کے ساتھ ابتدا کرنا بہتر ہے۔

حمد کا ماضی اور مستقبل کے ساتھ تعلق: حمد کا ماضی اور مستقبل دو زمانوں کے ساتھ خاص تعلق ہے، ماضی کے ساتھ تعلق کا تقاضا ہے کہ پہلی نعمتوں پر ادائے شکر کیا جائے اور مستقبل کے ساتھ تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ آنے والے وقت میں نئی نئی نعمتیں ملتی رہیں گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (إِبْرَاهِيمَ: ۷) اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔

اور عقل بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، کہ سابقہ نعمتیں خدمت کرنے کو لازم کرتی ہیں، اطاعت اور فرماں برداری پر آمادہ کرتی ہیں، جب انسان شکر میں مشغول ہو جاتا ہے تو عقل و دل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دروازے کھلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کے دروازے کھلتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے، اسی معنی کے اعتبار سے حمد اپنے ماضی کے تعلق کے سبب سے انسان سے دوزخ کے دروازے بند کر دے گی اور مستقبل کے تعلق کے باعث اس کے لیے جنتوں کے دروازے کھول دے گی۔

ماضی کی تاثیر کے باعث اللہ اور بندے کے درمیان سے حجاب اٹھ جائیں گے اور مستقبل کی تاثیر کے باعث اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دروازے کھل جائیں گے۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ جلال الٰہی کے درجات کی کوئی انتہاء نہیں ہے تو یہ بات بھی اس سے سمجھ میں آتی ہے کہ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی سیڑھیوں کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہے اور اس کی چابی صرف الحمدللہ کا قول ہے۔ اسی وجہ سے تو سورۃ الحمد کا نام سورۃ الفاتحہ رکھا گیا ہے۔

الحمدللہ کا موقع و محل پر استعمال: الحمدللہ ایک عمدہ اور بہترین کلمہ ہے، اس لیے اس کے استعمال کے لیے موقع اور محل کو دیکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ مقصود کا حصول ناممکن ہو گا۔

حضرت سَری سَقطِی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک بار کسی نے پوچھا: اطاعت کیسے کی جائے؟ تو انہوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ میں تیس سال سے الحمدللہ کی جگہ استغفر اللہ ہی کہے جا رہا ہوں، صرف ایک بار الحمدللہ کہا ہے، آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگے، ایک بار بغداد میں آگ لگ گئی، ساری دکانیں اور گھر جل گئے لوگوں نے مجھے اطلاع دی کہ میری دکان نہیں جلی، اس پر میں نے الحمدللہ کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنی دکان کے بچ جانے پر خوش ہوا، حالانکہ لوگوں کی دکانیں جل گئی تھیں، دین اور مروت کا تقاضا یہ تھا کہ میں خوش نہ ہوتا، تو میں تیس سال سے استغفار میں مشغول تھا، الحمدللہ سے غافل رہا، پتہ چلا کہ جس قدر یہ کلمہ عظیم ہے اسی قدر اس کے استعمال میں احتیاط لازم ہے۔

الحمدللہ کا نعمت دینیہ پر استعمال: یوں تو اس انسان پر اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ نعمتیں ہیں، لیکن پہلی تقسیم کے لحاظ سے یہ دو قسم پر ہیں، ایک دنیا کی نعمتیں اور دوسرا دین کی نعمتیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ دین کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے اعلیٰ اور افضل ہیں، کلمہ الحمدللہ کی بزرگی اور عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ عاقل اور دانا شخص اس کو دنیاوی نعمتوں کی بجائے دینی نعمتوں کے بدلے میں استعمال کرے، پھر دینی نعمتیں بھی دو قسم پر ہیں، ایک جن کا تعلق اعمال جوارح کے ساتھ اور دوسری وہ جن کا تعلق اعمال قلوب کے ساتھ ہے، تو دوسری قسم اشرف اور اعلیٰ ہے۔ پھر دنیوی نعمتیں بھی دو قسم پر ہیں، کبھی تو ان نعمتوں کو نعمت سمجھا جاتا ہے اور کبھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ انعام کرنے والے کی طرف سے تحفہ اور عطیہ ہیں، ان میں دوسری قسم افضل اور اعلیٰ ہے، پس یہی وہ مقامات ہیں جہاں انسان کو دیکھنا پڑتا ہے کہ الحمدللہ کس مقام پر کہنا زیادہ موزوں ہے۔

آدم کا پہلا اور اولاد آدم کا جنت میں آخری کلمہ: حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی زبان سے سب سے پہلا کلمہ جو ادا ہوا تھا وہ یہی الحمدللہ تھا اور جنت میں اولاد آدم کا کلمہ بھی یہی الحمدللہ ہو گا، مفسرین

کرام لکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا پُتلا بنایا، پھر اس میں روح پھونکی تو جب روح اُن کی ناف تک پہنچی تو آدم علیہ السلام نے چھینک ماری۔ پھر کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، اور اولاد آدم کی جنت میں آخری پکار یہی ہو گی، وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (یُونُس: ۱۰)

معلوم ہوا کہ کائنات کی ابتدا بھی الحمدللہ سے ہوئی ہے اور انتہاء بھی الحمدللہ پر ہو گی، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ایسی کوشش کرے کہ اس کے کام کی ابتدا بھی اس کلمہ سے ہو اور انتہاء بھی اس کلمہ سے ہو، کیونکہ انسان ایک چھوٹا جہان ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے اعمال اس طرح ہوں جو بڑے جہان کے احوال کے مطابق ہوں۔

الحمدللہ میں نکات

پہلا نکتہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا، کہ اے میرے رب! جو شخص تیری حمد کرے اس کا بدلہ کیا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاتِحَةُ الشُّكْرِ وَخَاتِمَتُهُ، الحمدللہ ابتدائے شکر اور انتہائے شکر ہے۔

اہل تحقیق کہتے ہیں کہ جب یہ کلمہ ابتدائے شکر ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائے شکر بھی قرار دیا حالانکہ یہ اس کا آخری کلام نہیں تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا اسے آخری کلام قرار دیا اور فرمایا کہ اہل جنت کا آخری کلام یہ ہو گا، وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (یونس: ۱۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ مِنْ نُوْرٍ مَكْنُوْنٍ مَخْزُوْنٍ مِنْ سَابِقِ عِلْمِهِ، فَجَعَلَ الْعِلْمَ نَفْسَهُ، وَالْفَهْمَ رُوْحَهُ، وَالزُّهْدَ رَأْسَهُ، وَالْحَيَاءَ عَيْنَهُ، وَالْحِكْمَةَ لِسَانَهُ، وَالْخَيْرَ سَمْعَهُ، وَالرَّأْفَةَ قَلْبَهُ، وَالرَّحْمَةَ هَمَّهُ، وَالصَّبْرَ بَطْنَهُ، ثُمَّ قِيْلَ لَهُ تَكَلَّمْ. (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۴۰) اللہ تعالیٰ نے عقل کو خزانے میں پوشیدہ نور سے پیدا کیا، اپنے سابق علم سے اور علم کو اس کی ذات قرار دیا اور فہم کو اس کی روح قرار دیا، زُہد کو اس کا سر قرار دیا،

حیا کو اس کی آنکھ قرار دیا، حکمت کو اس کی زبان قرار دیا، خیر کو اس کے کان قرار دیا، رأفت کو اس کا دل قرار دیا، رحمت کو اس کا غم قرار دیا، صبر کو اس کا پیٹ قرار دیا، پھر اسے کہا گیا کہ تو بول، پھر وہ بولی اور کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَیْسَ لَهُ نِدٌّ وَلَا ضِدٌّ وَلَا مِثْلٌ وَلَا عَدْلٌ، اَلَّذِی ذَلَّ کُلُّ شَیْءٍ لِعِزَّتِهِ فَقَالَ الرَّبُّ: وَعِزَّتِی وَجَلَالِی مَا خَلَقْتُ خَلْقًا أَعَزَّ عَلَیَّ مِنْكَ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۴۰) تمام کامل تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، وہ ذات کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اس کا کوئی مقابل نہیں ہے، اس کے کوئی مثل نہیں ہے، اس کے کوئی برابر نہیں ہے، اس نے ہر چیز کو پست کیا اپنے غلبے کے لیے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت اور بزرگی کی قسم میں نے تجھ سے زیادہ عزت والی مخلوق پیدا نہیں کی۔

اسی طرح یہ بات بیان کی گئی ہے کہ آدم علیہ السلام نے جب چھینک ماری تو کہا: الحمدللہ، یہ ان کا پہلا کلام تھا، جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ مخلوقات میں پہلا مرتبہ عقل کا ہے اور اس کے آخری مراتب میں سے آدم ہے، عقل کی ابتدائی کلام الحمدللہ ہے اور آدم کی ابتدائی کلام بھی الحمد ہے، معلوم ہوا کہ مخلوقات کی ابتدائی کلام یہی کلمہ ہے اور مخلوقات کے خاتمے پر ابتدائی کلام یہی ہو گا، تو یقینی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کلمہ کو اپنی کتاب کے شروع میں کر دیا اور فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ابتدائی کلمات یہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں میں آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے پہلے اور بعد والے میں مناسبت ہے، وہ ایسے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول الحمدللہ کو اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی پہلی آیت بنا دیا اور جب یہ بات یونہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حمد کے لفظ سے دو نام محمد اور احمد رکھ دیئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَنَا فِی السَّمَاءِ أَحْمَدُ، وَفِی الْأَرْضِ مُحَمَّدٌ، میں آسمان میں احمد ہوں اور زمین میں محمد ہوں۔

آسمان والے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ زمین والوں کی تعریف کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، فَأُولٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوراً (الإِسْرَاءِ: ۱۹) یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کی کوشش قبول کی گئی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ ان زمین والوں کی تعریف کیے ہوئے ہیں۔

دوسرا نکتہ: کلمہ حمد نعمت اور رحمت کے حصول کے وقت ادا کیا جاتا ہے اور جب الحمد ابتدائی کلمات میں سے ہے تو پھر ضروری ہے کہ نعمت اور رحمت یہ ابتدائی افعال اور احکام میں سے ہوں، اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي. میری رحمت میرے غصے سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔

تیسرا نکتہ: رسول کریم ﷺ کا نام احمد ہے، اس کا مطلب ہے تعریفیں کرنے والوں میں سب سے زیادہ تعریف کرنے والے، تو پھر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر بہت زیادہ ہوں، کیونکہ کثرت حمد کثرت نعمت ورحمت کے سبب سے ہے، جب یہ بات اسی طرح ہے تو پھر لازم ہے کہ نبی کریم ﷺ کے حق میں تمام جہان والوں سے زیادہ رحمتیں ہوں، اسی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الْأَنْبِيَاءِ: ۱۰۷) اور ہم نے آپ ﷺ کو جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

چوتھا نکتہ: نبی کریم ﷺ کو بھیجنے والے کے دو نام رحمت سے مشتق ہیں، ایک رحمن اور دوسرا رحیم اور یہ دونوں مبالغے کا فائدہ دیتے ہیں، اسی طرح رسول کریم ﷺ کے بھی دو نام رحمت سے مشتق ہیں اور وہ ہیں احمد اور محمد، اس لیے کہ حمد کا حصول یہ رحمت کے حصول کے ساتھ مشروط ہے اور محمد اور احمد یہ دونوں مرحوم اور ارحم کے قائم مقام ہیں اور بعض روایات میں تو یہاں تک آیا ہے کہ حمد، حامد اور محمود نبی کریم ﷺ کے نام ہیں، تو نبی کریم ﷺ کے یہ پانچ نام رحمت پر دلالت کرتے ہیں، جب یہ بات ثابت ہو گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی تو دیکھا جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (الْحِجْرِ: ۴۹)

میرے بندوں کو خبر دیجیے کہ میں بخشنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

یہاں نبّی میں حضرت محمد ﷺ کی طرف اشارہ ہے، جو تمام بندوں سے پہلے مذکور ہے اور اس آیت میں حرف "ی" ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، اور پھر لفظ " أَنِّي " میں موجود "ی" بھی اس کی طرف راجع ہے اور لفظ " أَنَا " بھی اسی کی طرف راجع ہے اور الْغَفُوْرُ اور الرَّحِيْمُ یہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں، پس یہ پانچ الفاظ ہیں جو اللہ کریم اور رحیم پر دال ہیں، بندہ قیامت کے دن چل رہا ہو گا، رسول کریم ﷺ اپنے ان پانچ ناموں کے ساتھ جو رحمت پر دلالت کرتے ہیں ان کے ساتھ آگے آگے ہوں گے اور اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے رحمت پر دلالت کرنے والے پانچ نام ہوں گے اور رسول کریم ﷺ کی رحمت بہت زیادہ ہو گی،

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ، جب کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غیر متناہی (نہ ختم ہونے والی) ہو گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الْأَعْرَافِ: ۱۵۶) میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہو گی۔ اس لیے عاقل اور دانا لوگ ان دریاہائے رحمت سے نفع اٹھائیں، ان رحمت سے متلاطم دس دریاؤں کو کوئی عقل مند ضائع نہیں کر سکتا۔

رب العالمین

رب: لفظ رب کے اشتقاق میں اختلاف ہے اور اس میں چار تاویلیں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ یہ مالک کے لفظ سے مشتق ہے جیسے عربی میں کہا جاتا ہے رب الدار یعنی گھر کا مالک، دوسرا یہ سید کے لفظ سے مشتق ہے، کیونکہ سید (آقا) کو عربی میں رب کہا جاتا ہے، جیسے قرآن میں آتا ہے، أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْراً ([یوسف: ۴۱) یہاں رب بمعنی سردار کے ہے اور تیسرا رب مدبر کے معنی میں ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالأَحْبَارُ اس کا معنی ہے علماء، علماء کو ربانیین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علم کی وجہ سے لوگوں کے معاملات کو سنوارنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چوتھا رب تربیت سے مشتق ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَرَبَآئِبُكُمُ اللّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ (النساء: ۲۳) بیوی کے سابقہ شوہر کی اولاد کو ربائب کہنے کی وجہ یہی ہے کہ اب یہ اس خاوند کی تربیت میں ہوتے ہیں، علیٰ ھذا یہ اللہ کی صفت ہے کیونکہ وہ پرورش کرنے والا ہے، کیونکہ مالک اور سردار ہے اور یہ اس کی ذاتی صفات میں سے ہے، اگر یوں کہا جائے کہ وہ اپنی مخلوق کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے تو یہ اس کی فعلی صفت ہے، جب رب پر الف لام داخل کر دیا جاتا ہے تو یہ اس کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے، پھر اس کا استعمال اس کے بندوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ (النکت والعیون ابو الحسن ماوردی ج ا ص ۵۴)

مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لفظ رب کے ذیل میں لکھتے ہیں الہ کی طرح رب بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے، عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے، اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیے، پھر چونکہ معلم، استاذ اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا، چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربی" اور "رباہ" پرورش کنندہ معلم اور آقا تینوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

مولانا آزاد رحمہ اللہ لکھتے ہیں "بہر حال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں، لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیے، بعض ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے، هُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ (مفردات راغب اصفہانی)

یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔

اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہو گا، جُود ہو گا، احسان ہو گا، لیکن وہ بات نہ ہو گی جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ

پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو، کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہو گا ربوبیت سے نہیں ہو سکتا۔

ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے، بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی و نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں، یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے، پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں، ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے، حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدو خال پیدا کر دیئے ہیں یہ ماں کی ربوبیت ہے پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچے کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سروسامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا، جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی، جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی، جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی، پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی اور حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا، وہ صورتحال یہ جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جا سکتا ہے۔(ام الکتاب)

مولانا لکھتے ہیں "مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیت الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کرو، اس کے "رب العالمین" ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب وغریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے، ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔

چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے کیڑے مکوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں، لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو۔

اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملیں گی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلح (یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو، زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو) آنکھ سے ہم انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے، تاہم ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی مخلوق کے لیے سامان پرورش مہیا کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اور ایسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کی ہے اور پھر یہ جو کچھ بھی ہے انسان کے وجود سے باہر ہے، اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (۲۰) وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۲۱) الذاریات

ان لوگوں کے لیے جو(سچائی)یقین رکھنے والے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟(ام الکتاب ص۱۸)

سامان زندگی عطاء کرنے اور ربوبیت میں فرق

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ "لیکن سامان زندگی کی بخشایش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اگر دنیا میں ایسے عناصر، عناصر کی ایسی ترکیب اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے جو زندگی اور نشوونما کے لیے سودمند ہے تو محض اس کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی، ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے، بخشش ہے، احسان ہے مگر وہ بات نہیں ہے جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں سودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں بلکہ جو کچھ بھی بخشتی ہے ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر وجود کو زندگی اور بقاء کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس وقت اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح انہیں ان وقتوں میں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے اور اس نظم وانضباط سے تمام کارخانہ حیات چل رہا ہے۔ (ام الکتاب ص۱۸)

ربوبیت کا نظامِ تقسیم

مولانا آزاد پانی کی بخشش اور تقسیم کا نظام کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو یہ زندگی کے لیے کافی نہ تھا، کیونکہ زندگی کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ پانی موجود ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو، پس یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا

جاتا ہے اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازے کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے، تو یہی ربوبیت ہے اور اسی سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصور کرنا چاہیے، قرآن کہتا ہے یہ اللہ کی رحمت ہے، جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا، لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّا عَلَى ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُوْنَ (۱۸) فَأَنْشَأْنَا لَكُمْ بِهِ جَنَّاتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ لَّكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ (۱۹)(المؤمنون) اور (دیکھو!) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اسے واپس لے جائیں، پھر (دیکھو!) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انہیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔(ام الکتاب ص۱۹)

یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے، بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے؟ یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر میں پہلے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھادیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسادیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور اندرونی حصوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئیں

دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟ کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟ قرآن کہتا ہے، اس لیے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضی یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو، رحمت و حکمت یہی تھی جس نے پانی پیدا کیا، مگر یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں،

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (۴۸) الروم

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے، پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی، مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔ (ام الکتاب ۲۱،۲۰)

تقاضائے ربوبیت

پھر اس حقیقت پر غور کرو کہ زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، انہی کی بخشایش سب سے زیادہ اور عام ہے اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لیے تھی انہی میں اختصاص اور مقاومت پائی جاتی ہے، ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے، مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں، پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو، فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر

پھیلا ہوا ہے، جب کہیں اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمہارے لیے خود بخود مہیا ہو جائے گا، ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے،

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۳۰) الانبیاء)

اس لیے اس کی بخشایش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر ہر چیز سے زیادہ ہے، زمین کے نیچے آب شیریں کی سُوتیں بہہ رہی ہیں، زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں دواں ہیں، پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے، وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے، اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے، پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی، غذا، ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دستر خوان کرم بھی خشکی اور تری میں بچھا ہوا ہے۔ اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔ (ام الکتاب ۲۲)

ربوبیت کا عالمگیر نظام

پھر پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو، جو اپنے ہر گوشہ عمل میں پروردگی کی گود اور بخشش حیات کا سرچشمہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لیے بنا ہے کہ زندگی بخشنے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے، سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ کا اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے، ہوائیں اس لیے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بچھا دیں، کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش بنا دیں، زمین اس لیے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لیے اپنے سینے میں پروردگی رکھے، مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اس کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت استعداد ڈھونڈ رہی ہے اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے، جونہی کسی وجود میں بڑھنے

اور نشوونما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، معاً تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۱۳) الجاثیہ اور آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور فکر کرنے والے ہیں، اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ (ام الکتاب)

نظام ربوبیت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظام ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے، یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے، پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے، لیکن دونوں کی پرورش کے احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائے گا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جارہے ہیں۔

انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں، لیکن اگر ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لوگے کہ قانون پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے، پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لیے پیدائش ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامان پرورش مہیا ہو جاتا ہے۔

پھر طفولیت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں، انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے

درخت کے مولود نباتی کے لیے بھی طفولیت ہے اور تمہاری چشم ظاہر بیں کے لیے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو لیکن پتھر کی چٹان کا تودہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے، پھر طفولیت رشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، اس کی روزافزوں حالت کے مطابق کے بعد دیگرے سامان پرورش میں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔

یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سن کمال تک پہنچ جاتا ہے اور جب سن کمال تک پہنچ گیا تو از سر نو ضعف وانحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے، پھر اس ضعف وانحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لیے ایک ہی طرح ہے، کسی دائرے میں اسے مرجانا کہتے ہیں، کسی میں مرجھا جانا اور کسی میں پامال ہو جانا، الفاظ متعدد ہو گئے مگر حقیقت میں تعدد نہیں ہوا۔

اللّٰهُ الَّذِی خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (۵۴)(الروم) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے ، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ علم وقدرت رکھنے والا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيْعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے، پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں، پھر ان کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں، (پھر ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی پھر بالآخر

خشک ہو کر چُورا چُورا ہو گئی، بلاشبہ دانش مندوں کے لیے اس صورت میں بڑی ہی عبرت ہے۔ (سورت الزمر، آیت ۲۱)

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں، غور کرو! نظام ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیسا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے، دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔

سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے، جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی غذا اپنی خاصیتوں، مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو حالت طفولیت میں اس کے لیے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے، ماں بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔

پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بہ درجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے! ابتدا میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے، چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے، لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے، دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور مائیت کے مقابلے میں دھنیت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے، جوں ہی اس کا وقت آتا ہے ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے، یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے۔ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ کا ایک ٹکڑا) اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر ربوبیت الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کردی گئی ہے اور کس طرح اس جذبے کو طبیعت بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پرجوش اور سب سے زیادہ ناقابل تسخیر بنادیا گیاہے! دنیا کی کون سی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کرسکتی ہے، جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں؟ جس بچے کی پیدائش اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا (سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ کا ایک ٹکڑا) اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔

اس کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کردیتی ہے، جب تک بچہ سن بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا ہے وہ اپنے لیے نہیں بلکہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے، زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو اور راحت وآسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گریز ہو۔ (ام الکتاب ۲۶)

نکات

پہلا نکتہ: مربی دو قسم پر ہے ایک وہ جو کسی چیز کی اس لیے تربیت کرتا ہے تاکہ اسے اس سے فائدہ پہنچے اور دوسرا اس لیے تربیت کرے کہ مربی (جس کی تربیت کی جائے) کو فائدہ پہنچائے، تمام مخلوقات میں تربیت کی پہلی قسم کا رواج ہے، اس لیے کہ وہ دوسروں کی تربیت اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس پر انہیں نفع ملے چاہے ثواب ملے یا تعریف وستائش ملے اور دوسری قسم تربیت کی اللہ تعالیٰ کی ہے، جیسے اس نے فرمایا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں فائدہ پہنچے نہ یہ کہ میں تم سے فائدہ حاصل کروں، رب العالمین مربی ہے، محسن ہے، بخلاف باقی تربیت کرنے والوں اور باقی احسان کرنے والوں کے۔

دوسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ کی تربیت کا انداز دوسروں کی تربیت کے انداز سے مختلف ہے، اس کی ایک وجہ

تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تربیت کسی مفاد، مطلب یا کسی غرض سے نہیں کرتے، باقی لوگ اپنی اغراض کے لیے دوسروں کی تربیت کرتے ہیں، دوسروں کی غرض سے ان کی تربیت نہیں کرتے، پھر جب دوسرے لوگ کسی کی تربیت کرتے ہیں تو اس تربیت کے بقدر ان کے خزانوں اور ان کے مال میں کمی ہو جاتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نقصان اور ضرر سے بہت بلند ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ. (الحجر: ۲۱) ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، ہم ہر چیز ایک اندازے سے اتارتے ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے جب دوسرے محسنین کے سامنے کوئی فقیر الحاح اور زاری کرے تو احسان کرنے والا غصے ہو جاتا ہے، اس لیے وہ سوال کرنے والے کو محروم کر دیتا ہے اور اسے کچھ نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ اپنے سامنے الحاح اور زاری کرنے والوں سے خوش ہوتے ہیں، نہ مانگنے والوں سے ناراض ہوتے ہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ اللهَ تَعَالَى يُحِبُّ الْمُلِحِّيْنَ فِي الدُّعَاءِ. اللہ تعالیٰ مانگنے میں الحاح وزاری کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۹۹)

تیسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو احسان کرنے والے ہیں وہ جب تک احسان کا بدلہ نہ طلب کر لیں تب تک عطاء نہیں کرتے، جب کہ اللہ تعالیٰ سوال کرنے سے پہلے عطاء کرتے ہیں، اس کی مثال جیسے انسان ماں کے پیٹ میں ناتمام بچہ تھا، تو اس نے اس کی وہاں پرورش کی، ایسے حال میں جب کہ یہ جاہل اور غیر عاقل تھا، یہ اچھی طرح مانگ نہیں سکتا تھا، اسے ایسے حال میں اس نے بچایا اور اس پر احسان کیا، حالانکہ اس نے سوال نہیں کیا تھا، نہ ہی اسے سوال کرنے کی سمجھ تھی۔

چوتھا نکتہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ محسنین کا احسان فقر وفاقہ، عدم حاضری یا مرنے کے باعث ختم ہو جاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا احسان یقینی طور پر ختم نہیں ہوتا۔

پانچواں نکتہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ احسان کرنے والوں کا احسان کسی ایک قوم کے ساتھ خاص ہوتا ہے، اس میں عموم نہیں ہوتا اور عموم ممکن بھی نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان اور اس کی تربیت تمام

کو پہنچتی ہے، جیسے ارشاد ہے،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الْأَعْرَافِ: ۱۵۶) میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے، اپنی تمام مخلوق کی طرف احسان کرنے والا ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حق میں ارشاد فرمایا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

چھٹا نکتہ: رب العالمین نے بندے کی کس کس طرح پرورش کی ہے؟ یہ ایک غیر متناہی سلسلہ ہے، انسان اگر غور کرے کہ کس طرح اس نے اس کے باپ کی صلب سے ماں کے رحم میں منتقل کیا، پھر یہ وہاں پہلے مرحلے میں ایک لوتھڑا بنا، پھر دوسرے مرحلے میں بوٹی بنا، پھر وہاں اس سے مختلف اعضاء بنے، جیسے نرم ونازک ہڈیاں، آنتیں، داڑھیں، رگہائے حیات، رگہائے دل، پھر بعض کو بعض کے ساتھ جوڑا، پھر ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص قسم کی مضبوطی حاصل ہوئی۔

فَحَصَلَتِ الْقُوَّةُ الْبَاصِرَةُ فِي الْعَيْنِ، وَالسَّامِعَةُ فِي الْأُذُنِ، وَالنَّاطِقَةُ فِي اللِّسَانِ، فَسُبْحَانَ مَنْ أَسْمَعَ بِعَظْمٍ، وَبَصَّرَ بِشَحْمٍ، وَأَنْطَقَ بِلَحْمٍ، پھر قوت باصرہ آنکھوں میں آئی، قوت سامعہ کانوں میں آئی، قوت گویائی زبان میں آئی، اللہ تعالیٰ کی پاک ذات ہے جس نے ہڈی کو سنوایا، جس نے چربی کو دکھلایا، جس نے گوشت کو بلوایا، انسانی پوسٹ مارٹم میں یہ ساری چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور یہ ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی پرورش پر دلالت کرتی ہیں۔

ساتواں نکتہ: ایک دانہ جب زمین میں پڑتا ہے، پھر اسے زمین کی تراوٹ پہنچتی ہے تو وہ پھول جاتا ہے، مگر وہ کسی کنارے کی طرف سے پھٹتا نہیں ہے، وہ صرف اوپر سے پھٹتا ہے یا نیچے سے پھٹتا ہے، حالانکہ وہ ہر طرف سے پھولا ہوا ہوتا ہے اور اس کے اوپر والی پھٹن سے ایک ایسا حصہ نکلتا ہے جو بلند ہوتا ہے اور نیچے والی پھٹن سے ایک ایسا حصہ نکلتا ہے جو زمین میں پیوست ہو جاتا ہے، یہ اس درخت کی جڑیں ہوتی ہیں، اس کا جو حصہ بلند ہوتا ہے بلندی کے بعد اسے تنا حاصل ہوتا ہے، پھر اس تنے سے بہت سی ٹہنیاں الگ ہوتی ہیں، پھر ان ٹہنیوں پر پہلے تو کلیاں چٹکتی ہیں، پھر ان پر پھل

آتا ہے، پھر ان پھلوں کے کثافت اور لطافت کے لحاظ سے حصے ہوتے ہیں۔

ان درختوں کی چھال ہے، پھر ان کا مغز ہے، پھر ان میں موجود رس ہے اور جو اجزا اس کے زمین کے اندر رہوتے ہیں وہ اس کے کناروں پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں اور یہ کنارے لطافت میں ایسے ہوتے ہیں گویا کہ پانی کے سوتے ہیں اور انتہائی لطیف ہونے کے باوجود سخت زمین میں گھس جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی جاذبیت رکھی ہے کہ یہ زمین کے لطیف اجزا کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان تمام تدبیرات میں حکمت یہ کارفرما ہے کہ بندے کی تمام ضروریات چاہے وہ غذا ہو، سالن ہو، پھل ہو، پینے کی چیزیں ہوں، دوا دارو ہو یہ سب کچھ حاصل کرنا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا. ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (عَبَسَ: ۲۵، ۲۶) ہم نے اوپر سے گرتا ہوا پانی ڈالا، پھر ہم نے چیرا زمین کو پھاڑ کر۔

آٹھواں نکتہ: اللہ تعالیٰ نے آسمان اور ستارے پیدا کیے، ان کی حیثیت یہ ہے کہ یہ بندوں کی مصلحتوں کے حصول کے ذرائع ہیں، اسباب ہیں، اللہ تعالیٰ نے رات کو پیدا کیا تاکہ وہ راحت اور سکون کا ذریعہ ہو، دن کو اس لیے پیدا فرمایا تاکہ وہ معاش اور حرکت کا ذریعہ اور سبب ہو، ارشاد ہے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُورًا وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ، (یونس: ۵) وہی ذات ہے جس نے بنایا سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو چاندنا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو، یہ سب کچھ اللہ نے تدبیر سے بنایا۔

اسی طرح ستاروں کے بارے میں ارشاد ہے هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الْأَنْعَامِ: ۹۷) وہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعے اندھیروں میں جنگل اور دریا کے راستے معلوم کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے زمین اور پہاڑوں کا ذکر کیا، ارشاد ہے أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَاداً وَّالْجِبَالَ

أَوْتَادًا (النبأ: ۵، ۶) کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟

جب انسان معادن، نباتات، حیوانات اور قدرت والے کی طرف سے زمین اور آسمان کو پیدا کرنے کی واضح حکمتیں دیکھے اوران پر غور کرے تو انسانی عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ اللہ تعالیٰ کے اسباب تربیت اور پرورش بہت زیادہ ہیں اوراس کی رحمت کے دلائل ظاہر ہیں، اس غوروفکر کے بعد انسان کے سامنے اللہ رب العالمین کے بحر اسرار ورموز کا ایک قطرہ ظاہر ہو گا۔

نواں نکتہ: انسان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت سی مخلوقات ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (المدثر: ۳۱) اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

پھر اس انسان کو علم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات کے سوا اس کا کوئی رب نہیں ہے، پھر وہ اس طرح اس انسان کی تربیت کرتا ہے گویا کہ اس کے سوا اس کا کوئی بندہ ہی نہیں ہے اور تو اس طرح اس کی خدمت کرتا ہے گویا کہ اس کے علاوہ بھی تیرا کوئی رب ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا انداز تربیت کس قدر بہترین اور خوبصورت ہے کہ وہ دن کے اجالے میں آفات سے تیری حفاظت کرتی ہے، بغیر کسی معاوضے کے اور رات کی تاریکی میں تیری حفاظت کرتی ہے بغیر کسی معاوضے کے۔

پھر اس انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا کے بادشاہوں کی چوکیدار اور پہریدار حفاظت کرتے ہیں، تو کیا اللہ کی بھی حشرات سے اور بلیات اور آفات سے حفاظت کی جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے، تو وہ ذات عالی آفات، بلیات، مصائب سے اس کی حفاظت کا انتظام وانصرام کرتی ہے، اسے خوفزدہ کرنے والی چیزوں سے بچاتی ہے، رات کی تاریکی میں منکرات اور محرمات کی تمام انواع واقسام سے اسے بچاتی ہے، یہ کتنی بڑی اور کس قدر بہترین تربیت ہے اور کیا یہ بات بھی تربیت نہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلْاٰدَمِیُّ بُنْیَانُ الرَّبِّ، مَلْعُوْنٌ مَنْ هَدَمَ بُنْیَانَ الرَّبِّ (تعریفات جرجانی و تفسیر کبیر) آدمی

رب تعالیٰ کی عمارت ہے اور وہ شخص ملعون ہے جو رب تعالیٰ کی عمارت کو گراتا ہے۔اسی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ (الْأَنْبِيَاءِ: ۴۲) آپ کہہ دیجیے ! دن اور رات میں رحمٰن سے تمہاری نگرانی کون کرتا ہے ؟ایسا کرنے والی ذات ایک جبار بادشاہ کی ہے، ایک اکیلے اور قہار کی ہے، دلوں اور آنکھوں کو پلٹنے والے کی ہے، پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں پر مطلع کرنے والے کی ہے۔

اَلعَالَمِینَ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ العالمین سے مراد جنات اور انسان ہیں، حضرت مجاہد بھی یہی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جنات اورانسان ہیں، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ میں بھی اس کے ساتھ مطابقت پائی جاتی ہے، ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل کی ہے اس کے مطابق رب العالمین سے تمام مخلوق کا معبود مراد ہے۔ تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، تمام زمینیں اور جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، جو معلوم ہے اور جو نامعلوم ہے، سب کا وہ معبود ہے۔

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں، ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں، ابن عدی نے کامل میں، ابو الشیخ نے العظمت میں، امام بیہقی نے شعب الایمان میں، خطیب نے تاریخ میں ایک کمزور سی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک سال ٹڈیاں کم ہو گئیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں پوچھا، کسی نے کوئی خبر نہیں دی، آپ رضی اللہ عنہ بہت غمگین ہو گئے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ایک سوار کو بھیجا جو کداء کی طرف گیا اور دوسرا سوار عراق کی طرف گیا، یہ لوگوں سے پوچھتے جاتے تھے کہ کسی نے ٹڈیاں دیکھی ہیں یا کہ نہیں؟ اتنے میں آپ کے پاس یمن کی طرف سے ایک سوار مٹھی بھر ٹڈیاں لایا اور اس نے وہ ٹڈیاں آپ کے سامنے ڈال دیں، جب حضرت عمر نے انہیں دیکھا تو اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا: کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے خَلَقَ اللهُ أَلْفَ أُمَّةٍ، سِتُّمِائَةٍ

فِي الْبَحْرِ وَأَرْبَعُمِائَةٍ فِي الْبَرِّ، فَأَوَّلُ شَيْءٍ يَهْلِكُ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَمِ الْجَرَادُ، فَإِذَا هَلَكَ تَتَابَعَتْ مِثْلَ النِّظَامِ إِذَا قُطِعَ سِلْكُهُ (تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۳۳، التفسیر الوسیط للواحدی ج ۲ ص ۴۰۱، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۱۰ ص ۱۱) اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار امتیں پیدا کی ہیں، سات سو سمندر میں، چار سو خشکی میں، پس سب سے پہلے جو چیز ان امتوں سے ہلاک ہو گی وہ ٹڈیاں ہوں گی، جب یہ ہلاک ہوں گی تو اس طرح تسلسل کے ساتھ ہلاکتیں ہوں گی جس طرح پروئے دانوں کا دھاگا ٹوٹ جائے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ العالمین سے مراد تمام اصناف عالم ہیں۔ ابو الشیخ نے کہا کہ عالم ایک ہزار امت ہے، ان میں سات سو دریاؤں میں اور چار سو خشکی میں ہیں۔

ابو العالیہ نے رب العالمین کے بارے میں کہا ہے کہ انسانوں کا ایک عالم ہے، جنات کا ایک عالم ہے، ان دو کے علاوہ اٹھارہ ہزار عالم فرشتوں کے ہیں، زمین کے چار گوشے ہیں، ہر گوشے میں تین ہزار پانچ سو عالم ہیں، ان سب کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ العالمون سے مراد فرشتے ہیں، ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت وھب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ إِنَّ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ أَلْفَ عَالَمٌ الدُّنْيَا مِنْهَا عَالَمٌ وَّاحِدٌ، اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں، عالم دنیا ان میں سے ایک ہے۔ (الدر المنثور فی التفسیر بالماثور ج ا ص ۳۴)

اسی طرح علامہ قرطبی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں، دنیا ان میں سے ایک ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ إِنَّ لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ أَلْفَ عَالَمٍ، الدُّنْيَا مِنْ شَرْقِهَا إِلَى غَرْبِهَا عَالَمٌ وَّاحِدٌ. اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں، مشرق سے مغرب تک دنیا ایک عالم ہے۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الْعَالَمُونَ ثَمَانُونَ أَلْفَ عَالَمٍ، أَرْبَعُونَ أَلْفَ عَالَمٍ فِي

الْبَرِّ، وَأَرْبَعُونَ أَلْفَ عَالَمٍ فِي الْبَحْرِ. اسی ہزار جہان ہیں، ان میں سے چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں ہیں۔

ربیع بن انس نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے کہ الْجِنُّ عَالَمٌ، وَالْإِنْسُ عَالَمٌ، وَسِوَى ذٰلِكَ لِلْأَرْضِ أَرْبَعُ زَوَايَا فِي كُلِّ زَاوِيَةٍ أَلْفٌ وَخَمْسُمِائَةِ عَالَمٍ، خَلَقَهُمْ لِعِبَادَتِهِ. جنات ایک عالم ہے اور انسانوں کا عالم اس کے علاوہ ہے، زمین کے چار گوشے ہیں، ہر گوشہ میں پندرہ سو عالم ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (قرطبی ج ۱

علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ لکھتے ہیں، عالمین سے مراد یہاں فرشتوں، انسانوں، جنات میں سے اہل علم و ادراک ہی، امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے یہ بات منقول ہے کہ اس سے مراد صرف لوگ ہیں، جیسے قرآنی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں جیسے قرآن میں ہے أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ (الشعراء: ۱۶۵) یہاں عالمین سے مراد لوگ ہیں، اسی طرح ارشاد ہے لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان: ۱) یہاں بھی عالمین سے لوگ مراد ہیں۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ عالمین علم (بکسر عین) سے مشتق ہے، بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ علامت سے مشتق ہے۔ (تفسیر المنار ج ۱ ص ۴۲)

علامہ محمد طاہر التونسی لکھتے ہیں کہ عالم موجودات کی اجناس میں سے ایک جنس ہے، عرب نے اسے فاعل کے وزن پر بنایا ہے اور یہ علم سے مشتق مانا ہے، یا علامت سے، کیونکہ ہر جنس کو اس کے غیر سے ممتاز کرنے والی کوئی علامت ہوتی ہے، کوئی چیز اس کے ذریعے سے معلوم کی جاتی ہے اس لیے اسے اس کے غیر کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جا سکتا اور یہ بناء اس کے ساتھ خاص ہے کہ یہ آلہ ہے، جیسے خَاتم، قالَب، طَابَع، عرب نے اسے عوالم بنایا کیونکہ یہ صانع کے علم کو جاننے کا آلہ ہے، یا علم کی حقیقتوں کو جاننے کا آلہ ہے (التحریر والتنویر ج ۱)

علامہ ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عالمین عالم کی جمع ہے، اس لفظ سے اس کا واحد نہیں آتا، یہ مثل

رَهْطٌ قَوْمٌ، اَهْلٌ کے ہے۔

عالم میں اختلاف ہے اوراس کی تین تاویلیں کی گئی ہیں، ایک ان میں سے عاقل ہے جیسے فرشتے، انسان، جنات اوردوسری دنیا اورمافیہاہے اور تیسری عالم اس کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے دنیااور آخرت میں پیدا کیاہے، پھراس کے اشتقاق میں دووجوہ ہیں، ایک یہ کہ یہ علم سے مشتق ہے، یہ تاویل ان کی ہے جنہوں نے عالم کولمایعقل کا اسم بنایاہے اور دوسرا یہ مشتق ہے علامت سے، کیونکہ یہ خالق کائنات پر دلالت ہے، یہ تاویل ان کے قول پر ہے جنہوں نے کہاکہ عالم تمام مخلوق کا نام ہے۔(تفسیر الماوردی ج اص ۵۴)

علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عالم یہ فلک اوراس کے مشتملات کا نام ہے اوراس میں موجود تمام جواہراوراعراض کانام ہے، دراصل یہ نام ہےاس چیز کاجس کے ذریعے کوئی چیز معلوم کی جائے۔

بعض نے اس سے مخلوق کی تین اصناف مرادلی ہیں، فرشتے، انسان اور جنات، ان کے علاوہ باقی مخلوقات کوان میں شامل نہیں کیاگیا، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد انسان ہیں اوران میں سے ہرایک عالم ہے۔

جعفربن محمد کہتے ہیں کہ عالم دوقسم پرہیں،ایک عالم کبیراوردوسرا عالم صغیر، عالم کبیر سے مراد فلک اوراس میں جوکچھ ہے اورعالم صغیر سے مراد انسان ہے، اس لیے تمام انسانوں کوعالم کہا گیاہے اس لیے اس میں عالم اکبر کے جواہرپائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ چار چیزوں سے مرکب ہے، وَلِاَنَّ لَحْمَهُ كَالْاَرْضِ الرَّخْوَةِ وَعِظَامَهُ كَالْجِبَالِ وَدَمَهُ الْجَارِیْ فِي الْعُرُوْقِ كَالْمِيَاهِ فِي الْاَنْهَارِ وَنَفْسَهُ كَالرِّيْحِ وَشَعْرَهُ كَالنَّبَاتِ وَفِيْهِ مِنَ الْمَلَكِ الْعَقْلُ وَمِنَ الْبَهَائِمِ الشَّهْوَةُ وَمِنَ النَّبَاتِ النُّمُوُّ وَالتَّغَذِّی (تفسیر الراغب اصفہانی ج اص ۵۵)

اس کا گوشت زمین کی طرح ہے، اس کی ہڈیاں پہاڑوں کی طرح ہیں، اس کی رگوں میں دوڑتا

ہوا خون نہروں میں چلتے پانی کی طرح ہے، اس کا سانس ہوا کی طرح ہے، اس کے بال نباتات کی طرح ہیں، ان میں فرشتے عاقل ہیں، جانوروں میں خواہشات ہیں، نباتات میں نشوونما ہے، غذائیت ہے، اس سب سے صانع کی وحدانیت کی خبر ملتی ہے، جیسے عالم کبیر سے معلوم ہوتا ہے۔

عالم کیا ہے؟

امام رازی رحمہ اللہ انواع واقسام عالم کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ موجودات یا تو واجب لذاتہ ہیں یا ممکن لذاتہ ہیں، واجب لذاتہ ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اگر ممکن لذاتہ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ عالم ہے، کیونکہ متکلمین کہتے ہیں کہ اَلْعَالَمُ کُلُّ مَوْجُوْدٍ سِوَی اللّٰہِ، اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود وہ عالم ہے۔

اس قسم کو عالم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتا ہے، اس سبب سے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود کا نام عالم رکھا گیا ہے، امام رازی کہتے ہیں کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو پھر ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہر چیز یا تو متحیز ہوگی یا متحیز کی صفت ہوگی، یا متحیز ہوگی اور نہ ہی متحیز کی صفت ہوگی۔

پس یوں تین اقسام ہوئیں پہلی قسم متحیز وہ ہے کہ یا تو وہ تقسیم کو قبول کرے گی یا کہ نہیں، اگر تقسیم کو قبول کو قبول کرے تو وہ جسم ہے، اگر وہ تقسیم کو قبول نہ کرے تو وہ جوہر ہے، بہرحال جسم یا تو اجسام عُلویہ میں سے ہوگا یا اجسام سُفلیہ میں سے ہوگا۔

بہرحال اجسام علویہ جیسے افلاک اور کواکب اور شریعت سے ان دو قسموں کے علاوہ بھی اشیاء ثابت ہوئی ہیں جیسے عرش، کرسی، سدرۃ المنتہیٰ، لوح، قلم اور جنت اور اجسام سُفلیہ یا تو مفرد ہوں گے یا مرکب؟ مفرد ہوں تو وہ چار عناصر ہیں، ان میں ایک کرۂ زمین، اس میں جنگل، پہاڑ، آباد شہر وغیرہ ہیں اور دوسرا کرۂ پانی ہے، وہ بحر محیط ہے، بڑے بڑے دریا ہیں، بڑی بڑی وادیاں ہیں، جن

کی تعداد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور تیسرا کرۂ ہوائی ہے اور چوتھا کرۂ نار ہے اور اجسام مرکبہ وہ نباتات ہیں، عادن ہیں، حیوان ہیں، اسی طرح ان کی بہت زیادہ اقسام ہیں اور مختلف ہیں۔

اور دوسری قسم وہ ممکن ہے جو متحیز کی صفت ہے، پس یہ اعراض ہیں، متکلمین نے اعراض کی اجناس میں سے چالیس کے قریب ذکر کی ہیں۔

اور تیسری قسم، وہ ممکن جو نہ تو متحیز ہو اور نہ ہی متحیز کی صفت ہو، پس یہ روحیں ہیں اور روحیں یا تو سُفلی ہوں گی یا عُلوی ہوں گی، پھر سُفلی یا تو نیک ہوں گی اور وہ نیک جنات ہیں یا شرارتی اور خبیث ہوں گی اور وہ سرکش شیاطین ہیں، اور علوی روحیں یا تو اجسام کے ساتھ متعلق ہوں گی اور یہ فلکی روحیں ہیں، یا اجسام کے ساتھ متعلق نہیں ہوں گی، یہ پاکیزہ اور مقدس روحیں ہیں، اسی میں اشارہ ہے موجودات عالم کی تقسیم کی طرف، اگر انسان ان اقسام کی شرح لاکھ جلدوں میں بھی لکھنا چاہے تو ان اقسام کے کم سے کم مراتب کو بھی نہیں پہنچ سکتا، ہاں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ واجب الوجود لذاتہ ایک ہی ذات ہے تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس کے سوا ہر ممکن لذاتہ ہے، جو اپنے وجود میں واجب لذاتہ کے ایجاد کرنے کی محتاج ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ ممکن اپنے حال پر باقی رہنے میں باقی رکھنے والے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ (کبیر ۱:۱۹۹)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ العالمین عالم کی جمع ہے، جس میں دنیا کی تمام اجناس، آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضا، برق و باراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان، نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لیے رب العالمین کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظام شمسی و قمری اور برق و باراں اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، یہ سارا ایک ہی عالم ہو اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں، امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم

سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائل عقلیہ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اس نے اس لامتناہی خلاء میں ہمارے پیش نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

مفتی شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلاء میں انسانی مزاج کے مناسب ہوا نہیں ہوتی، اس لیے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، امام رازی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اس عالم سے خارج خلاء میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلاء میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج وطبائع، ان کی غذا وہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہوں۔ (معارف القرآن ج ا ص ۸۱)

الرحمن الرحیم

الرحمن اورالرحیم کے بارے میں کچھ گزارشات بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر میں عرض کر دی گئی ہیں، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم یہاں موقع اور محل کی مناسبت سے کچھ مزید گزارشات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے، تاکہ کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ الجامع لاحکام القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رب العالمین کے بعد الرحمن اورالرحیم کے ساتھ اپنے کو موصوف کیا ہے کہ وہ رب العالمین رحمن اوررحیم ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا رب العالمین کی صفت کے ساتھ موصوف ہونا اس میں ترھیب تھی اس کے بعد الرحمن اورالرحیم کا ذکر کرکے ترغیب بھی اس کے ساتھ شامل کر دی، تاکہ ترھیب اور ترغیب والی صفات اکٹھی ہو جائیں، تاکہ یہ صفات بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے پر معین اور مددگار بن جائیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَبِّئْ عِبَادِيْٓ أَنِّيْٓ أَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. وَأَنَّ

عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ (۵۰، ۴۹الحجر) میرے بندوں کو بتایئے کہ بے شک میں بخشنے والا، مہربان ہوں اور بے شک میرا عذاب دردناک عذاب ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (۳غافر) گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا، انعام وقدرت والا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الْعُقُوبَةِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ اَحَدٌ وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ اَحَدٌ (مسلم باب فی سعۃ رحمۃ اللہ) اگر مومن کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر سزا ہے تو اس کی جنت کا طمع کوئی نہ کرے اور اگر کافر کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رحمت کس قدر ہے تو کوئی بھی اس کی جنت سے مایوس نہ ہو۔ (قرطبی ج ۱ ص ۱۳۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ الرحمن اور الرحیم یہ دو نام ہیں جن میں رقیت ہے، ایک دوسرے سے بڑھ کر رقت والا معنی رکھتا ہے، اہل علم کے ان دو ناموں کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں معنی کے لحاظ سے ایک ہیں، جیسے ندمان اور ندیم، ان دونوں کا معنی ہے رحمت والا۔ مبرد کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے انعام کے بعد انعام کرنا، فضل کے بعد فضل کرنا، بعض نے ان میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ الرحمن عموم کے معنی میں ہے اور رحیم خاص معنی میں ہے، رحمن کا معنی ہے دنیا میں رزق دینے والا، اس میں عموم ہے اس سے مراد ہے کہ تمام مخلوق کو رزق دینے والا۔ اور رحیم کا معنی ہے آخرت میں معاف کرنے والا اور آخرت میں معافی کا تعلق صرف اہل ایمان کے ساتھ ہے، رحمن کا معنی ہے جس کی رحمت تمام مخلوق کو علی العموم پہنچے اور رحیم کا معنی ہے جس کی رحمت مخلوق کو علی الخصوص پہنچے، اس لیے تو رحیم کا لفظ اللہ تعالیٰ کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے جب کہ رحمن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے علاوہ پر نہیں بولا جاتا، معلوم ہوا کہ رحمن معنی کے لحاظ سے عام ہے اور لفظ کے لحاظ سے خاص ہے اور رحیم لفظ کے لحاظ سے عام ہے اور معنی کے لحاظ سے خاص ہے۔

(تفسیر بغوی ج ا ص ۵۱)

نکتہ: رحمن ایسے منعم کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرح کے انعام کا صدور اس کے بندوں سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور رحیم ایسے منعم کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرح کی نعمتوں کا صدور اس کے بندوں سے تصور کیا جاسکتا ہے۔

پرورش اور تربیت کا اِلٰہی نظام

رحمن اور رحیم اللہ کس طرح اپنے بندوں کی پرورش اور حفاظت کرتا ہے اس پر امام رازی نے اپنی تفسیر میں چند عجیب واقعات نقل فرمائے ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں کسی کے ہاں مہمان تھا، میزبان نے دستر خوان پھیلا دیا اوپر سے ایک کوّا آیا جس نے روٹی اٹھائی اور چلتا بنا، میں تعجب کرتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا، وہ کوّا ایک ٹیلے پر جا اترا، وہاں ایک آدمی تھا جس کے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے، چنانچہ اس کوّے نے یہ روٹی اس کے منہ پر ڈال دی۔ (تفسیر کبیر ج ا)

حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ سے روایت کی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ میں گھر میں تھا، میرے دل میں ایک ولولہ آیا، میں ایسا ہو گیا کہ مجھے اپنے پر قابو نہ رہا، میں گھر سے نکل کر دریائے نیل کے کنارے چلا گیا، میں نے وہاں ایک مضبوط قسم کے بچھو کو دوڑتے ہوئے دیکھا، میں اس کے پیچھے ہو لیا تو وہ دریائے نیل کے کنارے سے مل گیا۔

میں نے ایک مینڈک دیکھا، جو وادی کی ایک طرف کھڑا تھا، بچھو نے مینڈک کی پیٹھ پر چھلانگ لگا دی، مینڈک اسے لے کر تیرنا شروع ہوا اور اسے لے گیا، میں کشتی میں سوار ہوا اور ان کا پیچھا شروع کر دیا، میں نے دیکھا کہ مینڈک اسے لے کر دریائے نیل کے دوسرے کنارے کی طرف پہنچ گیا۔

اب یہاں بچھو اس کی پیٹھ سے اتر گیا اور اس نے دوڑنا شروع کر دیا، میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

نوجوان ایک درخت کے نیچے سویا ہوا ہے اور ایک سانپ اس کو ڈسنا چاہ رہا تھا کہ اس بچھو نے سانپ پر چھلانگ لگائی اور اسے ڈنک مارا، سانپ نے بھی بچھو کو ڈسا، دونوں اکٹھے ہی مر گئے اور یہ انسان ان دونوں سے محفوظ رہا۔ (تفسیر کبیر)

یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ جب کوے کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے تو پروں اور بالوں کے بغیر ہوتا ہے، وہ گوشت کے سرخ ٹکڑے کی طرح ہوتا ہے، کوا اسے دیکھ کر بھاگتا ہے اور اس کی پرورش نہیں کرتا، پھر مچھر اس کے ارد گرد اکھٹے ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ بچہ مردار کے سرخ گوشت کی طرح ہوتا ہے، جب وہ مچھر اس تک پہنچتے ہیں تو وہ ان مچھروں کو ایک ہی لقمہ بنا ڈالتا ہے اور ان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے، یہ بچہ مضبوطی پکڑنے، بال اگنے اور گوشت کا ان بالوں کے نیچے چھپنے تک اسی حال میں رہتا ہے، جب یہ صورت ہو جاتی ہے تو اس کی ماں اس کی طرف واپس آتی ہے۔

اسی وجہ سے اہل عرب کی دعاؤں میں یہ جملے آئے ہیں یَا رَازِقَ النَّعَّابِ فِي عُشِّهِ، اے کوّوں کو ان کے گھونسلے میں رزق دینے والے۔

امام رازی رحمہ اللہ یہ مثالیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ فَظَهَرَ بِهٰذِهِ الْأَمْثِلَةِ أَنَّ فَضْلَ اللهِ عَامٌّ، وَإِحْسَانَهُ شَامِلٌ، وَرَحْمَتَهُ وَاسِعَةٌ ان مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل عام ہے، اس کا احسان سب پر ہے اور اس کی رحمت بہت ہی وسیع ہے۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۲۰۲)

رحمت اور نقمت

حوادث دو قسم پر ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض چیزوں کو رحمت خیال کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس طرح نہیں ہوتیں، بلکہ وہ درحقیقت عذاب اور نقمت ہوتی ہیں اور بعض وہ ہوتی ہیں جن کو بظاہر عذاب اور نقمت سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ درحقیت احسان اور فضل اور رحمت ہوتی ہیں، ان میں پہلی قسم کی مثال جیسے ایک والد اپنی اولاد کو کھلا چھوڑ دے وہ جو چاہے کرتی پھرے، وہ

ان کی پرورش نہیں کرتا، ان کوادب نہیں سکھاتا اورنہ ہی ان کی تعلیم کی پرواہ کرتاہے، یہ بظاہر توبڑی مہربانی، شفقت، محبت، پیار دکھائی دیتاہے، حالانکہ یہ سراسر اولاد کے ساتھ زیادتی ہے، اس کے ساتھ دشمنی ہے، اسے خراب کرنے کی ایک لاشعوری کوشش ہے، یہ اولاد کے ساتھ مہربانی اوررحمت نہیں بلکہ اسے عذاب اور سزادیناہے۔

اوردوسری قسم جیسے والد نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے کسی مکتب میں ڈال دیا ہو، اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے پابند کردیاہو، اس پر اپنی مرضی سے وقت گزارنے پر پابندی لگارکھی ہو، تو یہ بظاہر ایک سزا معلوم ہوتی ہے، حالانکہ یہی فی الحقیقت رحمت ہے، اولاد پر شفقت ہے، اس کے ساتھ مہربانی ہے، جیسے انسانی ہاتھ کو کوئی ایسی بیماری لگ جائے جو اس کے ہاتھ کو کھوکھلا کردے، اسے کینسر ہوجائے تو اس ہاتھ کو کاٹ پھینکنا یہی رحمت اور مہربانی ہے، حالانکہ بظاہر یہ سزا اور عذاب لگتاہے، اسی طرح ابلہ اور بے وقوف چیزوں کے ظاہر کو دیکھتاہے جب کہ اہل عقل وخرد چیزوں کی گہرائی اور عواقب کو دیکھتے ہیں۔

ان مثالوں کو دیکھ کر اندازہ لگانا آسان ہے کہ دنیامیں جس قدر آزمائشیں، بلائیں، دکھ اور مشقت ہے اگرچہ وہ بظاہر عذاب اور سزا دکھائی دیتی ہیں مگر وہ فی الحقیقت رحمت اور حکمت کا تقاضا ہوتی ہیں ۔جیسے عرب کہتے ہیں کہ

إِنَّ تَرْكَ الْخَيْرِ الْكَثِيرِ لِأَجْلِ الشَّرِّ الْقَلِيلِ شَرٌّ كَثِيرٌ، بہت سی خیر کو تھوڑے شر کی وجہ سے چھوڑنا یہ زیادہ شر ہے، کیونکہ ان تکالیف سے روح کو جسم کے علائق سے پاک کرنا مقصود ہوتاہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ (الإِسْرَاءِ: ۷) اگر آپ نے اچھائی کی تو اس اچھائی کا فائدہ آپ ہی کو ہوگا۔

آگ کو پیدا کرنے کا مقصد صَرْفُ الْأَشْرَارِ إِلَى أَعْمَالِ الْأَبْرَارِ، وَجَذْبُهَا مِنْ دَارِ الْفِرَارِ إِلَى دَارِ الْقَرَارِ، شریر لوگوں کو نیک لوگوں کے اعمال کی طرف پھیرنا ہے اور انہیں دار الفرار سے

دار لقرار کی طرف کھینچنا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ (الذّٰرِيَاتِ: ۵۰) لوگو! اللہ کی طرف بھاگو۔ اور اس باب میں قریب ترین مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ ہے کہ حضرت موسیٰ ظاہری احکامات کو دیکھتے تھے، اسی لیے انہوں نے کشتی کا اکھاڑنا، بچے کا قتل کرنا اور گرتی دیوار کو سیدھا کرنے کو ناپسند کیا جانا اور حضرت خضر حقائق اور رموز واسرار کو دیکھتے تھے، اسی لیے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا. وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا. فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا. وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ

کشتی مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں، کیونکہ ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جس کے ہرکارے ہر کشتی کو غصب کے طور پر پکڑ لیتے تھے اور لڑکے کے والدین مومن تھے، ہمیں ڈر لگا کہ وہ لڑکا اپنے والدین کو سرکشی، طغیان اور کفر میں مبتلا کر دے گا اور دیوار شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی، جس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا اور ان دونوں کا باپ نیک آدمی تھا، تیرے رب نے چاہا کہ یہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں تو پھر یہاں سے اپنا خزانہ نکال لیں گے، یہ تیرے رب کی رحمت ہے۔ (سورۃ الکہف ۸۲،۷۹)

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ حکیم محقق وہ ہے جس کے کام حقائق پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ ظاہر پر، جب انسان دیکھے کہ کوئی چیز اس کی طبیعت کو ناپسند ہو رہی ہے، انسانی عقل اس چیز سے نفرت کر رہی ہے تو پھر اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اس کی تہہ میں کچھ راز پوشیدہ ہیں، کوئی حکمت بالغہ اس میں پنہاں ہے، رب العالمین کی رحمت اور حکمت کا تقاضا یہی ہے، جب یہ بات سمجھ آگئی تو پھر رموز و

اسرار کے دریائے مواج سے الرحمن اور الرحیم کی حکمتیں معلوم ہو جائیں گی۔

نکات

پہلا نکتہ: الرحمن اور الرحیم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے دو خاص نام ہیں، ان میں رحیم اللہ پر بھی بولا جاتا ہے اور اللہ کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے، جب کہ رحمن اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کسی اور کو رحمان نہیں کہا جاسکتا، یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ الرحمن بڑا نام ہے اور الرحیم اس سے کم ہے، یہاں اعلیٰ کے بعد ادنی کا کیوں ذکر کیا گیا، حالانکہ پہلے ادنی کو لایا جاتا ہے پھر اعلیٰ کو؟

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ بڑے اور عظمت والے سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سوال نہیں کیا جاتا، جیسے یہ بات منقول ہے کہ ایک شخص بڑوں میں سے کسی ایک شخص کے پاس گیا تو اسے جا کر کہنے لگا کہ میں آپ سے ایک معمولی کام کی غرض سے آیا ہوں، اس نے کہا کہ معمولی کام کسی معمولی آدمی سے کرواؤ، گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں صرف الرحمن ہی ذکر کرتا تو پھر تو مجھ سے سوال کرنے میں شرماتا، تیرے لیے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سوال کرنا مشکل ہو جاتا، لیکن جیسے تو مجھے الرحمن سمجھ کر بڑے بڑے امور مجھ سے طلب کرتا ہے، میں اسی طرح رحیم بھی ہوں پس تو مجھ سے اپنی جوتی کا تسمہ اور اپنی ہانڈی کا نمک بھی مانگ، جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرمایا تھا يَا مُوسىٰ سَلْنِي عَنْ مِلْحِ قِدْرِكَ وَعَلَفِ شَاتِكَ، اے موسیٰ! مجھ سے اپنی ہانڈی کا نمک اور اپنی بکری کا چارہ مانگ۔

دوسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے کو رحمن اور رحیم کے ساتھ موصوف کیا ہے، پھر حضرت مریم کو ایک رحمت عطاء کی، جیسے ارشاد فرمایا: وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا (مَرْيَمَ: ۲۱) ہم تو اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنادیں گے اور اپنی خاص رحمت، یہ تو طے شدہ بات ہے۔ یہی رحمت ان کے لیے کفار اور فجار کی ڈانٹ ڈپٹ سے رحمت کا سبب بن گئی تھی، پھر ہم

لوگ روزانہ چونیتس بار کہتے ہیں کہ وہ رحمن ہے، وہ رحیم ہے، کیونکہ پانچ وقت کی فرض نمازوں کی سترہ رکعتیں ہوتی ہیں اور لفظ رحمن اور رحیم ہر رکعت میں دوبار پڑھا جاتا ہے، ایک بار بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اور ایک بار الحمد للہ رب العالمین میں (تفسیر کبیر)

جب ایک بار رحمت کا ذکر حضرت مریم کے لیے ناپسندیدہ باتوں سے خلاصی کا سبب بن گیا تو ساری عمر میں آدمی اتنی بار اور اس قدر کثرت سے رحمت کا ذکر کرے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ، عار (شرم) اور دِمار (ہلاکت) سے نجات کا سبب کیوں نہیں ہو سکتا؟ (تفسیر کبیر ج ۲۰۳،۱)

تیسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ کی ذات رحمن ہے۔ کیونکہ وہ ذات ایسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر ہے، جس پر بندہ قدرت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ رحیم ہے کیونکہ وہ وہ کام کرتا ہے کہ بندہ اس کی جنس کے مطابق کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں أَنَا رَحْمٰنٌ لِأَنَّكَ تُسَلِّمُ إِلَيَّ نُطْفَةً مَّذِرَةً فَأُسَلِّمُهَا إِلَيْكَ صُورَةً حَسَنَةً. میں رحمن ہوں کیونکہ تو ایک گندہ نطفہ میرے حوالے کرتا ہے، میں اس گندے نطفے کو ایک خوبصورت شکل میں تیرے حوالے کرتا ہوں، ارشاد ربانی ہے، وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (غَافِرٍ: ٦٤) اور اس نے تیری صورت بنائی، پس بہت ہی اچھی تمہاری صورت بنائی۔ اور گویا اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں وَأَنَا رَحِيمٌ لِأَنَّكَ تُسَلِّمُ إِلَيَّ طَاعَةً نَاقِصَةً فَأُسَلِّمُ إِلَيْكَ جَنَّةً خَالِصَةً. (تفسیر کبیر ج ا ص ۲۰۳) میں رحیم ہوں، کیونکہ تو ایک ناقص اطاعت میرے سپرد کرتا ہے اور میں خالص جنت تیرے سپرد کرتا ہوں۔

چوتھا نکتہ: رحمت دوعالم ﷺ کے زمانے میں ایک نوجوان کی موت کا وقت قریب آگیا، اس کی زبان سے کلمہ شہادت ادا نہیں ہو رہا تھا، لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بات کی آپ ﷺ کو اطلاع دی، نبی کریم ﷺ ان لوگوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے، آپ ﷺ نے اس پر کلمہ شہادت پیش کرنا شروع کر دیا، مگر وہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں حرکت کر رہا تھا، اس کی زبان کام نہیں کر رہی تھی، آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا: أَمَا كَانَ يُصَلِّي؟ أَمَا كَانَ يَصُومُ؟

أَمَا كَانَ يُزَكِّي؟ فَقَالُوْا: بَلٰى، کیاوہ نماز نہیں پڑھتا تھا؟ کیاوہ روزے نہیں رکھتا تھا؟ کیاوہ زکوٰۃ نہیں دیتا تھا؟ لوگوں نے کہا کہ جی یہ سارے کام کرتا تھا، پھر آپ ﷺ نے پوچھا: هَلْ عَقَّ وَالِدَيْهِ؟ کیاوہ اپنے والدین کا نافرمان تھا؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی ماں کو بلا لاؤ، آپ ﷺ کے اس حکم پر اس کی بوڑھی ماں آگئی، جو کہ ایک آنکھ سے کانی تھی، آپ ﷺ نے اس بوڑھی کانی عورت سے فرمایا: هَلَّا عَفَوْتِ عَنْهُ؟ کیا تو اسے معاف کرتی ہے؟

اس عورت نے کہا: لَا أَعْفُو لِأَنَّهُ لَطَمَنِي فَفَقَأَ عَيْنِيَ میں اسے معاف نہیں کروں گی کیونکہ اس نے مجھے طمانچہ مارا جس سے میری آنکھ ضائع ہوئی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: هَاتُوا بِالْحَطَبِ وَالنَّارِ لکڑیاں اور آگ لاؤ۔

اس عورت نے پوچھا: وَمَا تَصْنَعُ بِالنَّارِ؟ آگ کو آپ ﷺ کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: أُحْرِقُهُ بِالنَّارِ بَيْنَ يَدَيْكِ جَزَاءً لِّمَا عَمِلَ بِكِ میں اسے تیرے سامنے جلاؤں گا، یہ اس عمل کی سزا ہوگی جو اس نے تیرے ساتھ کیا۔

بڑھیا نے کہا: عَفَوْتُ عَفَوْتُ، أَلِلنَّارِ حَمَلْتُهُ تِسْعَةَ أَشْهُرٍ؟ أَلِلنَّارِ أَرْضَعْتُهُ سَنَتَيْنِ؟ میں نے معاف کر دیا، میں نے معاف کر دیا، کیا میں نے اسے آگ میں جلانے کے لیے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا تھا؟ کیا میں نے اسے آگ میں جلانے کے لیے دو سال دودھ پلایا تھا؟ مقام غور ہے کہ ماں کی رحمت، مہربانی اور شفقت کس قدر ہے؟ اسی وقت اس شخص کی زبان رواں ہوگئی اور اس نے کلمہ شہادت ادا کیا، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ

یہاں ایک باریک بات یہ ہے کہ یہ ماں رحیمہ تھی، رحمانہ نہیں تھی، اسی تھوڑی سی مہربانی اور شفقت کے باعث اس نے آگ میں جلانے کی اجازت نہیں دی، پس الرحمن الرحیم ذات اپنے مومن بندے کو کیوں کر دوزخ کی آگ میں ڈالے گی جو ستر سال تک لا الہ الا اللہ کہتا رہا۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۳۰۲)

پانچواں نکتہ: نبی کریم ﷺ کے دندان مبارک میدان احد میں شہید کر دیے گئے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَإِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُونَ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطاء فرما یہ نہیں جانتی۔ پھر آپ ﷺ قیامت کے دن عرض کریں گے، أُمَّتِی، أُمَّتِی اے اللہ! میری امت ، میری امت۔

یہ آپ ﷺ کی طرف سے دنیا اور آخرت میں مہربانی کا اظہار ہے، حالانکہ آپ ﷺ میں اس قدر احسان اور کرم کا ظہور آپ ﷺ کے رحمت ہونے کی وجہ سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ. دیکھنا چاہیے کہ جب ایک رحمت کا اس قدر اثر ہے تو رحمن رحیم کا کرم، احسان اور رحمت کا کیا ہو گا؟ پھر آپ ﷺ کا وہ فرمان بھی کس قدر رحمت کا اظہار ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حِسَابَ أُمَّتِی عَلَی یَدَیَّ، اے میرے اللہ! میری امت کا حساب و کتاب مجھے عطاء فرما۔ پھر آپ ﷺ نے اس میت کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جو صرف دو درھم کی مقروض تھی، پھر حضرت عائشہ صدیقہ کو ایک بہتان کی وجہ سے گھر سے نکال دیا تھا، گویا اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک رحمت کا اثر ہے،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الْأَنْبِيَاءِ: ۱۰۷) ایک رحمت مخلوقات کے حالات کو نہیں درست کر سکتی، اس لیے مجھے اور میرے بندے کو چھوڑ دیجیے، مجھے اور اپنی امت کو چھوڑ دیجیے، میں رحمن اور رحیم ہوں، میری رحمت کی کوئی انتہاء نہیں ہے، جب کہ ان کی نافرمانیاں اور گناہ تو محدود ہیں، تو محدود لا محدود کے پہلو میں ختم ہو جاتا ہے، اس لیے یقیناً تمام مخلوق کے گناہ میری رحمت کے سمندر میں ختم ہو جائیں گے، اس لیے کہ میں رحمن اور رحیم ہوں۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْن

مالک کالفظ ملک سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے کسی چیز پر ایسا قبضہ کرنا اور تسلط جمانا کہ وہ اس میں تصرّف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو۔ مفسرین کرام نے اس مقام پر اس لفظ کی قرأت میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ مَالِك ہے، یعنی لام کے نیچے کسرہ ہے اور اس سے پہلے والا حرف الف ہے، جب کہ بعض یہ کہتے ہیں

کہ یہ لفظ مِلِك ہے، یعنی لام کے نیچے زیر ہے اور اس سے پہلے والا حرف میم ہے۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے ہیں کہ مالک کے لفظ کو ترجیح حاصل ہے یا مِلِك کے لفظ کو ترجیح حاصل ہے۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ قرأت مالِك یوم الدین ہے، وہ یہ دلائل دیتے ہیں کہ اس میں ایک حرف زیادہ ہے، جب اس میں ایک حرف زیادہ ہے تو اسے پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن ملوک بہت زیادہ ہوں گے لیکن روز جزا کا مالک الحق وہ صرف اللہ تعالیٰ ہو گا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ مالک کبھی بادشاہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، جیسے بادشاہ کبھی مالک ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، پس بادشاہت اور مالکیت دونوں میں سے ہر ایک کبھی ختم بھی ہو جاتی ہے مگر مالکیت تصرف کرنے کا سبب رہتی ہے، مگر بادشاہت میں ایسا نہیں ہوتا ہے معلوم ہوا کہ مالک زیادہ بہتر ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ بادشاہ (مِلِك) رعایا کا بادشاہ ہوتا ہے اور مالک غلاموں کا مالک ہوتا ہے، تو غلام رعایا کی بہ نسبت بہت کم تر حالت میں ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بادشاہی کی نسبت مالکیت میں غلبہ زیادہ ہو، تو ضروری ہے کہ مالک بادشاہ سے حالت میں زیادہ بہتر ہو۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ رعایا کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے کو اس بادشاہ کی رعیت سے اپنے اختیار

سے نکال لیں، جب کہ مملوک (غلام) کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیار سے مالک کی ملکیت سے اپنے کو نکال سکے، پس ثابت ہوا کہ مالک ہونے میں غلبہ بادشاہ ہونے سے زیادہ کامل ہے۔

چھٹی دلیل یہ ہے کہ بادشاہ (مِلِك) کے لیے ضروری ہے کہ وہ رعایا کے حالات کی رعایت رکھے، جیسے ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے کہ وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اپنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

جب کہ رعیت کے ذمے بادشاہ کی خدمت نہیں ہے، جب کہ مملوک (غلام) پر مالک کی خدمت لازم ہے، غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر کسی کام کا مجاز نہیں ہے، نہ وہ قضا کا منصب مالک کی اجازت کے بغیر سنبھال سکتا ہے، نہ امامت کرواسکتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے آقا نے سفر کی نیت کرلی تو غلام آقا کی اتباع میں بغیر نیت کے ہی مسافر ہو جاتا ہے، اگر آقا نے اقامت کی نیت کر لی تو غلام آقا کی اتباع میں ہی مقیم بن جائے گا، معلوم ہوا کہ اطاعت، خضوع، مملوکیت (غلامی) رعیت سے زیادہ تام ہے، یہ دلائل اور وجوہات ہیں کہ مالک پڑھنا مِلِك پڑھنے سے زیادہ افضل اور اکمل ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۰۵)

استاذ العلماء، استاذ المحدثین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں دس دلائل پیش کیے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں ملکیت یعنی بادشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے۔ مالک اپنی مملوک کو فروخت کر سکتا ہے، بادشاہ (ملک) رعایا کو فروخت نہیں کر سکتا۔

غلام بغیر آقا کی اجازت اور اذن کے کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور رعیت بغیر بادشاہ کی اجازت کے کام کر سکتی ہے اور مملوک چونکہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کو سوائے مولیٰ کے کسی چیز سے تعلق بھی نہیں ہوتا، غلام کے پیش نظر ہر وقت آقا کی خوشنودی رہتی ہے، رعایا چونکہ اپنی چیزوں کی مالک بھی ہوتی ہے، اس لیے ان کو بادشاہ سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ غلام کو آقا سے توقع

رحم وکرم کی ہوتی ہے اور رعیت کو بادشاہ سے عدل وانصاف کی امید ہوتی ہے اور بندہ رحم وکرم کا زیادہ محتاج ہے۔

بادشاہت میں ہیبت زیادہ ہے اور مالکیت میں شفقت اور عنایت زیادہ ہے۔ بادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش ہوتا ہے تو ضعیفوں اور کمزوروں اور بیماروں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور مالک ضعیف اور کمزور غلاموں پر اور مزید توجہ کرتا ہے اور ان کی اعانت اور خبر گیری میں مشغول ہوتا ہے۔ مالک کو مملوک سے تعلق زیادہ ہوتا ہے بادشاہ کو رعایا سے اتنی محبت اور تعلق نہیں جتنا آقا کو غلام سے ہوتا ہے اور عاشقوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مژدہ جانفزا نہیں کہ محبوب کو ہم سے محبت اور تعلق ہے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۱۴)

جو حضرات مِلِك (بادشاہ) کو مالک سے زیادہ بہتر قرار دیتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں کہ اہل شہر میں سے ہر کوئی مالک ہوتا ہے، مگر ملك (بادشاہ) لوگوں میں سب سے زیادہ عظمت والا اور ان سب سے بلند ہوتا ہے، اس لیے ملک (بادشاہ) مالک سے زیادہ بہتر اور اشرف ہوا۔

دوسرا یہ کہ سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ (النَّاسِ: ۱، ۲) یہاں لفظ ملک (بادشاہ) کو متعین کر دیا، اگر ملک (بادشاہ) مالک سے بہتر اور اعلیٰ نہ ہوتا تو متعین نہ ہوتا۔

تیسرا یہ کہ ملک کا لفظ مختصر ہے اور مالک کا لفظ طویل ہے، ملک کا لفظ تو ایک زمانہ سے اسی طرح مکمل ادا کیا جارہا ہے جب کہ مالک کے لفظ کے بارے میں احتمال ہے کہ کسی زمانے میں اسے مکمل ادا نہ کیا جاسکے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے ملک پڑھنے والوں کے پانچ دلائل ذکر کیے ہیں، ملکیت یعنی بادشاہت میں جو عظمت ہے وہ وصف مالکیت میں نہیں، مالک تو ہر ایک ہوتا ہے مگر بادشاہ ہر ایک نہیں ہوتا۔

مالک کا حکم فقط اپنے مملوک پر چلتا ہے اور بادشاہ کا حکم تمام ملک اور تمام رعایا پر جاری اور نافذ ہوتا ہے، بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے اور مالک کی اطاعت صرف اس کے مملوک پر واجب ہے۔ نیز لفظ رب العالمین بھی مالکیت پر دلالت کرتا ہے، پس اگر ملک کی بجائے مالک پڑھا جائے تو تکرار لازم آتا ہے۔

قرآن کریم کی آخری سورت میں ملک الناس آیا ہے۔ لہٰذا قرآن کی پہلی سورت میں بھی ملک یوم الدین پڑھنا چاہیے تاکہ اوّل قرآن اور آخر قرآن ایک دوسرے کے مناسب اور ہمرنگ ہو جائے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی رحمہ اللہ ج ا ص ۱۴)

تفریعات بر ملک: امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کو اگر مِلِك پڑھیں تو اور نوعیت کے احکامات متفرع ہوتے ہیں اور اگر اسے مالک پڑھیں تو اور طرح کے احکامات نکلتے ہیں، اس پر انہوں نے کئی وجوہ بیان کی ہیں۔

سیاسات چار قسم پر ہیں، ایک سیاست ملاّک، دوسری سیاست ملوک، تیسری سیاست ملائکہ، چوتھی سیاست ملک الملوک۔ ان میں ملوک (بادشاہوں) کی سیاست ملاّک (زمین داروں) کی سیاست سے مضبوط ہوتی ہے، کیونکہ دنیا کے مالک اکٹھے ہو کر ایک بادشاہ کا مقابلہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، جیسے آپ دیکھیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایک سردار اپنے مملوک پر حد قائم نہیں کر سکتا اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بادشاہ لوگوں پر حدود قائم کر سکتا ہے، رہی فرشتوں کی سیاست تو یہ بادشاہوں کی سیاست سے بھی اوپر ہے کیونکہ بڑے بڑے بادشاہوں کا ایک جہان فرشتوں میں ایک فرشتے کی سیاست کو ختم نہیں کر سکتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَآئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النَّبَأ: ۳۸) اس دن روح امین اور فرشتے صفوں میں کھڑے ہوں گے، رحمان کی اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکے گا اور بات بھی درست کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

(الْبَقَرَة: ۲۵۵) اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔

اور فرشتوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الْأَنْبِيَاء: ۲۸) وہ اسی کی سفارش کریں گے جسے وہ پسند کریں گے۔اس لیے اے بادشاہو! تمہارے پاس جو مال اور بادشاہی ہے اس پر اترانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم روز جزا کے مالک اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں قیدی ہو اور اے رعایا! جب تم بادشاہ کی سیاست سے خوف زدہ ہو تو بادشاہوں کے بادشاہ کی سیاست سے تمہیں ڈر کیوں نہیں لگتا جو روز جزا کا مالک ہے؟

اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے مگر اس کی بادشاہت دوسرے بادشاہوں کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ لوگ کسی چیز کا صدقہ کریں تو ان کی بادشاہی میں اس چیز میں کمی آجائے گی ان کے خزانے کم ہو جائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی پاک ذات ایسی ہے کہ عطاء، احسان اور نوازشات کرنے پر اس کی شاہی میں کوئی چیز کم نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ بڑھتی ہی بڑھتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ جب کسی کو ایک بیٹا دے تو اس کا حکم صرف اسی کی طرف متوجہ ہو گا، اسی طرح اگر کسی کو وہ دس بیٹے عطاء کرے تو اس کا حکم ہر ایک کی طرف ہو گا، ثابت ہو گیا کہ وہ ذات عالی جتنا زیادہ عطاء کرتی ہے اسی قدر اس کی شاہی وسیع ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کمال رحمت والا بادشاہ ہے، اس پر آیات دلیل ہیں، ان میں ایک اسی سورت میں ذکر کی گئی ہے کہ وہ ذات رحمن رحیم ہے، دوسرے مقام پر آتا ہے هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ چھپی اور ظاہر کو جاننے والا ہے، وہی رحمن اور وہی رحیم ہے۔اس کے بعد ارشاد ہے

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ (الْحَشْر: ۲۲، ۲۳) اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ بادشاہ ہے۔اس کے بعد ذکر ہے کہ وہ ذات ظلم اور جور سے پاک ہے، پھر اس کے بعد ذکر کیا گیا کہ وہ سلام ہے اپنے بندوں کو ظلم و جور سے محفوظ رکھے گا، پھر اس کے بعد مؤمن کا ذکر ہے کہ وہ اپنے

بندوں کو ظلم وجور سے امن دے گا، ثابت ہو گیا کہ اس کا ملک (بادشاہ) ہونا کمال رحمت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۲۰۶)

پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (الْفُرْقَانِ: ۲۶) اس دن سچی بادشاہی رحمان کی ہو گی۔ جب اس نے اپنی ذات کے لیے بادشاہی ثابت کی تو اس کے ساتھ ہی وہ اپنی ایسی صفت بھی لایا جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رحمان ہے، یعنی اگر اس دن اس کی بادشاہی کا ثبوت اس کے کمال قہر پر دلالت کرتا ہے تو اس کا رحمان ہونا خوف کے ختم ہونے اور رحمت کے حاصل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ (النَّاسِ: ۱، ۲) یہاں پہلے اس نے رباً للناس کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد ملکاً للناس کا ارشاد فرمایا، یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بادشاہی اس وقت تک اچھی نہیں ہو سکتی، کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ احسان اور رحمت اس کے ساتھ نہ ہو۔

اس لیے اے بادشاہو! ان آیات کو سنو! اور ان مسکینوں پر رحم کرو اور اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں مرتبے سے زیادہ تلاش مت کرو۔

رعایا پر بادشاہ کی اطاعت ضروری ہے، اگر وہ اس کی مخالفت کریں گے اور اطاعت نہیں کریں گے تو اس سے قتل وقتال کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، اس سے اضطراب اور تشویش پیدا ہو جائے گی اور یوں دنیا کو خراب کرنے اور مخلوق کو ختم کرنے کی ایک کوشش شروع ہو جائے گی۔ جب آپ نے دیکھا کہ ایک مجازی بادشاہ کی مخالفت دنیا کی تخریب اور مخلوق کے خاتمے کی طرف لے جاتی ہے تو خیال کرنا چاہیے کہ بادشاہوں کے بادشاہ کی مخالفت کیا اثر دکھائے گی؟ پھر مصالح کا زوال اور مفاسد کا حصول ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ کفر دنیا کی تباہی کا سبب ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا، قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں

اورزمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں کہ وہ رحمن کی اولاد ثابت کرنے بیٹھے۔(سورۃ مریم ۹۱،۹۰) اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ اس کی اطاعت مصالح کے حصول کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَى، اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر قائم رہو، ہم آپ سے کسی قسم کا رزق نہیں مانگتے، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور بہتر انجام اہل تقویٰ کا ہے۔(سورۃ طٰہٰ ۱۳۲)

اس لیے اے رعایا! تم اپنے بادشاہوں کی اطاعت کرو اور اے بادشاہو! تم بادشاہوں کے بادشاہ کی اطاعت کرو، تاکہ مصالح جہاں کا نظم درست رہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کی ہے کہ میں روز جزا کا مالک ہوں، تو اس میں اس نے جہان والوں کے لیے اپنے کمال عدل کا اظہار کیا ہے، جیسے ارشاد ہے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (فُصِّلَتْ: ۴۶) تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ پھر اس نے عدل کی صورت بیان کی ہے وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (الْأَنْبِيَاءِ: ۴۷) اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس کا روز جزا کے دن سچا بادشاہ ہونا عدل کے سبب ظاہر ہو گا، اگر مجازی بادشاہ عادل ہو تو وہ سچا بادشاہ ہے ورنہ وہ باطل ہے، پس اگر عادل بادشاہ حق ہے تو اس کے عدل کی برکت سے جہان کو خیر اور آرام پہنچے گا، اگر وہ ظالم ہو گا تو جہان سے خیر اٹھ جائے گی۔

عادل نوشیروان کی توبہ

حضرت امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں عادل بادشاہ نوشیروان کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ نوشیروان ایک دن شکار کے لیے نکلا، وہ آگے نکلتا چلا گیا اور اپنے لشکر سے کٹ گیا، اس کو سخت پیاس نے ستایا تو ایک باغ میں پہنچ گیا، جب باغ میں داخل ہوا تو اس نے انار کے درخت دیکھے، باغ میں ایک بچہ بھی تھا اسے نوشیروان نے کہا: مجھے ایک انار لا دو، اس نے اسے ایک انار توڑ کر لا دیا، اس نے اسے پھاڑ کر اس میں سے دانے نکالے، انہیں نچوڑا تو ان میں سے بہت سا پانی نکلا جسے اس

نے پیا اور اسے یہ انار بہت اچھا لگا، اس نے نیت کرلی کہ میں اس باغ کے مالک سے یہ باغ لے لوں گا۔

نوشیر وان نے بچے کو کہا: کہ وہ ایک اور انار لائے بچے نے اسے ایک اور انار لا کر دیا، اس نے اسے نچوڑا تو اب کی بار اس میں سے تھوڑا سا پانی نکلا، پھر اس نے پیا تو وہ کڑوا اور تکلیف دہ تھا، نوشیر وان نے بچے سے پوچھا: اے بچے یہ انار ایسا کیوں ہو گیا؟ بچے نے کہا: ہو سکتا ہے کہ شہر کے بادشاہ نے ظلم کا ارادہ کر لیا ہو، اس کے اس ظلم کی نحوست کی وجہ سے یہ انار اس طرح ہو گیا ہے۔

اس بات کو نوشیر وان نے سنا تو اس نے اس ظلم سے اپنے دل ہی دل میں توبہ کی اور اس بچے کو اس نے کہا: مجھے ایک اور انار لا دو، بچے نے اسے ایک اور دانا انار کا لا کر دیا، اب کی بار جب اس نے اسے نچوڑا تو پہلے انار سے بہت زیادہ مزیدار پایا، پھر اس نے بچے کو کہا: اس کی یہ حالت کیسے تبدیل ہو گئی؟ اس پر بچے نے کہا: شاید شہر کے بادشاہ نے ظلم سے توبہ کر لی ہے، جب نوشیر وان نے یہ قصہ اس بچے سے سنا جو اس کے دل کے احوال کے مطابق تھا تو ظلم و جور سے مکمل طور پر توبہ کر لی، اس کے بعد نوشیر وان کا عدل مشہور ہوا۔

مالک پر تفریعات: امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کہ اگر اسے مالک پڑھیں تو اس پر چار احکام متفرع ہوتے ہیں، ایک یہ کہ مالک پڑھنا ملک پڑھنے سے زیادہ امید افزا ہے، کیونکہ ملک (بادشاہ) سے عدل و انصاف کی امید کی جاتی ہے اور اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ انسان سر تا سر بچ جائے اور مالک سے بندہ لباس، کھانا، مہربانی اور پرورش کا طلب گار ہوتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ یوں فرمانا چاہتے ہیں أَنَا مَالِكُكُمْ فَعَلَيَّ طَعَامُكُمْ وَثِيَابُكُمْ وَثَوَابُكُمْ وَجَنَّتُكُمْ. میں تمہارا مالک ہوں، میرے ذمہ ہے تمہارا کھانا، تمہارے کپڑے، میرے ذمہ ہے تمہارا ثواب اور تمہاری جنت۔

دوسرا یہ کہ ملک (بادشاہ) اگرچہ مالک سے زیادہ غنی ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود ملک کو آپ سے لالچ ہو گا جب کہ مالک سے آپ کو لالچ ہوتا ہے۔ جب ہمارے پاس طاعات اور بھلائیاں نہیں

ہوں گی تو وہ قیامت کے دن ہم سے انواع واقسام کی نیکیاں طلب نہیں کرے گا بلکہ وہ یہ چاہے گا کہ ہم اس سے قیامت کے دن عفو و درگزر طلب کریں اور اس سے محض اس کے فضل و احسان کے تحت اس کی جنت کا سوال کریں، اسی لیے کسائی نے کہا کہ مالک پڑھیں کیونکہ یہ قرأت بہت زیادہ فضل وکرم اور وسیع رحمت پر دلالت کرتی ہے۔

تیسرا یہ کہ ملک (بادشاہ) کے سامنے جب لشکر پیش کیے جاتے ہیں تو وہ جسمانی لحاظ سے مضبوط اور مزاج کے اعتبار سے تندرست کو ہی قبول کرتا ہے، جو بیمار ہوتا ہے اسے وہ رد کر دیا کرتا ہے، ایسے کو وہ کوئی وظیفہ واجبہ بھی نہیں دیتا۔ جب کہ مالک کا غلام بیمار ہو جائے تو وہ اس کا علاج معالجہ کرواتا ہے، اگر وہ کمزور ہو تو وہ اس کی مدد کرتا ہے، اگر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ اسے چھٹکارہ دلاتا ہے، اس لیے مالک پڑھنا گناہگاروں اور مسکینوں کے لیے زیادہ موافق ہے۔

چوتھا یہ کہ ملک (بادشاہ) کا ایک رعب اور سیاست ہوتی ہے، جب کہ مالک میں نرمی اور مہربانی ہوتی ہے اور ہمیں رعب و دبدبہ اور سیاست سے زیادہ نرمی، مہربانی اور رحمت ہی کی ضرورت ہے۔

نکات

پہلا نکتہ: اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں اپنے پانچ نام ذکر فرمائے ہیں، اللہ، رب، رحمٰن، رحیم اور مالک اس کی وجہ کیا ہے؟ گویا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ خَلَقْتُكَ أَوَّلًا فَأَنَا إِلٰهٌ. ثُمَّ رَبَّيْتُكَ بِوُجُوهِ النِّعَمِ فَأَنَا رَبٌّ. ثُمَّ عَصَيْتَ فَسَتَرْتُ عَلَيْكَ فَأَنَا رَحْمٰنٌ. ثُمَّ تُبْتَ فَغَفَرْتُ لَكَ فَأَنَا رَحِيمٌ. ثُمَّ لَا بُدَّ مِنْ إِيْصَالِ الْجَزَاءِ إِلَيْكَ فَأَنَا مَالِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ میں نے تجھے اوّلاً پیدا کیا ہے اس لیے میں الٰہ ہوں، اللہ ہوں، پھر میں نے تیری بے شمار نعمتوں سے پرورش کی ہے اس لیے میں رب ہوں، پھر تو نے نافرمانی کی تو میں نے تیری کوتاہی پر پردہ ڈال دیا، اس لیے میں رحمن ہوں، پھر تو نے توبہ کی تو میں نے تجھے معاف کر دیا اس لیے میں رحیم ہوں، پھر تیری طرف بدلے کو پہنچانا ضروری تھا اس لیے میں روز جزا کا مالک ہوں۔

دوسرا نکتہ :اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ میں الرحمن اورالرحیم کوجب ایک بارذکر کردیاتو پھر سورت میں دوبارہ ذکر کرنا توتکرارہے، باقی ناموں میں یہ تکرار نہیں ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس تکرار کی وجہ یہ ہے گویا اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں نے الہ اوررب کا ذکر ایک بار کیاہے اوررحمن اور رحیم کادوبار، تاکہ تجھے معلوم ہوجائے کہ رحمت کی عنایات تمام امورمیں بہت زیادہ ہیں پھر جب رحمت کودوبار ذکر کیا توگویا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس پر تم دھوکہ نہ کھاجانا بلکہ میں اگر رحمن اوررحیم ہوں تومیں روز جزا کا مالک بھی تو ہوں، اس کی نظیر یہ فرمان ہے غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (غَافِرٍ: ۳) گناہ کومعاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت عذاب والا۔

الدین: حضرت مولاناابوالکلام آزاد رحمہ اللہ الدین کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ سامی زبانوں کاایک قدیم مادہ "دان"اور"دین" ہے جوبدلے اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا اور پھر آئین وقانون کے معنوں میں بھی بولاجانے لگا، چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں، آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اورپہلوی میں "دینیہ "نے شریعت وقانون کا مفہوم پیداکرلیا، خورد اوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہواہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین وقواعد کو بھی "دین دبیرہ "کے نام سے موسوم کیاہے، علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کانام " دین کارت" ہے جوغالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبدنے مرتب کی تھی۔ بہر حال عربی میں "الدین" کے معنی بدلے اور مکافات کے ہیں خواہ اچھائی کاہویا برائی کا۔پس مالک یوم الدین کے معنی ہوئے وہ جو جزاکے دن کاحکمران ہے یعنی روز قیامت کا۔(ام الکتاب)

مالک یوم الدین سے مراد روز جزا کا مالک، جس دن لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے اس دن کامالک، اس دن کا خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیاکہ نیکوکار اور گناہ گار، اطاعت شعار اورنافرمان، موافق اور مخالف میں فرق ہوناچاہیے، یہ فرق دنیا میں نہیں ہوتا، یہ

فرق تو جزا والے دن ہی واضح ہو گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى (النَّجْمِ: ۳۱) تاکہ وہ ان لوگوں کو ان کے برے عمل کا بدلہ دے اور نیک کام کرنے والوں کو جنت کا بدلہ دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ، کیا ہم اہل ایمان اور نیک کام کرنے والوں کو زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں، کیا ہم متقی لوگوں کو فاجروں کی طرح کر دیں؟ (سورۃ ص ۲۸)

اسی طرح ارشاد ہے إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَى (طه: ۱۵) بے شک قیامت آنے والی ہے، میں اسے پوشیدہ رکھتا ہوں تاکہ ہر نفس کو بدلہ دیا جائے جو کچھ وہ کوشش کرتا ہے۔

جب ایک ظالم کسی مظلوم پر مسلط ہو کر اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ مظلوم اس سے بدلہ نہیں لیتا یا تو اس لیے کہ وہ بدلہ لینے سے عاجز ہوتا ہے، یا بدلہ لینا جانتا ہی نہیں ہے یا پھر وہ اس ظلم پر راضی ہے، یہ تین باتیں اللہ تعالیٰ نہیں کرتا، وہ مظلوموں کو ظالموں سے بدلہ دلوا کر رہے گا، اگر یہ بدلہ دنیا میں نہیں ہو گا تو پھر اس دنیا کے بعد والے جہاں میں ہو گا، اللہ تعالیٰ اس ارشاد میں فرماتے ہیں کہ وہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ [الفاتحة: ۴] روز جزا کا مالک ہے۔

اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (الزَّلْزَلَةِ: ۷) جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔

ایک روایت میں یوں ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا، جب وہ اپنے حالات کو دیکھے گا تو اپنے لیے یقینی طور پر ایک نیکی بھی نہیں پائے گا، پس اسے ایک آواز آئے گی، يَا فُلَانُ ادْخُلِ الْجَنَّةَ بِعَمَلِكَ، فَيَقُولُ: إِلٰهِي، مَاذَا عَمِلْتُ؟ فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: أَلَسْتَ لَمَّا كُنْتَ نَائِمًا تَقَلَّبْتَ مِنْ جَنْبٍ إِلَى جَنْبٍ لَيْلَةَ كَذَا فَقُلْتَ فِي خِلَالِ ذٰلِكَ «اللهُ» ثُمَّ غَلَبَكَ

النَّوْمُ فِي الْحَالِ فَنَسِيتَ ذٰلِكَ أَمَّا أَنَا فَلَا تَأْخُذُنِي سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ فَمَا نَسِيتُ ذٰلِكَ۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۲۰۴) اے فلاں! اپنے عمل کی بدولت جنت میں داخل ہو جا، وہ کہے گا، اے میرے اللہ! میں نے کون سا عمل کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، جب تو سویا ہوا تھا تو رات کو پہلو پہ پہلو بدلتا تھا، اسی دوران تو نے کہا تھا "اللہ" پھر اسی حال میں تجھ پر نیند غالب آگئی تھی، اس لیے تو بھول گیا ہے اور میری ذات وہ ہے جسے اونگھ نہیں آتی، نیند نہیں آتی، میں تیرے اس جملے "اللہ" کو نہیں بھولا ہوں۔

اسی طرح ایک بندے کو لایا جائے گا، اس کی نیکیاں اور برائیاں تولی جائیں گی، اس کی نیکیاں کمزور ہو جائیں گی، پھر اس کے پاس ایک پرچہ لایا جائے گا، جو اس کے میزان کو بھاری کر دے گا، پس اس میں کلمہ شہادت لکھا ہوا ہو گا، لا الہ الا اللہ۔

واجبات کی دو اقسام: واجبات دو قسم پر ہیں، ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد، حقوق اللہ کی بنیاد چشم پوشی اور درگزر پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جہان والوں سے بے نیاز ہے، بہر حال حقوق العباد سے احتراز بہت ہی لازم ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ نے اس موقع پر حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک مجوسی نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا قرض دینا تھا، امام صاحب اپنا قرض مانگنے کے لیے اس مجوسی کے گھر کی طرف گئے، جب آپ رحمۃ اللہ علیہ اس کے دروازے پر پہنچے تو آپ رحمۃ اللہ کی جوتی پر گندگی لگ گئی، جب آپ رحمۃ اللہ نے جوتی جھاڑی تو گندگی اس مجوسی کے مکان کی دیوار پر جا لگی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ پریشان ہو گئے کہ اگر میں اس گندگی کو اس کی دیوار پر یونہی رہنے دیتا ہوں تو اس سے دیوار بدنما لگے گی، اگر میں اس گندگی کو یہاں سے کھرچتا ہوں تو دیوار سے مٹی گر جائے گی چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے ایک بچی باہر نکلی، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کہا: اپنے آقا کو کہو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ دروازے پر آئے ہیں، مجوسی باہر آیا، وہ سمجھا کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ قرض کا مطالبہ کرنے آئے ہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے اس سے معذرت کی اور کہا کہ یہاں

کون سا کام بہتر ہے؟ پھر اسے دیوار کی بات سنائی اوراس سے پوچھا کہ اسے پاک کرنے کا طریقہ کیاہے؟ مجوسی نے کہا: میں پہلے اپنے آپ کو پاک کرنے سے ابتدا کرتا ہوں، چنانچہ وہ اسی حال میں مسلمان ہو گیا۔

یہاں بات سمجھنے کی یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجوسی پر اس قدر تھوڑی سی زیادتی کرنے سے بھی احتراز کیا، اس وجہ سے وہ مجوسی مجوسیت کے کفر کو چھوڑ کر ایمان لے آیا، توجو شخص ظلم کو چھوڑدے گا اس کا حال اللہ کے ہاں کیا ہو گا؟

اِيَّاكَ نَعْبُدُ

اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا معنٰی ہے ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں، عبادت ایسے فعل کو کہاجاتاہے جو کسی کی تعظیم اور بڑائی کے لیے کیاجائے، عبادت کالفظ عربوں کے قول طریق معبّدٌ سے ماخوذ ہے، جو مذلل کے معنی میں ہے، ایاک نعبد کا معنی ہے اے اللہ! میں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا، امام رازی نے اس حصر کی کئی وجوہات بیان کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ عبادت کہتے ہیں انتہائی تعظیم کرنے کو اور یہ اسی ہستی کے لائق ہے جس سے انتہاء درجے کا انعام ملا ہو اور انعام کی بڑی وجوہات میں سے یہ ہے جو نفع اٹھانے کی قوت کا فائدہ دے اور جو نفع بخش چیز کو پیدا کرے، اس میں پہلا مرتبہ وہ زندگی ہے جو نفع اٹھانے کی قوت کا فائدہ دیتی ہے، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایاہے

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (مَرْيَمَ: ۹) میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اورارشادہے كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتاً فَأَحْيَاكُمْ (الْبَقَرَةِ: ۲۸) تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیونکر کرسکتے ہو، حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا۔

اور دوسرا مرتبہ نفع بخش چیز کو پیدا کرنا ہے، اس کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اشارہ ہے، هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین میں

جو کچھ ہے وہ سب پیدا کیا۔ جو کچھ ہمیں دکھائی دے رہا ہے یہ سب اسی رب العالمین کی کاریگری ہے، جس نے اس عالم سفلی کو اپنی قدرت سے وجود دیا اور پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا، زمینوں اور آسمانوں کو وجود دیا اور ان میں اپنی مرضی سے مخلوقات کو بسایا، یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، سورج، ستارے سیارے، دریا اور نہریں جب اسی کی قدرت کا شاہکار ہیں تو پھر یہ بات ضروری ہوگئی کہ مستحق اور لائق عبادت صرف اور صرف وہی ہے، اس کی ان تمام قدرتوں کا تقاضا ہے کہ اس کی عبادت احسن طریقے سے کی جائے، اسی لیے اس نے فرمایا اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں یہ فرمان حصر کا فائدہ دیتا ہے۔

دوسری وجہ اس حصر کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے پانچ ناموں کا ذکر کیا ہے ان میں ایک اللہ دوسرا رب، تیسرا الرحمن، چوتھا الرحیم اور پانچواں مالک، اس لیے کہ انسانی احوال تین قسم پر ہیں، ماضی، حال، مستقبل، انسان ماضی میں کچھ نہ تھا، جیسے ارشاد ربانی ہے وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (مریم: ۹) میں نے تجھے پیدا کیا، تُو تو کچھ بھی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لائے ہیں، ارشاد ہے كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ (الْبَقَرَة: ۲۸) تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کرسکتے ہو؟ تم تو مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا۔ اور ماضی میں انسان لاعلم اور جاہل تھا جیسے ارشاد ہے وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ اللہ ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ نہیں جانتے تھے، اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ (سورۃ النحل آیت ۷۸)

انسان عدم سے وجود کی طرف منتقل ہوا، موت سے زندگی کی طرف منتقل ہوا، عجز اور کمزوری سے قوت اور طاقت کی طرف منتقل ہوا، جہالت سے علم کی طرف منتقل ہوا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور ازلی ہے، اس نے اپنی قدرت ازلیہ اور علم ازلی سے اسے پیدا کیا اور عدم سے وجود کی طرف اسے منتقل کیا، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ الٰہ ہے، معبود ہے، یہ بات تو ہوئی ماضی سے متعلق۔

اب رہا اس کا حال سو اب اس کی حاجت بہت زیادہ ہے، کیونکہ وہ جب معدوم تھا تو رب

رحمن اور رحیم کا محتاج تھا، اب جب وہ وجود میں آگیا ہے تو اس پر اس کی ضروریات اور حاجات کے دروازے کھل گئے، پھر اسے حاجات کو پورا کرنے کے اسباب میسر آگئے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ میں تجھے عدم سے وجود میں لایا ہوں، جب تو وجود میں آگیا تو تیری حاجات اور ضروریات میری طرف بڑھ گئیں، تو پرواہ کی ضرورت نہیں میں رب رحمن اور رحیم ہوں۔

اور انسان کا مستقبل اس کے مرنے کے بعد ہے، اس سے متعلقہ چیز مالک یوم الدین ہے، تو یہ پانچ صفات ان تین احوال کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، معلوم ہوا کہ انسان کے تمام مصالح خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو، حال سے ہو یا مستقبل سے ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے فضل، اس کے احسان کے بغیر مکمل اور تام ہو ہی نہیں سکتا، جب معاملہ یہ ہے تو ضروری ہے کہ بندہ اللہ ہی کی عبادت کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کہے کہ میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد کا طلب گار ہوں۔

تیسری وجہ حصر کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قادر، عالم، محسن جواد، کریم اور حلیم ہونے پر قطعی دلائل موجود ہیں، کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ان صفات سے موصوف ہو سکتا ہے، اس میں شک ہے، کیونکہ کوئی ایسی نشانی نہیں ہے جو طبیعت، فلک، کواکب، عقل اور نفس کی طرف منسوب کی جاسکے، ان میں بھی تاثیر کی نسبت اللہ ہی کی طرف کی جاتی ہے اس احتمال کے باوجود یہ نسبت ان چیزوں کی طرف کرنا مشکوک ہے، تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ یقینی طور پر مخلوق کا معبود اور الہ ہے، اس کے کسی غیر کا مخلوق کے لیے معبود ہونا مشکوک ہے، اب یہاں جب اللہ تعالیٰ کا معبود ہونا یقینی ہے اور اس کے غیر کا معبود ہونا مشکوک ہے تو یقین کو لینا شک کو لینے سے زیادہ بہتر ہے، مشکوک کو چھوڑنا ضروری ہے اور معلوم کو لینا ضروری ہے، اس بناء پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، اسی لیے یہاں ایّاک نعبد کہا گیا ہے۔ کہ اس کے علاوہ لائق عبادت ہے ہی کوئی نہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ عبودیت ذلت اور مہانت کا نام ہے، کیونکہ جب بھی آقا اعلیٰ اور اشرف ہو

گا تو اس کی غلامی میں لذت اور فرحت ہو گی، جب اللہ تعالیٰ تمام موجودات میں اعلیٰ اوراشرف ہیں تو پھر ان کی بندگی کرنا ان کے غیر کی بندگی کرنے سے زیادہ بہتر اور افضل ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے غیر کی قدرت

سے اعلیٰ ہے، اس کا علم اس کے غیر کے علم سے اکمل ہے، اس کا جود و کرم اس کے غیر کے جود و کرم سے افضل ہے، تو قطعی طور پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس کی بندگی اس کے غیر کی بندگی سے اولیٰ اور بہتر ہے، اسی وجہ سے فرمایا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

حصر کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب لذاتہ ہے اس کے علاوہ ممکن لذاتہ ہیں، تو جو چیز ممکن لذاتہ ہو وہ فقیر، محتاج اور اپنی ضروریات میں مشغول ہوتی ہے، اس کے لیے دوسروں کی حاجات کو پورا کرنا ناممکن ہے، جو چیز اپنی ذات میں غنی اور مالدار نہ ہو وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہیں ہوتی، تو غنی لذاتہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تو دافع الحاجات بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے لائق اور مستحق عبادات بھی اللہ ہی ہے، اس وجہ سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فرمایا۔

حصر کی چھٹی وجہ یہ ہے کہ مستحق عبادت ہونے کا تقاضا ہے کہ معبود وہ ہو جو آسمانوں کو بلا علاقہ و تعلق تھام لے، زمین کو بلا کسی سہارے کے تھام لے، سورج اور چاند کو چلائے، قطب شمالی اور قطب جنوبی کو ٹھہرائے، بادلوں سے کبھی بجلی چمکائے، کبھی بادلوں سے ہوا کے جھونکے چلائے اور کبھی ان بادلوں سے بارش برسائے اور کبھی زمین میں یہ منظر دکھائے کہ پتھر سے پانی نکالے اور کبھی پتھر کو پانی سے نکالے، پھر زمین میں پہاڑوں جیسی ٹھوس چیزوں کو کھڑا کر دے جو حرکت نہ کریں اور کبھی زمین میں نہروں کی طرح حرکت کرتی چیزوں کو رواں کر دے، قارون جیسوں کو زمین میں دھنسائے اور اسے نیچے اور زمین کو اس کے اوپر کر دے، پھر اس کی قدرت کہ محمد عربی ﷺ کو اتنا بلند کر دے کہ قاب قوسین کو ان کے نیچے کر دے، فرعونیوں پر پانی کو آگ بنا دے، جیسے قرآن کہتا ہے کہ وہ

غرقاب ہوئے اورآگ میں داخل کردیے گئے، حضرت ابراہیم پر آگ کو سلامتی اور ٹھنڈک والی بنادے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلند کردے، وادی مقدس میں جوتے اتارنے کا حکم صادر کردے، کبھی طور کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر کھڑا کردے، کبھی وہ خشک تنور سے دنیا کو غرق کرڈالے اور کبھی موسیٰ علیہ السلام اوراصحاب موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کو خشک کردے تو ان چیزوں پر کس کی قدرت ہے؟ اس ذات ہی کا استحقاق ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے، اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے، جمادات میں، نباتات میں، حیوانات میں، انسانوں میں، فلک اور ملک میں، ان مخلوقات میں اس کی برابری کوئی نہیں کرسکتا ہے، ناقص اور کامل میں، خسیس اور نفیس میں برابری جہالت اور بے وقوفی پر دلالت کرتی ہے۔

توحید اور بت پرستی

ایاک نعبد کا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جب بات یہ ہے تو پھر ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی الہ نہیں ہے، ایاک نعبد وایاک نستعین توحید خالص پر دلالت کرتا ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مشرکین کے کئی گروہ تھے، یہ اس طرح کہ جس نے بھی اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک ٹھہرایا یا تو وہ جسمانی لحاظ سے تھا یا نہیں۔

پھر جن لوگوں نے جسمانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا یا تو اجسام سفلیہ کو ٹھہرایا یا اجسام علویہ کو ٹھہرایا، پھر جن لوگوں نے اجسام کو شریک ٹھہرایا یا تو وہ جسم مرکب ہے یا مفرد، اگر جسم مرکب ہے تو پھر یا تو وہ معادن، نباتات، حیوان یا انسان میں سے ہے۔

جنہوں نے معدنی اشیاء کو شریک بنایا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پتھر، سونے اور چاندی کے بت بنائے اور ان کی پوجاپاٹ شروع کردی اور جنہوں نے نباتات کو شریک بنایا تو انہوں نے کسی خاص درخت کو خاص اپنے لیے معبود بنالیا، جنہوں نے حیوانوں کو شریک بنایا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنایا۔

جنہوں نے انسانوں کو شریک بنایا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ حضرت عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، حضرت عیسیٰ بن مریم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور جنہوں نے مفرد اجسام کو شریک ٹھہرایا، انہوں نے آگ کی پوجا کی، یہ مجوسی تھے اور جنہوں نے اجسام علویہ کو شریک ٹھہرایا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سورج، چاند اور تمام ستاروں کی پوجا کی اور نیک بختی اور نحوست کی نسبت ان چیزوں کی طرف کی یہ صابی لوگ تھے اور اکثر نجومی لوگ تھے۔

اور جنہوں نے اجسام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ان کے بھی کئی گروہ ہیں، ان میں ایک گروہ وہ ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کی تدبیر نور اور ظلمت کرتے ہیں، یہ مانوی اور ثنوی گروہ ہے، ایک وہ گروہ ہے جن کا کہنا ہے کہ ملائکہ فلکی روحیں ہیں اور ہر اقلیم کے لیے فلکی روحوں میں سے ایک معین روح ہے، جو اس کی تدبیر کرتی ہے اور اس عالم کی ہر نوع کے لیے فلکی روح ہے جو اس کی تدبیر کرتی ہے اور ان روحوں کو صورت اور تمثیل کی شکل دیتی ہے اور یہ لوگ اس کی عبادت کرتے ہیں، یہ لوگ ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ اس جہان کے دو معبود ہیں، ان میں ایک خیر ہے اور دوسرا شریر، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جہان کا مدبر اللہ تعالیٰ اور ابلیس ہیں اور یہ دونوں بھائی ہیں، جہان میں جو کچھ بھلائی اور خیرات ہے یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس میں جو کچھ شر میں سے ہے وہ شیطان کی طرف سے ہے۔

مخلوق میں سے جس کسی کو معبود بنایا گیا اور اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا گیا اور اس کی پوجا کی گئی تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ جواز تلاش کی گئی، یا تو اس سے نفع کی امید رکھی گئی یا اس کے نقصان سے بھاگنے کی نوبت آگئی، مگر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ڈٹے رہے، جنہوں نے شریکوں کی باتوں کو ٹھکرایا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کی، یہ لوگ اللہ ہی سے امیدیں وابستہ کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے، انہوں نے اللہ کی عبادت کی

اوراللہ ہی سے مدد مانگی ، اسی لیے انہوں نے کہا کہ ایاک نعبد وایاک نستعین گویا یہ جملے لا الہ الا اللہ کے قائم مقام بن گئے۔

عبادت کے درجات: علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق کے مطابق عبادت کے تین درجات ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان ثواب کے لالچ یا عذاب کے ڈر سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، یہ درجہ بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، اس لیے کہ در حقیقت اس کا معبود تو ثواب ہی ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کو اس مطلوب تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہے اور جس شخص نے مخلوق کے احوال میں سے کسی چیز کو مطلوب بالذات بنا کر حق تعالیٰ کو اس تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا تو یہ بہت ہی خسیس ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لیے کرے کہ اس نے اسے عبادت کا شرف بخشا ہے، یا اس نے اس کی تکالیف کو قبول کرنے کا شرف بخشا ہے، یا اس کی نسبت اپنی طرف کرنے کا اسے شرف بخشا ہے، تو یہ درجہ پہلے والے درجے سے بہتر ہے، ورنہ کامل درجہ تو یہ بھی نہیں ہے، کیونکہ مقصود بالذات غیر اللہ ہے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی اس لیے عبادت کرے کہ وہ اس کا معبود ہے، اس کا پیدا کرنے والا ہے، یہ اس کا بندہ ہے، الوہیت ھیبت اور عزت کو واجب کرتی ہے، جب کہ عبودیت خضوع، عاجزی اور ذلت کو واجب کرتی ہے، اس لیے یہ اعلیٰ مقامات ہیں اور افضل درجات ہیں، اس کا نام عبودیت اور بندگی ہے، اسی کی طرف نماز کے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ ہے، جن میں وہ نماز کے شروع میں ذکر کرتے ہوئے

کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھتا ہوں، اگر اس کی جگہ وہ یوں کہے کہ میں ثواب کے لیے یا اس کے عذاب کے ڈر سے نماز پڑھتا ہوں تو اس کی نماز خراب ہو جاتی، فاسد ہو جاتی۔

عبادت کی اہمیت

قرآنی آیات اور نبوی ارشادات میں عبادت کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے، عبادت اور عبودیت کو بلند مقام دیا گیا ہے، اس سلسلے میں قرآن کی بہت سی آیات ہیں، جیسے ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِينَ، وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ (الحجر: ۹۷- ۹۹) اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کی باتوں سے دل تنگ ہوتے ہیں، پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیں، سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں اور تادم واپسیں اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں۔

اس میں آپ ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ آخری لمحے تک عبادت کرتے رہیں، عبادت پر ہمیشگی فرمائیں، عبادت کو مقررہ اوقات میں بجالائیں، اس سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ عبادت کی کس قدر اہمیت ہے۔ ایک بات اس آیت میں یہ بتلائی گئی ہے کہ لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں سے آپ ﷺ خفا اور تنگ ہوتے ہیں اس لیے اس کا علاج بھی ساتھ بتلا دیا کہ آپ ﷺ ان کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی بجائے یہ کام کریں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید کریں، دوسرا آپ ﷺ سجدہ ریز ہو جایا کریں، یعنی عبادت میں مشغول ہو جایا کریں اور عبادت آخری دم تک کرتے رہیں۔

معلوم ہوا کہ ان باتوں سے دل کی خفگی اور تنگی ختم ہو جاتی ہے، شرح صدر ہو جاتا ہے، کیونکہ عبادت نام ہے مخلوق سے خالق کی طرف رخ کرنے کا، مخلوق سے خالق کی طرف پلٹنے کا۔ معراج کی رات میں عبادت کا تذکرہ موجود ہے، اگر عبادت کا اس قدر بلند مقام نہ ہوتا تو اتنے عظیم سفر میں اس کا ذکر کیوں کر ہوتا؟

عبودیت کے شرف کا اس سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے آخری تاجدار رسالت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کی برأت بیان کرنے کے لیے سب سے پہلا جملہ جو بولا وہ عبودیت کے

کمال کو ظاہر کر رہا تھا، آپ نے فرمایا تھا، انی عبد اللہ (سورۃ مریم) ادھر آغاز میں عبودیت کا یوں کھل کر اظہار کیا گیا، جب کہ اس کا صلہ کیسے ملا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم آپ کو اپنے پاس اٹھالیں گے، معلوم ہوا کہ عبودیت ہر خیر کی چابی ہے، ہر سعادت کی کنجی ہے، ہر بلا اور مصیبت کو دور کرنے والی ہے۔

اس سے ایک باریک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ جس نے عبودیت کا اقرار کیا اسے جنت کی طرف اٹھایا گیا تو جس نے ستر سال تک اس عبودیت کا اقرار کیا، اظہار کیا وہ جنت سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟ عبادت کی اہمیت کا اس آیت سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی عبادت کا حکم دیا۔ إِنَّنِي أَنَا اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي (طٰهٰ: ۱۴) بے شک میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس میری عبادت کرو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے بعد عبودیت کا ذکر کیا ہے، کیونکہ توحید اصل اور جڑ ہے ،عبودیت اور بندگی اس کی شاخ ہے، توحید ایک درخت ہے عبودیت اس کا پھل ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کی مضبوطی دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے، ان آیات سے عبودیت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

انسان کو جس قدر کمال، شرف، فضیلت، مسرت، منقبت ملتی ہے وہ عبودیت ہی کی وجہ سے ملتی ہے، تو پتہ چل گیا کہ عبودیت خیرات اور بھلائیوں کی چابی ہے، سعادت کا عنوان ہے، مطلع درجات ہے، کرامات کا سرچشمہ ہے، اسی لیے بندہ کہتا ہے کہ میں خاص تیری ہی عبادت کرتا ہوں

حضرت علی المرتضی شیر خدا رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے

كَفٰى بِي فَخْرًا أَنْ أَكُونَ لَكَ عَبْدًا، وَ كَفٰى بِي شَرَفًا أَنْ تَكُونَ لِي رَبًّا، اَللّٰهُمَّ إِنِّي وَجَدْتُكَ إِلٰهًا كَمَا أَرَدْتَ فَاجْعَلْنِي عَبْدًا كَمَا أَرَدْتَ (تفسیر کبیر ۱:۲۱۵)

مجھے اس قدر فخر ہی کافی ہے کہ میں بندہ ہوں اور میرے لیے یہی شرف کافی ہے کہ تو میرا رب ہے، اے میرے اللہ! میں نے تجھے ایسا الہ اور معبود مانا جیسے تو نے چاہا، پس تو مجھے ایسا بندہ بنادے جیسے تو چاہتا ہے۔

نکات

پہلا نکتہ: یہاں ایاک کو نعبد سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، نعبدک نہیں کہا گیا، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر مقدم کیا تا کہ عبادت کرنے والا خبر دار ہو جائے کہ معبود برحق اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کی تعظیم اور تکریم میں کاہلی اور سستی کا شکار نہیں ہونا اور دائیں بائیں توجہ نہیں کرنی۔

دوسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اے بندے! اگر تجھ پر اطاعت مشکل ہو جائے اور عبادات میں سے قیام، رکوع اور سجود مشکل دکھائی دے رہے ہوں تو سب سے پہلے تو ایاک نعبد کے فرمان کو ذکر کر، تا کہ تو مجھے یاد کرے اور تیرے دل میں میری معرفت کا استحضار ہو، جب تو میرے جلال، میری عظمت اور میری عزت کو یاد کرے گا اور تجھے علم ہو گا کہ میں تیرا آقا ہوں اور تو میرا بندہ ہے تو پھر تجھ پر یہ عبادات آسان ہو جائیں گی، اس کی مثال یوں سمجھ لیں جیسے ایک شخص کوئی بھاری چیز اٹھانے کا ارادہ کرے تو پہلے وہ ایسا کرے گا جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہو، اسی طرح بندہ جب سخت مشقت اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے پہل وہ ربوبیت کو پہچاننے کا معجون اس کے فرمان ایاک سے حاصل کرتا ہے تا کہ بندگی کا بوجھ اٹھانے کے لیے مضبوط ہو جائے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے ایک مثال یہ دی ہے کہ جیسے ایک عاشق کو معشوق کی وجہ سے مار پڑتی ہے، معشوق بھی سامنے حاضر ہوتا ہے، تو اس کی موجودگی میں عاشق کو مار کھانا آسان لگتا ہے۔ اسی طرح یہاں ہے کہ جب بندہ ایاک کے جمال کا مشاہدہ کرتا ہے تو بندگی کا بوجھ اٹھانا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

تیسرا نکتہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (الاعراف ۲۰۱) یقیناً جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خطرہ آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں، پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

توکسل، غفلت اور بے کاری کے باعث جب شیطان نفس انسانی کو کچوکہ لگاتا ہے تو پھر وہ یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتا ہے، اسے ایاک نعبد کی روشنی میں اس کا جلال مستحضر ہو جاتا ہے، وہ دیکھنے لگ جاتا ہے، اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، وہ عبادت کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

چوتھا نکتہ: جب تو نعبد سے آغاز کرتا تو اس میں پہلے اپنی عبادت کا ذکر کیا جاتا، اس میں اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ عبادت کس کی؟ اس میں پھر ایک احتمال تھا کہ شیطان یوں کہتا کہ یہ عبادت بتوں کی ہے، اجسام کی ہے، سورج کی ہے یا چاند کی ہے، مگر جب تو نے ترتیب کو تبدیل کر دیا اور تو نے پہلے ایاک کہا پھر اس کے بعد تو نے نعبد کہا، تو تیرے پہلے قول ایاک میں اس بات کی صراحت ہے کہ معبود اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو یہ بلیغ توحید ہے، شرک کے احتمال سے بہت زیادہ بعید ہے۔

پانچواں نکتہ: بعض اہل تحقیق کا کہنا ہے کہ جو شخص نعمت کے وقت نعمت دینے والے پر نظر رکھتا ہے وہ مصیبت اور تکلیف کے وقت مصیبت کی بجائے مصیبت میں مبتلا کرنے والے کی طرف نگاہ رکھتا ہے، اس وقت وہ تمام حالات میں اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مستغرق ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جو ایسے ہو وہ تو سعادت اور نیک بختی کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتا ہے اور جس شخص کی نگاہ بوقت نعمت نعمت کی طرف ہو نعمت دینے والے کی طرف نہ ہو، تو ایسے شخص کی نگاہ بوقت مصیبت مصیبت کی طرف ہوتی ہے، مصیبت میں مبتلا کرنے والے کی طرف نہیں ہوتی، تو یوں وہ تمام اوقات غیر اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے، یوں وہ ہمیشہ بد بختی میں ہی رہتا ہے، کیونکہ حصول نعمت کے وقت وہ اس کے ختم ہو جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، یوں وہ ایک عذاب میں گرفتار رہتا ہے اور نعمت چھن جانے کے وقت وہ رسوائی میں مبتلا ہو جاتا ہے، گویا زنجیریں اس کے پاؤں میں اور پھندہ اس کے گلے میں رہتا ہے، اسی باعث اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو فرمایا: اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ (البقرۃ: ۴۰) میری نعمت کو یاد کرو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ: ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

تو یہاں ایاک کو نعبد سے پہلے اس لیے ذکر کیا گیا تاکہ بندہ ایاک کے نور جلال کے مشاہدے میں مستغرق رہے، جب معاملہ اسی نوعیت کا ہے تو پھر عبادت کی ادائیگی کے وقت اس کا مستقر عین فردوس میں ہو گا۔ جیسے ایک حدیث قدسی میں ارشاد ہے، اللہ فرماتے ہیں

وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، (بخاری، مسند البزار، صحیح ابن حبان)

بندہ برابر نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنالیتا ہوں، جب میں اسے محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دوں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔

معجم الاوسط میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں الفاظ قدرے بدل کر آئے ہیں، فرمایا

فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ عَيْنَيْهِ الَّتِي يُبْصِرُ بِهِمَا، وَأُذُنَيْهِ الَّتِي يَسْمَعُ بِهِمَا، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطُشُ بِهَا، وَرِجْلَيْهِ الَّتِي يَمْشِي بِهِمَا، إِنْ دَعَانِي أَجَبْتُهُ، وَإِنْ سَأَلَنِي أَعْطَيْتُهُ،

پس جب میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی دو آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے دو کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کی دو ٹانگیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے دعا کرے تو میں اسے قبول کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے دیتا ہوں۔ (معجم الاوسط للطبرانی)

چھٹا نکتہ: جب نعبد کو ایاک سے پہلے ذکر کرتے تو یہ جملہ غیر اللہ کی عبادت کی نفی کا فائدہ نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے علاوہ غیر اللہ کی عبادت سے رکاوٹ نہیں پیدا کی

جا سکتی، جیسے مشرکین کا طریقہ کار ہے۔ لیکن جب ایاک نعبد فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اس کے غیر کی عبادت نہ کریں

ساتواں نکتہ: نعبد میں نون عظمت کے لیے ہے، گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ جب تو نماز سے باہر ہو تو پھر جمع متکلم کا صیغہ استعمال مت کر، اگرچہ تو ہزاروں بندوں میں کھڑا ہو، لیکن جب تو نماز میں مشغول ہو جائے تو پھر تو وہاں نحن (جمع متکلم) کا صیغہ استعمال کر، نعبد کہہ، تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ جو ہمارا بندہ ہے وہ دنیا اور آخرت کا بادشاہ ہے۔

آٹھواں نکتہ: اگر یہاں بندہ **ایاک اعبد** (واحد متکلم کا صیغہ) کہے تو یہ تکبر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں عبادت گزار ہوں۔ لیکن جب ایاک نعبد کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں عبادت گزار بندوں میں سے ایک ہوں، اَعبُدُ (واحد متکلم) یہ تکبر ہے اور نَعبُدُ (جمع متکلم) یہ عاجزی اور انکساری ہے، اس کا معنی ہے کہ میں تیرے عبادت گزار بندوں میں سے ایک ہوں، واحد متکلم استعمال کرنے میں تکبر ہے اور جمع متکلم استعمال کرنے میں عاجزی اور تواضع ہے اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ فَمَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ، (المعجم الاوسط ج ا، شعب الایمان) جو اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی اور انکساری کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بلند کرے گا اور جو تکبر کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے گا۔

نواں نکتہ: نعبد (جمع متکلم) میں نون کو ذکر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ آدمی کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنی چاہیے، اس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز اکیلے آدمی کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ اجر والی ہوتی ہے، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلتَّكْبِيْرَةُ الْأُوْلٰى فِي صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا جماعت کی نماز میں تکبیر اُولیٰ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بہتر ہے۔

دسواں نکتہ: جب انسان جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو نعبد (جمع متکلم) کہتا ہے، اس سے مراد

تمام لوگ ہوتے ہیں اور اگر وہ اکیلے میں نماز پڑھ رہا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میں تیری عبادت کر رہا ہوں اور میرے ساتھ فرشتے بھی ہیں، تو نعبد کی ادائیگی میں وہ اور تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہوتے ہیں۔

گیارہواں نکتہ: اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر بندہ یوں کہے کہ اعبد (واحد متکلم) تو اس میں پھر اس نے اپنی ذات ہی کا ذکر کیا ہے، دوسروں کا ذکر نہیں کیا اور جب اس نے نَعبُدُ (جمع متکلم کا ذکر کیا تو اس میں اس نے اپنی عبادت کا ذکر بھی کیا اور شرقاً غرباً دوسرے تمام ایمان والوں کا بھی ذکر کیا، گویا کہ اس نے تمام ایمان والوں کے اہم امور کی اصلاح کی کوشش کی اور جب اس نے دوسروں کا کام کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو کر دیں گے، جیسے حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ قَضَى لِمُسْلِمٍ حَاجَةً قَضَى اللّٰهُ لَهُ جَمِيعَ حَاجَاتِهُ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۱۲)

جس شخص نے کسی مسلمان کی حاجت پوری کی اللہ تعالیٰ اس کی تمام حاجات کو پورا کر دیں گے۔

بارہواں نکتہ: گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو یوں فرما رہے ہیں کہ اے میرے بندے! تو نے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر میری تعریف کی ہے اور دنیا و آخرت کی تمام حمدیں اور تعریفیں ہمارے سپرد کی ہیں اس لیے ہمارے ہاں تیری بڑی قدر و منزلت ہے اور ہمارے ہاں تیرا ایک مقام ہے، اس لیے تو اپنی مہمات کی اصلاح کے لیے اکیلے اپنی ذات ہی پر اکتفانہ کر، بلکہ تمام مسلمانوں کی حاجات کی اصلاح کر، اس لیے تو یوں کہہ ایاک نعبد وایاک نستعین۔

تیرہواں نکتہ: گویا بندہ اللہ کی بارگاہ میں یوں عرض کرتا ہے کہ میرے مولیٰ! میں اکیلے کی عبادت وہاں تک نہیں پہنچ سکتی جہاں تک پہنچنی چاہیے، کیونکہ اس میں کوتاہیاں شامل ہیں، لیکن میں اسے تمام عبادت گزاروں کی عبادات کے ساتھ ملاتا ہوں اور سب کا ایک ہی عبارت میں ذکر کرتا ہوں اور یوں عرض کرتا ہوں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

چودہواں نکتہ: ایاک نعبد میں فرشتوں، انبیاء، اولیاء سب کی عبادت شامل ہے، اگر وہ ذات عالی

سب کی عبادت قبول کرلے تو اس وقت یہ بات کہنے والے کی عبادت بھی ان دوسروں کی عبادت کے قبول ہونے کی برکت سے قبول ہو جائے گی۔ گویا بندہ یوں کہنا چاہتا ہے،

إِلٰهِي إِنْ لَّمْ تَكُنْ عِبَادَتِي مَقْبُوْلَةً فَلَا تَرُدَّنِي لِأَنِّي لَسْتُ بِوَحِيْدٍ فِي هٰذِهِ الْعِبَادَةِ بَلْ نَحْنُ كَثِيْرُوْنَ فَإِنْ لَّمْ أَسْتَحِقَّ الْإِجَابَةَ وَالْقَبُوْلَ فَأَتَشَفَّعُ إِلَيْكَ بِعِبَادَاتِ سَائِرِ الْمُتَعَبِّدِيْنَ فَأَجِبْنِي اے میرے مولیٰ! اگر میری عبادت مقبول نہیں ہے تو اسے ردنہ کرنا کیونکہ میں اس عبادت میں تنہا نہیں ہوں بلکہ ہم بہت سے لوگ ہیں، اگر یہ عبادت قبولیت کا شرف نہیں پاسکی تو میں تیری بارگاہ میں ان تمام عبادت گزاروں کی سفارش پیش کرتا ہوں اس لیے تو قبول فرمالے۔

پندرہواں نکتہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں کہنے والا غائب کے الفاظ استعمال کرتا ہے، جب کہ ایاک نعبد میں خطاب ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں نمازی اجنبی تھا، اس لیے یقیناً اس نے ایسے الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف وثناء کی ہے جو غیب کے الفاظ ہیں پھر اللہ تعالیٰ گویا کہ یوں فرماتے ہیں کہ بندے تو نے میری تعریف کی ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میں تیرا ہوں، رحمن ہوں، رحیم ہوں، روز جزا کا مالک ہوں، تُو تو میرا اچھا بندہ ہے اس لیے اب ہم حجاب اٹھادیتے ہیں اس دوری کو قرب میں تبدیل کردیتے ہیں، اس لیے تو اب خطاب کے الفاظ استعمال کر اور یوں کہہ ایاک نعبد۔

سولہواں نکتہ: سوال کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی سے اس کے سامنے کوئی چیز مانگی جائے، جیسے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا، جیسے قرآن میں مختلف مقامات پر وہ دعائیں موجود ہیں رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (الأعراف: ۲۳) اے اللہ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا (آل عمران: ۱۴۷) اے اللہ ہمیں معاف کردے۔ رَبِّ هَبْ لِي (آل عمران: ۳۸) اے میرے اللہ مجھے عطا فرما۔ رَبِّ أَرِنِي (الْأَعْرَافِ: ۱۴۳) اے میرے اللہ مجھے دکھادے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت ایک خدمت ہے اور خدمت سامنے ہی زیادہ بہتر ہوتی ہے۔
پھر ایک بات یہ ہے کہ الحمدللہ سے مالک یوم الدین تک اللہ تعالیٰ کی صفت وثناء بیان کی گئی ہے اور تعریف وثناء غائبانہ ہی بہتر ہے۔

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے بعد وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی پر قوت اور قدرت اس کی مدد اور اس کی توفیق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور اس ذات عالی سے توفیق کا مانگنا یہی استعانت ہے اور یہ بات عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت ہے کہ کسی نافرمانی سے انسان اس وقت تک نہیں بچ سکتا جب تک اللہ تعالیٰ نہ بچائے اور کوئی اس وقت تک اطاعت اور عبادت میں نہیں لگ سکتا جب تک اللہ توفیق نہ عطاء فرمائے، عبادت کے بعد استعانت کا ذکر اس لیے کیا تاکہ انسان میں تکبر پیدا نہ ہو کہ وہ شاید اپنی طرف سے کوئی بڑا کام کر رہا ہے

حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے مدد نہ مانگی جائے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو، بیمار ہو تو علاج کرو، اس میں ڈاکٹر اور دوا سے مدد مانگنا ثابت ہوتا ہے، اس اشکال پر مفسرین کرام نے بڑی شرح اور بسط کے ساتھ جواب دیا ہے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ غیر اللہ سے مطلقاً مدد مانگنا حرام نہیں ہے، غیر اللہ سے مدد مانگنا بعض صورتوں میں کفر ہے، بعض صورتوں میں شرک ہے اور بعض صورتوں میں جائز ہے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ "کیونکہ ایک مدد تو مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور معمار بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں اور ہر شخص ان سے مدد لینے یا مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے یہ کسی

دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اس استعانت (مدد طلب کرنا) میں داخل نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دعاء کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگنا روایاتِ حدیث اور ارشادات قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص اور غیر اللہ کے لیے حرام و شرک ہے۔ (معارف القرآن ج ا ص ۱۰۰)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لیے شرک ہے کونسی ہے؟ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادر مطلق اور مختار سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بُت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بُتوں دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور مختار مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، ایاک نستعین میں یہی مراد ہے کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے اور اس دائرے میں وہ خود مختار ہے یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔ (معارف القرآن)

نکات

پہلا نکتہ: کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اس کام پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ لینا ایک اچھا کام ہے، جیسے یہاں انسان کہتا ہے کہ میں نے عبادت شروع کر دی ہے اس کے اتمام کے لیے میں اللہ سے مدد

مانگتاہوں، عرض کرتا ہے کہ مولیٰ! یہ کام میں شروع کررہاہوں تومیری دستگیری فرما، عبادت کی تکمیل سے پہلے موت نہ آجائے، کوئی بیماری لاحق نہ ہوجائے، کوئی اور تغیر اور تبدل نہ ہوجائے، انسان اللہ سے عرض کرتاہے، اے مولیٰ! میں اپنے کولایا ہوں مگر میرادل مجھ سے فرار چاہتاہے، میں تجھ سے مدد کاطلب گارہوں کہ دل کو حضوری مل جائے اور ایساکیوں نہ ہو؟ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ مومن کادل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان میں ہوتاہے۔

دیگرروایات میں قلب مومن (مومن کادل) کی بجائے قلب ابن آدم اور بنی آدم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، مسلم شریف کی روایت میں ہے إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ، كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ (مسلم) بے شک اولاد آدم کے دل رحمن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان ہیں، ایک دل کی طرح، وہ جدھر چاہتاہے ادھر پھیر دیتاہے، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ہمارے اللہ! دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے۔

سنن ابن ماجہ میں اولاد آدم کی بجائے مطلق مخلوق کے دل کاذکر کیاگیاہے، نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایامَا مِنْ قَلْبٍ إِلَّا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ، إِنْ شَاءَ أَقَامَهُ، وَإِنْ شَاءَ أَزَاغَهُ وَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليهِ وسلَّمَ يَقُولُ: يَا مُثَبِّتَ الْقُلُوبِ، ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلَى دِينِكَ قَالَ: وَالْمِيزَانُ بِيَدِ الرَّحْمٰنِ، يَرْفَعُ أَقْوَامًا وَيَخْفِضُ آخَرِينَ، إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ کوئی دل ایسانہیں ہے جو رحمن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان میں نہ ہو، اگروہ چاہے تواسے سیدھاکردے اوراگروہ چاہے تواسے ٹیڑھاکردے، آپ ﷺ فرمایاکرتے تھے، اے دلوں کو جمادینے والے! ہمارے دلوں کواپنے دین پر جمادے، آپ ﷺ نے فرمایا: میزان رحمن

کے ہاتھ میں ہے، کچھ لوگوں کو اوپر اٹھاتا ہے اور دوسروں کو نیچے لاتا ہے یہ قیامت تک ہو گا۔ (سنن ابن ماجہ)

مسند اسحاق بن راہویہ میں قلب ابن آدم کا ذکر ہے، مسند احمد اور مسند البزار میں قلوب بنی آدم کا ذکر ہے، امام نسائی کی سنن کبری میں مطلق قلب کا ذکر ہے، اسی طرح امام نسائی کی سنن میں قلوب جمع اور قلب واحد کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، معجم ابن الاعرابی میں صرف ان القلب بین اصبعین کا ذکر ہے، صحیح ابن حبان میں مطلق قلب کا ذکر ہے۔

علامہ طبرانی کی کتاب الدعا میں مختلف الفاظ آئے ہیں اور یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی موجود ہے وَمَا مِنْ آدَمِيٍّ إِلَّا وَقَلْبُهُ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى

علامہ طبرانی کی معجم الاوسط میں ایک روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال فرمائے يَا عَائِشَةُ إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ، فَمَنْ شَاءَ أَنْ يُقَلِّبَهُ مِنَ الضَّلَالَةِ إِلَى الْهُدَى، وَمِنَ الْهُدَى إِلَى الضَّلَالَةِ فَعَلَ (معجم الاوسط)

اے عائشہ رضی اللہ عنہا! بے شک اولاد آدم کے دل رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے بیچ میں ہیں، جس کے دل کو چاہے گمراہی سے ہدایت کی طرف پلٹ دے اور جس کے دل کو چاہے ہدایت سے گمراہی کی طرف پلٹ دے، وہ ایسا کر دیتا ہے۔

یہ تمام ارشادات گرامی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور دستگیری کے بغیر انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے دل کو حاضر کر سکے، کسی طرف موڑ سکے، کسی طرف لیجا سکے۔ اس لیے اللہ کی مدد طلب کرنا، اللہ سے توفیق مانگنا بہت ہی ضروری ہے۔

دوسرا نکتہ: ایک مسلمان اور صاحب ایمان اللہ ہی سے مدد مانگتا ہے، وہ جبریل، میکائیل، اسرافیل سے مدد نہیں مانگتا، وہ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم کی راہ پر چلتا ہے، کہ جب نمرودیوں نے ان کے

ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں پھینکا تو ان کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور آکر عرض کرنے لگے کہ کیا آپ علیہ السلام کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرے حال سے واقف ہے، وہاں سے بھی معاملہ یہاں کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ وہاں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صرف ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔

مگر یہاں بندہ مومن کہتا ہے کہ وَأَمَّا أَنَا فَقُيِّدَتْ رِجْلَيَّ فَلَا أَسِيرُ، وَيَدَيَّ فَلَا أُحَرِّكُهُمَا، وَعَيْنَيَّ فَلَا أَنْظُرُ بِهِمَا، وَأُذُنَيَّ فَلَا أَسْمَعُ بِهِمَا، وَلِسَانِي فَلَا أَتَكَلَّمُ بِهِ، میرے پاؤں بندھے ہیں میں چل نہیں سکتا، میرے ہاتھ بندھے ہیں میں انہیں حرکت نہیں دے سکتا، میری آنکھیں ہیں مگر میں ان سے دیکھ نہیں سکتا، میرے کان ہیں مگر میں ان سے سن نہیں سکتا، میری زبان ہے مگر میں اس سے بول نہیں سکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام تو صرف نمرودیوں کی روشن کی ہوئی آگ کو دیکھ رہے تھے جب کہ میں تو جہنم کی شعلہ مارتی آگ کو دیکھ رہا ہوں، جب حضرت ابراہیم خلیل تیرے علاوہ کسی کی مدد نہیں چاہتے تھے اسی طرح میں بھی تیری مدد کے سوا کسی کی مدد نہیں چاہتا ہوں، پس میں خاص تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ کہنا چاہتے ہیں، اے میرے بندے! تو نے میرے خلیل ابراہیم جیسا کام کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ تو پھر ہم جزا اور بدلہ بھی زیادہ دیں گے، ہم نے نمرودی آگ کے لیے تو صرف اتنا کہا تھا کہ يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ (الْأَنْبِيَاءِ: ٦٩) اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی بن جا۔

مگر تیرے لیے ہم نے یہ کیا کہ تجھے دوزخ کی آگ سے نجات دی اور تجھے جنت میں پہنچایا، جس طرح ہم نے نمرودی آگ کو سلامتی والی بنایا اور اسے ٹھنڈا کیا اسی طرح تیرے لیے جہنم کی آگ کہے گی جُزْ يَا مُؤْمِنُ قَدْ أَطْفَأَ نُورُكَ لَهَبِي، اے ایمان والے! گزر جا تیرے نور نے میرے شعلے

بجھادیے ہیں۔

تیسرا نکتہ: بندہ مومن گویا کہ ایاک نستعین میں یہ کہتا ہے، اے اللہ میں تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں، میں تیرے سوا کسی سے مدد نہیں مانگتا ہوں، اس لیے کہ تیرے علاوہ کوئی بھی تیری مدد کے بغیر میری مدد نہیں کر سکتا، جب کوئی اور تیری مدد کے بغیر میری مدد نہیں کر سکتا تو پھر ہم اس واسطے کو بھی بیچ سے ہٹادیتے ہیں اور صرف تیری ہی مدد پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

ہدایت کا معنیٰ: ہدایت نرمی کے ساتھ راہنمائی کرنے کو کہا جاتا ہے (مفردات امام راغب)

ہدایت کا ایک معنی ہے اَلْإِرْشَادُ إِلَى الْخَيْرَات قَوْلاً وَّفِعْلاً، خیر کے کاموں کی طرف قول اور فعل سے راہنمائی کرنا۔

اسی طرح ہدایت کا لفظ تَهَكُّم اور کفار کے ساتھ مذاق کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد ہے فَاهْدُوْهُمْ إِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (الصافات ۲۳) انہیں جہنم کی راہ دکھاؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَيَهْدِيْهِ إِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (الحج ۴) وہ دوزخ کے عذاب کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے ۔ ہدایت کا لفظ راہنمائی اور دلالت کے معنی میں آتا ہے اور مذکر اور مؤنث استعمال ہوتا ہے۔

ہدایت کے درجات: راغب اصفہانی لکھتے ہیں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے چار درجات ہیں

پہلا درجہ: اس ہدایت کا ہے جو اپنی جنس کے لحاظ سے عام ہے، اس میں ہر مکلف، فطین شامل ہے، جیسے ارشاد ہے رَبُّنَا الَّذِيْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ۵۰) .ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق بخشی پھر اسے ہدایت دی۔

دوسرا درجہ: اس ہدایت کا ہے کہ لوگ اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسے مقتدیٰ اور پیشوا عطاء

فرما جو ہمارے معاملات میں ہماری راہبری کریں، جیسے قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا (الأنبیاء ۷۳)

تیسرا درجہ: ہدایت کا وہ توفیق الٰہی ہے، جسے وہ ہدایت پانے والے لوگوں کے لیے خاص کر دیتا ہے، جیسے اللہ کا ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ (یونس ۹) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، ان کا رب ان کو ہدایت کرے گا ان کے ایمان سے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹) جنہوں نے ہمارے واسطے محنت کی، ہم انہیں اپنی راہیں سجھا دیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى (مریم ۷۶) جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کو زیادہ کرتا ہے۔

اسی طرح ارشاد ربانی ہے فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (البقرہ ۲۱۳) پس اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ہدایت دی۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (البقرۃ ۲۱۳) اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

چوتھا درجہ: ہدایت کا آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی سے ملے گا، جیسے ارشاد ہے سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (محمد/ ۵) عنقریب ان کو راہ دکھائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا۔ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ (الأعراف ۴۳) اور نکال لیں گے ہم ان کے دلوں میں جو کچھ کھوٹ تھا۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے اللہ کا شکر جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، ہم تو راہ پانے والے نہیں تھے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں راہ نہ دکھاتا۔

علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ ہدایت کے یہ چار درجات مرتب ہیں، ان میں سے اگر پہلا حاصل نہیں ہوگا تو دوسرا حاصل نہیں ہوگا اور جسے ہدایت کا دوسرا درجہ حاصل نہیں ہوگا اسے

ہدایت کا تیسرا اور چوتھا درجہ حاصل نہیں ہو گا، لیکن ہدایت کے چار درجات میں سے جسے چوتھا درجہ حاصل ہو گیا اسے پہلے تینوں درجات حاصل ہو گئے اور جسے ہدایت کا تیسرا درجہ حاصل ہوا اسے پہلے والے دو درجے حاصل ہو گئے، پھر اس کے برعکس، اسے پہلے درجہ حاصل ہو جائے گا مگر دوسرا اور تیسرا حاصل نہیں ہو گا اور انسان کسی ایک درجے کو دعا کے بغیر پا نہیں سکتا۔

ہدایت کے پہلے درجہ کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (الشوریٰ ۵۲) اور بے شک آپ تو لوگوں کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔ يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا (السجدۃ ۲۴) (اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے) جو ہمارے حکم سے راہ چلاتے تھے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد ۷) یہاں ھاد بمعنی داعی کے ہے اور ہر قوم کے لیے ہوا ہے راہ دکھانے والا۔ اور ہدایت کے تمام درجات کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (القصص ۵۶) بے شک آپ راہ پر نہیں لاتے جسے چاہیں۔

اور ہر وہ ہدایت جسے اللہ تعالیٰ نے کافروں اور ظالموں سے روک لیا ہے وہ ہدایت کا تیسرا درجہ ہے، جسے توفیق کہا گیا ہے، جو صرف ہدایت پانے والوں کے ساتھ خاص ہے اور ہدایت کا چوتھا درجہ وہ ثواب ہے جو آخرت میں ملے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا۔ جیسے ارشاد ہے كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (آل عمران ۸۶) کیونکر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہو گئے اور انہوں نے گواہی بھی دی کہ رسول بے شک سچا ہے اور ان کے پاس واضح نشانیاں آئیں اور اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کے مقابلے میں محبوب رکھا، اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتے۔ (سورۃ النحل ۱۰۷)

اور ہر وہ ہدایت جس کی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے نفی کی ہے، انسان سے نفی کی ہے اور اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے یہ وہ ہدایت ہے جو دعا کے ساتھ خاص ہے، راستے کی پہچان کروانا، عقل کا عطاء کرنا، توفیق کامل جانا، جنت میں داخل کر دینا، جیسے ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ ۲۷۲)، ان کو ہدایت دینا یہ آپ پر لازم نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (الأنعام/ ۳۵) اور اگر اللہ چاہتا تو ہدایت پر ان کو جمع کر دیتا۔ وَمَآ أَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ (النمل ۸۱) اور آپ اندھوں کو نہیں دکھلا سکتے جب وہ راستہ بھٹک جائیں۔ إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُّضِلُّ (النحل ۳۷)، اگر آپ ان کے ہدایت پر آنے کی تمنا رکھیں تو اللہ جسے گمراہ کرے اسے ہدایت نہیں دیتا وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (الزمر ۳۶) جسے اللہ گمراہ کرے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّضِلٍّ [الزمر ۳۷] جسے اللہ ہدایت دے اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (القصص ۵۶) جسے آپ پسند کریں اسے ہدایت نہیں دے سکتے اور لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور اسی معنی کی طرف اس فرمان میں اشارہ فرمایا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا مُؤْمِنِيْنَ (یونس ۹۹) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ (الإسراء/ 97)، جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے۔

یعنی جو شخص ہدایت کا طالب ہو گا، اس کی جستجو کرے گا، اسی کو توفیق ملے گی اور وہی راہ جنت کی طرف راہنمائی حاصل کرے گا، اس شخص کو ہدایت نہیں ملے گی جو اس کے مخالف چلے گا، جو گمراہی اور کفر کو تلاش کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ (التوبۃ ۳۷) اور اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (الزمر

۳) بے شک اللہ تعالیٰ جھوٹے کافر کو ہدایت نہیں دیتے۔

یہاں کاذب سے مراد کفار ہیں، وہ جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے اور جو شخص ہدایت کو قبول نہیں کرتا اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا، جیسے عربوں کا مقولہ ہے جو میرا ہدیہ قبول نہیں کرتا میں اسے ہدیہ نہیں دیتا، جو میرا عطیہ قبول نہیں کرتا میں اسے عطاء نہیں کرتا، جو مجھ سے منہ موڑے گا مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (التوبة ۱۰۹) دوسرے مقام پر الْفَاسِقِيْنَ (التوبة ۸۰) اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَفَمَنْ يَّهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ أَمَّنْ لَّا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُّهْدٰى (یونس ۳۵) کیا پس وہ شخص جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ شخص جو خود راہ نہیں پاتا اس کی اتباع کی جائے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ (الإنسان ۳) ہم نے اسے راہ سجھائی۔ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۱۰) اور ہم نے اسے دو گھاٹیاں دکھائیں۔ اس میں اس شخص کی طرف اشارہ ہے جو بھلائی اور برائی کو، ثواب اور عذاب کو عقل اور شرع کے لحاظ سے معلوم کرے جیسے ارشاد ہے فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ (الأعراف ۳۰) ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ (القصص ۵۶) بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے اس شخص کو جسے آپ پسند کریں اور لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ (التغابن ۱۱) اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔

اس آیت میں اس توفیق کی طرف اشارہ ہے جو اس انسان کے دل میں ڈالی جاتی ہے جو کوشش کرتا ہے، اس فرمان الٰہی میں یہی مراد ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ۱۷) وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ان کی ہدایت میں اضافہ ہوا۔

لفظ ہدایت کا استعمال: علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہدایت کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے، اگر کسی شئ کی نشاندہی اور راہنمائی مراد ہو تو لفظ الی کے ساتھ متعدی ہو گا، جیسے ارشاد ہے وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (آل عمران ۱۰۱) اور جو کوئی اللہ کو مضبوط پکڑے پس اس نے سیدھے راستے کی ہدایت پائی وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الأنعام ۸۷) اور ہم نے انہیں چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کی ہے۔ أَفَمَنْ يَّهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ (یونس ۳۵) کیا پس جو شخص سچ کی طرف راہنمائی کرے وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ هَلْ لَّكَ إِلٰى أَنْ تَزَكّٰى وَأَهْدِيَكَ إِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۸- ۱۹) کہہ دیجیے! کیا تیرا دل چاہتا ہے کہ تو سنور جائے؟ اور راہ دکھلاؤں تجھے تیرے رب کی طرف، پھر تجھے ڈر ہو۔

اور کبھی بغیر واسطے کے متعدی ہو گا، جیسے ارشاد ہے وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (النساء ۶۸) اور البتہ ہم نے ان کو سیدھے راستے کی راہنمائی کی ہے۔ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الصافات ۱۱۸) اور ہم نے ان دونوں کو سیدھے راستے کی راہنمائی کی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحة ۶)، ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَهْدُوْا مَنْ أَضَلَّ اللّٰهُ (النساء ۸۸) کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ ہدایت دے دیں اس شخص کو جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے۔ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا (النساء ۱۶۸)، بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا)اور نہ انہیں سیدھی راہ دکھائے گا۔ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ (یونس ۴۳)، کیا پس آپ اندھوں کو راہ دکھا سکتے ہیں؟ اور اگر ہدایت سے منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو لام کے ذریعے متعدی ہو گا۔

ھُدیٰ اور ہدایت: ھُدیٰ اور ہدایت معنی کے لحاظ سے ایک ہیں، ان میں فرق نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے لفظ ھدیٰ اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو اسے محبوب ہو اور جسے اللہ تعالیٰ نے خاص کر لیا ہو،

جیسے ارشاد ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ ۲)، ہدایت متقی لوگوں کے لیے ہے۔

أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرۃ ۵) یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ هُدًى لِّلنَّاسِ (البقرۃ/ ۱۸۵)، یہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (البقرۃ ۳۸) پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو میری ہدایت کی پیروی کرو۔ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (الأنعام ۷۱) فرما دیجیے! اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران ۱۳۸)۔

یہ ہدایت اور نصیحت ہے متقی لوگوں کے لیے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (الأنعام ۳۵) اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ (النحل/ ۳۷) اگر آپ ان کی ہدایت کی تمنا کریں مگر اللہ تعالیٰ گمراہ کو ہدایت نہیں دیتا۔ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى (البقرۃ ۱۶) یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خریدا ہے۔ (المفردات فی غریب القرآن)

ہدایت کے لیے دعا: آیت میں انسان اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے ہدایت عطاء فرما، اس کا مطلب یہ ہے اے اللہ! مجھے ہدایت پر ثابت قدمی عطاء فرما، قرآن میں دوسرے مقام پر ایک اور دعا بھی ہے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (آلِ عِمْرَانَ: ۸) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا۔

امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ علماء میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کے دلوں میں کمزور کمزور شبہات نے جنم لیا جس کے باعث ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے اور وہ ذلت کی کھائیوں میں اتر گئے، پھر دین قویم سے ہی منحرف ہو گئے، منہج مستقیم سے ہی ہٹ گئے۔

اِهْدِنَا ہے اِهْدِنِي کیوں نہیں؟: اس مقام پر اھدنا جمع متکلم کا صیغہ ہے اھدنی واحد متکلم کا صیغہ کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا دو طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے، ایک یہ کہ جب دعا میں عموم ہوتا ہے تو وہ

قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے، جیسے بعض علماء کرام اپنے شاگردوں کو کہا کرتے تھے کہ وہ دعا میں اگر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْکَ (اللہ آپ سے راضی ہوا) کہے تو بہتر ہے اور اگر یہ جملہ نہ بھی استعمال کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن وَعَنْ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِیْنَ کا جملہ اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ پہلے والے جملے میں دعا کے اندر تخصیص ہے اور بعد والے جملے میں دعا میں عموم ہے، دعا میں تخصیص کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ دعا قبول نہ ہو لیکن جب دعا میں عام اہل اسلام کا ذکر کیا تو ان میں کوئی تو ہو گا جس کی دعا قبولیت کی مستحق ہو، جب اللہ نے کچھ کی دعا قبول کر لی تو اس کی برکت سے دوسروں کی بھی رد نہیں ہو گی۔

دعا اور صلاۃ وسلام

اسی سبب سے سنت طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص دعا کرنے کا ارادہ کرے تو اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر درود شریف پڑھے، پھر دعا کرے، پھر دعا کے اختتام پر نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات پر درود و سلام پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے کی اس دعا کو قبول کرتے ہیں جس کے اول اور آخر درود و سلام پڑھا جائے، جب اس دعا کے دونوں کنارے درود و سلام کی وجہ سے قبول کر لیے گئے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ دعا کے درمیان والے حصے کو اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمائیں۔ (تفسیر کبیر)

دوسرا آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا اُدْعُوا اللّٰهَ بِأَلْسِنَةٍ مَّا عَصَيْتُمُوهُ بِهَا، قَالُوا: يَارَسُولَ اللّٰهِ وَمَنْ لَنَا بِتِلْكَ الْأَلْسِنَةِ، قَالَ يَدْعُو بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ، لِأَنَّكَ مَا عَصَيْتَ بِلِسَانِهِ وَهُوَ مَا عَصَى بِلِسَانِكَ. اللہ تعالیٰ سے ایسی زبانوں کے ساتھ دعا کرو جن سے تم نے اس کی نافرمانی نہیں کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم میں سے کس کے پاس ہیں ایسی زبانیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایک دوسرے کے لیے دعا کیا کرو، اس لیے کہ تو نے اس کی

زبان سے نافرمانی نہیں کی اور نہ ہی اس نے تیری زبان کے ساتھ نافرمانی کی ہے۔(تفسیر کبیر)

تیسرا جواب یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اے بندے! تونے سورت کے شروع میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا ہے، اَحْمَدُ اللّٰہ نہیں کہا ہے، ابتدا میں تونے سارے حمد کرنے والوں کی حمد کا ذکر کیا ہے، اسی طرح دعا کے وقت میں ان سب کو شریک کرتے ہوئے اِھْدِنَا کہہ۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ گویا بندہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ اے اللہ! میں نے تیرے رسول ﷺ سے یہ بات سنی ہے کہ جماعت رحمت ہے، تفرقہ عذاب ہے، اسی لیے جب میں نے تیری حمد کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے سب حمد کرنے والوں کی حمد کا ذکر کرتے ہوئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، کہا اور جب میں نے عبادت کا ذکر کیا تو سب کی عبادت کا ذکر کرتے ہوئے اِیَّاکَ نَعْبُدُ، کہا اور جب استعانت کا ذکر کیا تو سب کی استعانت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، کہا، یقینی طور پر ہدایت کو طلب کرتے ہوئے میں نے سب کے لیے ہدایت طلب کی اور کہا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، جب میں نے نیک لوگوں کی اقتدا طلب کی تو سب کا ذکر کیا، میں نے کہا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ، جب میں نے مردودوں سے راہ فرار اختیار کرنا طلب کیا تو سب مردودوں سے راہ فرار طلب کی، میں نے کہا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، جب میں نے حضرات انبیاء اور صالحین کو دنیا میں جدا نہیں کیا تو امیدوار ہوں کہ انہیں قیامت کے دن بھی اپنے سے جدا نہ کروں۔

الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ

حافظ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کوئی راستہ اس وقت تک صراط مستقیم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ پانچ خوبیاں نہ پائی جائیں، وہ پانچ خوبیاں یا پانچ امور یہ ہیں۔

اَلِاسْتِقَامَۃ، وَالْاِیصَال اِلَی الْمَقْصُودِ، وَالْقُرْب، وَسَعَتُہٗ لِلْمَارِّیْنَ عَلَیْہِ، وَتَعَیُّنُہٗ طَرِیْقًا لِّلْمَقْصُوْدِ، ایک تو یہ کہ وہ سیدھا ہو، دوسرا یہ کہ مقصود تک پہنچانے والا ہو، تیسرا یہ کہ قریب ہو، چوتھا یہ کہ گزرنے والوں کے لیے کشادہ ہو، پانچواں یہ کہ مقصود تک پہنچنے کے لیے اس

کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ہو، جس راستے میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں وہ صراط مستقیم ہے، اگر یہ پانچ باتیں نہیں پائی گئیں تو صراط مستقیم کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ (مدارج السالکین ج ا ص ۳۳)

صراط مستقیم سے مراد کیا ہے؟ اس پر علماء کرام نے مختلف آراء پیش کی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ صراط مستقیم سے ان پہلے لوگوں کا راستہ مراد ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بڑی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، جیسے نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو روزانہ پیٹا جاتا تھا یہاں تک کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اور آپ علیہ السلام روزانہ یہ کہتے تھے اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُونَ. اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطاء فرمایہ انجان ہیں۔

ہر اخلاق کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک افراط اور دوسرا تفریط اور دونوں ہی مذموم ہیں، درست بات درمیانی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت وسط یعنی درمیانی اور معتدل امت قرار دیا ہے۔

یہ اعتدال درست ہے، جب ایک ایمان والا دلیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے تو وہ ہدایت یافتہ مومن ہو جاتا ہے، اس حالت کے حصول کے بعد عدل کی پہچان ضروری ہے یہی معرفت اعمال شہوانیہ اور اعمال غضبیہ کے درمیان اور انفاق مال کی کیفیت کے درمیان خط متوسط ہے۔ اسی لیے ایک مومن اللہ تعالیٰ سے اس چیز کا طلب گار ہوتا ہے کہ وہ اسے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرے، جو کہ تمام اخلاقیات اور تمام اعمال میں معتدل ہے۔

صراط مستقیم یہ ہے کہ ایک انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے دل اور اپنی فکر کے ساتھ کلیۃً پیش ہو جائے، جب انسان اللہ تعالیٰ سے صراط مستقیم کا سوال کرے تو ان صفات کے ساتھ کرے، اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ایسا ہو جائے کہ اگر اسے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جائے تو وہ ایسا کر گزرے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا اور اگر اسے حکم دیا جائے کہ اسے کوئی اور ذبح کرے گا تو وہ تابعدار ہو جائے جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کیا تھا، اگر اسے حکم دیا جائے کہ وہ

اپنے کو دریا میں ڈال دے تو وہ تیار ہو جائے جیسے حضرت یونس علیہ السلام نے کیا تھا، اگر اسے حکم دیا جائے کہ وہ ایسے شخص کی شاگردی حاصل کرے جو اس سے زیادہ جانتا ہے اس کے باوجود کہ وہ ایک منصب پر براجمان ہے تو وہ اس کی اطاعت کرے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کی پیروی کی تھی، اگر اسے حکم دیا جائے کہ وہ نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے والے کام پر ڈٹ جائے اگرچہ اسے قتل کر دیا جائے یا چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جائے تو وہ اس کے لیے تیار ہو جائے جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام نے کیا۔ تو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مراد مصائب و شدائد پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی پیروی کرنا ہے اور آزمائشوں پر ثابت قدمی اختیار کرنا ہے۔

یہاں ان واقعات کو پڑھ سن کر انسانی ذہن اور دماغ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ تو مشکل کام ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی سہولت اور آسانی کی خاطر یہاں ایسے جملے ذکر نہیں فرمائے، بلکہ فرمایا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، اس لیے اس آیت کی تلاوت کے وقت ایک آدمی کی نیت یہ ہو کہ وہ یوں کہے اے میرے اللہ! میں نے اپنے والد کو بڑے بڑے گناہ کرتے دیکھا ہے، جیسے میں نے بڑے بڑے گناہ کیے ہیں، میرے والد نے نافرمانی کا ارتکاب کیا ہے جیسے میں نے کیا ہے، پھر میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے توبہ کی اور رجوع کیا، تو نے دوزخ کی آگ سے ان کی نجات اور فلاح کا فیصلہ فرمایا، انہیں جنت دینے کا فیصلہ فرمایا، یہ تیرا انعام تھا کہ تو نے ان کو توبہ کی توفیق دی، پھر تیرا انعام کہ تو نے ان کی توبہ قبول کی، میں تیری بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح مجھے سیدھے راستے پر چلا تائبین کے مقام و مرتبہ کو تلاش کرنے کے لیے، جب یہ مرتبہ مل جائے تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے درجات کی پیروی کی تلاش کرے۔

ایک انسان کے سامنے کئی راستے ہیں، اس کے دوست احباب اسے ایک راستے کی طرف کھینچتے

ہیں، اس کے دشمن اسے دوسرے راستے کی طرف کھینچتے ہیں اور شیطان ایک تیسرے راستے کی طرف کھینچتا ہے اسی طرح اس کے سامنے کہیں شہوت کی، کہیں غضب کی، کہیں کینے اور حسد کی راہیں ہیں، اسی طرح کہیں شرکیات، کہیں بدعات، کہیں الحاد، کہیں زندیقیت، کہیں رافضیت اور کہیں خارجیت کی راہیں ہیں، جب کہ انسانی عقل کمزور ہے، عمر تھوڑی ہے، آرزوئیں لمبی ہیں، تجربے خطرناک ہیں، فیصلے مشکل ہیں، ایسے میں وہ حیران اور پریشان ہو جاتا ہے، اسی پریشانی کے عالم میں وہ کہتا ہے کہ میری ایسی راہنمائی کی جائے کہ میں اس کی روشنی میں جنت کی طرف نکل جاؤں

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی حکایت: حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ ایک بار بیت اللہ کی طرف روانہ تھے، اچانک ایک دیہاتی اپنی اونٹنی پر انہیں ملا، اس دیہاتی نے ان سے پوچھا: اے شیخ! آپ نے کہاں جانا ہے؟ انہوں نے کہا: میں بیت اللہ کی طرف جارہا ہوں، دیہاتی نے انہیں پوچھا: کہ آپ پاگل تو نہیں ہیں، اتنا لمبا سفر اور آپ کے پاس سواری بھی نہیں ہے، نہ ہی آپ کے پاس سفر کا خرچ ہے اور سفر بہت ہی طویل ہے، حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے فرمایا: میرے پاس بہت سی سواریاں ہیں مگر تجھے دکھائی نہیں دے رہی ہیں، دیہاتی نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے فرمایا: إِذَا نَزَلَتْ عَلَيَّ بَلِيَّةٌ رَكِبْتُ مَرْكَبَ الصَّبْرِ، وَإِذَا نَزَلَ عَلَيَّ نِعْمَةٌ رَكِبْتُ مَرْكَبَ الشُّكْرِ وَإِذَا نَزَلَ بِيَ الْقَضَاءُ رَكِبْتُ مَرْكَبَ الرِّضَا، وَإِذَا دَعَتْنِي النَّفْسُ إِلَى شَيْءٍ عَلِمْتُ أَنَّ مَا بَقِيَ مِنَ الْعُمُرِ أَقَلُّ مِمَّا مَضَى فَقَالَ الْأَعْرَابِيُّ: سِرْ بِإِذْنِ اللهِ فَأَنْتَ الرَّاكِبُ وَأَنَا الرَّاجِلُ

جب مجھ پر آزمائشیں اترتی ہیں تو میں صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں، جب مجھے کوئی نعمت ملتی ہے تو میں شکر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں، جب مجھ پر قضاو قدر نازل ہوتی ہے تو میں رضا کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں، جب میرا نفس مجھے کسی چیز کی طرف بلاتا ہے تو مجھے پتہ لگ جاتا ہے کہ میری عمر کا جو حصہ گزر چکا ہے وہ زیادہ ہے اور جو باقی ہے وہ تھوڑا ہے، اس پر دیہاتی نے کہا: اللہ کے حکم سے چلیے، اب آپ سوار ہیں اور میں پیدل۔

سبیل اللہ کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

خَطَّ لَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا، وَقَالَ: هَذَا سَبِيلُ اللهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ، وَقَالَ: هٰذِهِ سُبُلٌ، عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ، ثُمَّ قَرَأَ قَوْلَهُ تَعَالَى {وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (الأنعام: ۱۵۳)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک خط کھینچا اور فرمایا: یہ سبیل اللہ (اللہ کا راستہ) ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں اور بائیں کئی خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ سُبُل (راستے) ہیں، ہر راستے پر ایک شیطان ہے، جو اس کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا کہ بے شک یہ میرا راستہ ہے سیدھا، پس تم اس کی پیروی کرو اور بہت سی راہوں کی پیروی نہ کرو وہ تمہیں اس کے راستے سے ہٹا دیں گے۔

اس آیت اور حدیث کے ذیل میں علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ جو راستہ اللہ تک پہنچاتا ہے وہ ایک ہی ہے اور وہ وہ راستہ ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے اس کے ساتھ اپنی کتابیں نازل کیں، تو اس کی طرف کوئی نہیں پہنچتا سوائے اس راستے کے اگر لوگ ہر راستے سے آئیں اور ہر دروازہ کھلوائیں تو سب راستے انہیں بند ہی ملیں گے، دروازوں پر تالے ہوں گے، مگر ایک یہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ (الحجر: ۴۱) یہ راستہ سیدھا میری طرف آتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہاں علی بمعنیٰ الیٰ ہے۔ (مدارج السالکین)

نکتہ: علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے الصراط کو مفرد ذکر کیا ہے اور معرف بالام، جو اس کے تعین اور اختصاص کا فائدہ دیتا ہے اور وہ ہے

ایک ہی راستہ، اس کے علاوہ اہل غضب اور ضلال کے راستوں کو کبھی مفرد اور کبھی جمع ذکر کیاجاتاہے، اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کا اختصاص یوں بیان کیاہے وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ اور بے شک میرا راستہ سیدھاہے، پس تم اس کی پیروی کرو اور راستوں کی پیروی نہ کرو، یہ تمہیں اس کے راستے سے ہٹادیں گے۔(الأنعام: ۱۵۳) یہاں لفظ صراط اور سبیل کو واحد ذکر کیاہے، جب کہ اس کے مخالف سُبل (بہت سے راستے) کو جمع ذکر کیاہے۔ (مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین ج ا ص ۳۷)

دوسرا نکتہ: بعض مفسرین کا کہناہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے، مگر یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ بندہ یہ عرض کرتاہے کہ مجھے سیدھاراستہ دکھا، ان لوگوں کاراستہ جن پر تیرا انعام ہواہے، یہ عبارت صراط مستقیم کا بدل ہے، تقدیر عبارت کی پھر یوں ہوگی کہ ہمیں ان لوگوں کاراستہ دکھا جن پر تونے انعام کیاہے، پہلے لوگوں میں سے، توجو لوگ ہم سے پہلے تھے ان کے پاس قرآن اور اسلام تو نہیں تھا، جب یہ دعویٰ باطل ہوگیاتو یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں ان لوگوں کاراستہ دکھا جو جنت کے مستحق ہیں

تیسرا نکتہ: یہاں لفظ صراط فرمایاہے، سبیل اور طریق کا لفظ استعمال نہیں کیاہے، اگرچہ ان سب کا معنی ایک ہی ہے، اس لفظ کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ پل صراط کو یاد دلاتا رہے، تاکہ انسان میں مزید خوف اور خشیت پیدا ہو۔

چوتھا نکتہ: ریاضی دان کہتے ہیں کہ خط مستقیم وہ سب سے چھوٹا خط ہوتاہے جو دو نقطوں کو ملاتاہے، معلوم ہوا کہ خط مستقیم تمام ٹیڑھے خطوط سے چھوٹا ہوتاہے، گویا بندہ یہ عرض کرتاہے کہ ہمیں صراط مستقیم دکھا کیونکہ یہ سب خطوط سے قریب تر ہوتاہے اور چھوٹا ہوتاہے، میں عاجز ہوں، میرے ضعف اور کمزوری کے لائق یہی صراط مستقیم ہی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مستقیم ایک ہوتا ہے اس کے علاوہ جو ہیں وہ ٹیڑھے ہیں اور ٹیڑھے پن میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اس طرح مجھ پر راستہ مشتبہ ہو جائے گا، مگر ان میں صراط مستقیم ایسا راستہ ہے جو کسی کے مشابہ نہیں ہے، صراط مستقیم خوف، آفات سے بہت دور ہے اور حفظ وامان کے بہت زیادہ قریب ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ راہ مستقیم مقصود تک پہنچاتی ہے جب کہ ٹیڑھی راہیں مقصود تک نہیں پہنچاتی ہیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ مستقیم میں تغیر اور تبدل نہیں ہوتا جب کہ ٹیڑھا تبدیل ہوتا رہتا ہے، اس لیے بندہ ان اسباب کی وجہ سے صراط مستقیم کا سوال کرتا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

یہ آیت صراط مستقیم کی تفسیر ہے، جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، انسان نے ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے کہ اے اللہ! مجھے سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا ہے، یہ انعام پانے والے لوگ کون ہیں؟ ان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں فرمایا ہے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا * ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا

جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے، یہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں، صدیقین ہیں، شہدا ہیں، نیکوکار ہیں اور ان لوگوں کی رفاقت بہت اچھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا کافی ہے۔ (سورۃ النساء ۷۰،۶۹)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں انعام پانے والے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اطاعت کی نعمت سے نوازا ہے، یہ انعام پانے والے فرشتوں میں سے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام میں سے

ہیں، صدیقین میں سے ہیں، شہیدوں میں سے ہیں اور نکوکاروں میں سے ہیں (تفسیر ابن کثیر)

ابو جعفر رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ انعام یافتہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں، ابن جریج رحمۃ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے کہتے ہیں کہ انعام پانے والوں سے مراد اہل ایمان ہیں، حضرت مجاہد رحمۃ اللہ اور حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انعام پانے والوں سے مراد مسلمان ہیں، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انعام پانے والوں سے مراد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

تفسیر بغوی اور تفسیر سمعانی میں ہے کہ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ انعام یافتہ لوگوں سے مراد هُمُ الرَّسُولُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے دو ساتھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عبدالرحمن بن زید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت ہیں اور شہر بن حوشب نے فرمایا کہ اس سے مراد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اطہار ہیں۔ (تفسیر بغوی ج ا ص ۷۶)

انعام یافتہ طبقات

اس آیت میں انعام پانے والے چار طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں ایک نبی ہیں، دوسرے صدیق ہیں، تیسرے شہید ہیں اور چوتھے صالحین ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور پیغام کو نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے عام کیا ہے۔

صدیقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں، یعنی سچائی کے سانچے میں اس طرح ڈھلے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے، حضرت علامہ رازی کہتے ہیں کہ صدیقین کے امام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، لہذا اس کے پہلے مصداق بھی وہی ہیں۔

شہید کے معنی ہیں گواہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق و صداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں (ام الکتاب)

پھر شہید سے وہ لوگ بھی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے میدان جہاد میں کود گئے اور اس کی رضا کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں سرخرو ٹھہرے، صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیک عملی کی راہ میں ڈٹے رہیں، برائی کی راہوں سے اپنا دامن بچاتے رہیں۔

حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ لکھتے ہیں "پس معلوم ہوا انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے تمام رسول اور داعیان حق ہیں جو قرآن کے نزول سے پہلے دنیا میں پیدا ہو چکے تھے اور تمام راست باز انسان ہیں جو نوع انسانی میں گزر چکے تھے، اس میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے، نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیروؤں کی، دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداء حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں، قرآن کے نزدیک "انعام یافتہ" انسان ہیں اور انہیں کی راہ "صراط مستقیم" ہے (ام الکتاب ص)

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان امتیازی

مفسر قرآن، علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

وَلَا شَكَّ أَنَّ رَأْسَ الصِّدِّيقِينَ وَرَئِيسَهُمْ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَكَانَ مَعْنَى الْآيَةِ أَنَّ اللهَ أَمَرَنَا أَنْ نَطْلُبَ الْهِدَايَةَ الَّتِي كَانَ عَلَيْهَا أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ وَسَائِرُ الصِّدِّيقِينَ، وَلَوْ كَانَ أَبُو بَكْرٍ ظَالِمًا لَمَا جَازَ الِاقْتِدَاءُ بِهِ، فَثَبَتَ بِمَا ذَكَرْنَاهُ دَلَالَةُ هٰذِهِ الْآيَةِ عَلَى إِمَامَةِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عنه (تفسیر کبیر ج ۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ صدیقین کے سردار اور سرخیل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم وہ ہدایت طلب کریں جس پر حضرت ابو بکر

صدیق رضی اللہ عنہ اور باقی تمام صدیقین تھے ، اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ ظالم تھے (بقول شیعہ)تو ان کی اقتدا درست نہیں ہے، معلوم ہوا کہ یہ آیت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے نیز علامہ رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ يَدُلُّ عَلَى إِمَامَةِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم حضرت ابو بکر کی امامت پر دلالت کرتی ہے۔(تفسیر کبیر ج ۱)

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ

جن لوگوں پر اللہ کا غضب ہوا اور وہ راہ حق سے بھٹک گئے، مغضوب اور ضالین لوگوں سے کون لوگ مراد ہیں، اس بارے میں حضرات مفسرین کرام کی آراء اور توضیحات مختلف ہیں، جمہور مفسرین کرام یہ فرماتے ہیں کہ اس اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں، اس کے مصداق پر کئی دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں، جیسے ارشاد ہے

وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ (البقرۃ: ۶۱ وآل عمران: ۱۱۲) . وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ واپس ہوئے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (الفتح: ٦) ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا۔ نصاریٰ کے بارے میں ارشاد ہے قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيْراً وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدۃ: ۷۷) تحقیق وہ اس سے پہلے گمراہ ہوئے، بہتوں کو انہوں نے سیدھے راستے سے گمراہ کیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مغضوب علیہم سے مراد مشرکین ہیں اور ضالین سے مراد منافقین ہیں، بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے سورۃ فاتحہ کو نماز میں پڑھنے سے ساقط کر دیا ہے اور ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس سورۃ کی برکات کا انکار کیا ہے، یہ بات سُلمی نے اپنی حقائق میں ذکر کی ہے، اور علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بیان کی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ بات مردود ہے، کیونکہ اس میں تو روایات بھی باہم متعارض ہیں، اس میں اختلاف مشہور عالم ہے، اس لیے کسی پر یہ حکم لگانا جائز نہیں ہے (تفسیر قرطبی ج ۱)

بعض یہ کہتے ہیں کہ مغضوب علیھم سے مراد بدعات کی پیروی کرنے والے ہیں اور ضالین سے مراد سنن ھُدیٰ سے ہٹے ہوئے لوگ ہیں، ہدایت کے راستے سے ہٹے ہوئے، علامہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تفسیر اچھی ہے مگر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ وضاحت بہت ہی بہتر ہے، اعلیٰ ہے اور احسن ہے۔

عَلَيْهِمْ رفع کے مقام پر ہے، اس لیے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر غضب کیا ہے اور غضب لغت میں سختی اور شدت کو کہا جاتا ہے، عرب میں رَجُلٌ غَضُوبٌ اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو درشت اخلاق والا ہو اور عربی میں الْغَضُوبُ خبیث قسم کے سانپ کو کہا جاتا ہے، اس کی شدت کی وجہ سے اور الْغَضْبَةُ اونٹ کے چمڑے سے بنی ہوئی اس ڈھال کو کہا جاتا ہے جو تہہ در تہہ ہوتی ہے، اس کی سختی اور شدت کے باعث اسے غضبہ کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت میں غَضَب کا معنی ہوتا ہے سزا کا ارادہ کرنا، جیسے ایک حدیث شریف میں ہے

إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ، بے شک صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصے کو بجھا دیتا ہے، یہاں صفت فعل ہے۔

اور کلام عرب میں ضال کا معنی ہوتا ہے راہ حق اور راہ اعتدال سے ہٹ جانا، عربی محاورہ میں یہ جو کہا جاتا ہے ضَلَّ اللَّبَنُ فِي الْمَاءِ، دودھ پانی میں چھپ گیا، یعنی غائب ہو گیا، اسی سے قرآن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ (السجدۃ: ۱۰) یعنی ہم موت کے باعث چھپ گئے اور مٹی ہو گئے۔ (تفسیر قرطبی ج ۱)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں فَإِنَّ طَرِيقَةَ أَهْلِ الْإِيمَانِ مُشْتَمِلَةٌ عَلَى الْعِلْمِ بِالْحَقِّ

وَالْعَمَلِ بِهِ، وَالْيَهُوْدُ فَقَدُوْا الْعَمَلَ، وَالنَّصَارٰى فَقَدُوْا الْعِلْمَ؛ وَلِهٰذَا كَانَ الْغَضَبُ لِلْيَهُوْدِ، وَالضَّلَالُ لِلنَّصَارٰى، لِأَنَّ مَنْ عَلِمَ وَتَرَكَ اسْتَحَقَّ الْغَضَبَ، بِخِلَافِ مَنْ لَّمْ يَعْلَمْ. وَالنَّصَارٰى لَمَّا كَانُوْا قَاصِدِيْنَ شَيْئًا لٰكِنَّ هُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ إِلٰى طَرِيْقِهِ، لِأَنَّهُمْ لَمْ يَأْتُوْا الْأَمْرَ مِنْ بَابِهِ، وَهُوَ اتِّبَاعُ الرَّسُوْلِ الْحَقِّ، ضَلُّوْا، وَكُلٌّ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى ضَالٌّ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِ، لٰكِنَّ أَخَصَّ أَوْصَافِ الْيَهُوْدِ الْغَضَبُ (كَمَا قَالَ فِيْهِمْ: {مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ (الْمَائِدَةِ: ٦٠) وَأَخَصُّ أَوْصَافِ النَّصَارٰى الضَّلَالُ كَمَا قَالَ: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ (الْمَائِدَةِ: ٧٧، تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۴۱)

اہل ایمان کا طریقہ حق کو جاننا اور اس پر عمل کرنا ہے، یہودیوں کے پاس عمل نہیں ہے، نصاریٰ کے پاس علم نہیں ہے، اس لیے یہود کے لیے غضب ہے اور عیسائیوں کے لیے ضلال ہے، اس لیے کہ جس نے علم کے باوجود عمل ترک کر دیا وہ مستحق غضب ہو گیا، اس کے بر خلاف جو جانتا ہی نہیں ہے، نصاریٰ اگرچہ کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں مگر وہ راستہ نہیں پاتے، اس لیے کہ وہ کسی کام میں اس کے دروازے کی طرف سے نہیں آتے اور وہ دروازہ رسول برحق کی اتباع ہے، یہود اور نصاری سب گمراہ ہیں، مگر سب سے خاص وصف یہودیوں کا وہ غضب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور ان پر اس کا غضب ہوا ہے اور نصاریٰ کے خواص میں ضلال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: يَا عَدِيُّ، مَا أَفَرَّكَ أَنْ يُّقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ فَهَلْ مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ قَالَ: مَا أَفَرَّكَ أَنْ يُّقَالَ: اللّٰهُ أَكْبَرُ، فَهَلْ شَيْءٌ أَكْبَرُ مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ؟ قَالَ: فَأَسْلَمْتُ، فَرَأَيْتُ وَجْهَهُ اسْتَبْشَرَ، وَقَالَ: الْمَغْضُوْبُ عَلَيْهِمُ الْيَهُوْدُ، وَإِنَّ الضَّالِّيْنَ النَّصَارٰى (مسند احمد)

اے عدی! تجھے لا الہ الا اللہ کہنے سے کیوں بھاگتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ تو اللہ اکبر کہنے سے کیوں بھاگتا ہے؟ کیا اللہ سے بڑا کوئی اور ہے؟ اس پر میں نے اسلام قبول کر لیا، پھر میں نے آپ ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھا خوشی سے تمتما رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: المغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ قَوْلِ اللّٰہِ {غَیْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَیْہِمْ} قَالَ: "ھُمُ الْیَھُودُ" {وَلَا الضَّالِّینَ} قَالَ: "النَّصَارَی ھُمُ الضَّالُّونَ" (الحمیدی فی مسندہ (۲/۴۰۶) میں نے آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان غیر المغضوب علیھم کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔

تمت بالخیر

الحمد للہ سورۃ الفاتحہ میں بیان کیے گئے مضامین کی تفسیر مکمل ہو گئی ہے، امام رازی رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ سورۃ الفاتحہ ایسی سورت ہے جس سے ہزاروں مسائل نکل سکتے ہیں، ہم نے اپنی بساط اور ہمت کے مطابق قرآن کریم کی بے شمار تفاسیر کا عرق اپنے قارئین کی خدمت میں اس نیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے، ہمیں انعام یافتہ طبقے میں شامل فرمائے، ہمیں ضال اور مغضوب علیھم کی راہ سے بچائے، ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے، اس کتاب کو ہمارے لیے، ہمارے والدین کے لیے، ہمارے دوستوں اور تعلق والے لوگوں کے لیے نجات کا سامان بنائے، ہمارے لیے اس ذخیرہ کو صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین یارب العالمین بحرمۃ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی (اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں معاف فرمادے)

حال مقیم مدینہ ہاؤس، مدینہ ٹاور، مسلم ٹاؤن لاہور

۲۷ ستمبر ۲۰۱۳ء مطابق ۲۰ ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ بروز جمعۃ المبارک

نظر ثانی

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج ۳۱جنوری ۲۰۱۴ مطابق ۲۹ ربیع الاوّل ۱۴۳۵ کو اس کتاب پر نظر ثانی کی تکمیل ہوئی ہے، آج سے چار ماہ پہلے اس کا مسودہ مکمل کیا گیا تھا، چند ایام دوسرے دینی مشاغل میں مصروفیت کے باعث ادھر توجہ نہیں ہو سکی، اب اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے اس کو دوبارہ دیکھا ہے، اس میں موجود اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے، کمی بیشی دور کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ وہ اس فقیرانہ سے ہدیہ کو اپنی جناب میں قبول فرمائے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی ﷺ۔

محمود الرشید حدوٹی، کاشانۂ فقیر، حدوٹ، مری

نظر ثالث

الحمدللہ ثم الحمدللہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر جس کا نام میں نے اَلدُّرَرُ النَّافِعَۃُ فی السُّورَۃِ الفَاتِحَۃِ رکھا ہے کو آج تیسری بار دیکھ کر، پڑھ کر مکمل کیا ہے، نظر اول اور نظر ثانی کے باوجود اس میں غلطیاں رہ گئی تھیں، اب تیسری بار جب میں نے اسے دن رات ایک کر کے پڑھا ہے تو پھر بھی دعویٰ نہیں ہے کہ اس میں اب کسی قسم کی غلطی نہیں ہو گی، مگر انسانی بساط اور ہمت کے مطابق میں نے اس میں باریک باریک غلطیوں کی بھی اصلاح کر دی ہے۔

یہ کتاب آج سے تین سال پہلے مکمل کر لی گئی تھی، اسے میں نے اس وقت مکمل کیا تھا جب میں نے اپنے مادر علمی جامعہ اشرفیہ لاہور سے چند قدم کے فاصلے پر مدینہ ہاؤس میں اقامت اختیار کی ہوئی تھی، پھر اس کے بعد میں نے اس کو اپنے آبائی علاقے ملکۂ کوہسار مری میں خوشگوار موسم میں دیکھا تھا، کتاب کے ساتھ میری وابستگی کی تاریخیں ساتھ ساتھ لکھی ہوئی موجود ہیں۔

کتاب کب سے چھپ جانی چاہیے تھے، مگر میری چاہت کے باوجود نہیں چھپ سکی، بھلا ایک مصنف کب اتنا طویل انتظار کر سکتا ہے کہ اس کی دن رات کی محنت یونہی پڑی رہے، اسے ہوا تک نہ

لگے، میری چاہت کے ساتھ جب اللہ کی چاہت شامل نہیں ہو گی تو کوئی کام نہیں کر سکوں گا، اس لیے یہ بات تو عقیدے کی سمجھ میں آجانا چاہیے کہ انسان کے چاہنے کے ساتھ جب اللہ کی چاہت شامل ہو جاتی ہے تو پھر اس کام کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اگر ساری دنیا کسی کام کو چاہ لے مگر میرا اللہ نہ چاہے تو سارے اسباب، سارے ذرائع، سارے وسائل ہونے کے باوجود وہ کام نہیں ہو سکتا۔

اس دو، تین سال کے عرصہ میں میں نے جامعہ اشرفیہ لاہور اور مدینہ ہاؤس کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے، میں اپنی مادر علمی جامعہ اشرفیہ لاہور میں پندرہ سال تک خدمات انجام دیتا رہا، جامعہ کے اکابرین، اساتذہ کرام کی جوتیاں سیدھی کرتا رہا، ان کے دیدار سے شرف یاب ہوتا رہا، اب اللہ نے انہی کی برکت سے لاہور کے مضافات میں جامعہ رشیدیہ لاہور قائم کروادیا ہے، جس کا تعمیراتی کام جاری ہے، ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ میری تحریری خدمات کا سلسلہ بھی جاری ہے، اسی دوران میں نے مناسب سمجھا کہ الدرر النافعہ فی السورۃ الفاتحہ کو ایک بار پھر دیکھ لوں، چنانچہ میں نے اس دوران اور کوئی کام سرانجام نہیں دیا، بلکہ اسی کو دن رات ایک کرکے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اب اللہ کے بھروسے پر، اللہ سے قبولیت کی امید کے ساتھ پریس کے حوالے کررہا ہوں، اس کی اشاعت اور طباعت میں میرے جن مخلص دوستوں اور بزرگوں نے مالی تعاون کیا ہے ان کے لیے دعا فرماتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں سلامتی ایمان کے ساتھ تندرستی جان عطا فرمائے رکھے، ان کے اس ہدیہ صالحہ کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمالے، اس کتاب کو میرے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے دوست احباب کے لیے، میرے ساتھ مالی تعاون کرنے والوں کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور اسے ان کی دارین کی سعادتوں کا ذریعہ بنائے۔

خادم اسلام، محمود الرشید حدوٹی

(اللہ تعالیٰ اس کی چھوٹی موٹی غلطیاں معاف فرمادے)

جامعہ رشیدیہ، غوث گارڈن ۲، مناواں، جی ٹی روڈ، لاہور کینٹ

۵ جون ۲۰۱۶ء، مطابق ۲۸ شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ